ماہنامہ
ترجمان اہلسنت
کراچی

مولانا محمد شفیع الخطیب اوکاڑوی کی تصانیف

الذکر الجمیل فی حلیۃ الحبیب الخلیل

حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اوکاڑوی کی حسین و جمیل تالیف کا تیسرا ایڈیشن مع بہت مفید اضافہ و ترمیم کے شائع ہوا ہے جس میں حضور سید المرسلین شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین نورِ مجسم احمدِ مجتبےٰ محمدِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثنا کا حلیہ شریف از سرِ اقدس تا پائے مقدس ہر عضو کے خصائص و فضائل کمالات و برکات اور حسنات کو قرآن و حدیث اور معتبر و مستند روایات اور عقل کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے، آجکل کے بعض مذہبی اختلافی مسائل کا حل بغیر کسی فرقے پر طعن و تشنیع کے نہایت حکیمانہ اور محبت بھرے انداز میں پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں، واعظوں اور عاشقانِ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے سرمایہ اور سکونِ قلب ہے۔ اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے ——— ہدیہ

راہِ حق

اس میں الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ پڑھنے نعرۂ رسالت لگانے اور مسرت و مصیبت کے وقت حضور اکرم اور اولیاء اللہ کو پکارنے کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا گیا ہے

ہدیہ

برکات میلاد شریف

اس رسالہ میں میلاد شریف پڑھنے اور سلام پڑھنے کا روشن ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ ہدیہ

ثواب العبادات

اسمیں قرآنِ پاک صحیح احادیث کتبِ فقہ اور خود مخالفین کے اکابر علماء کی کتب سے ایصالِ ثواب کا ثبوت بغیر کسی پر طعن و تشنیع کے پیش کیا گیا ہے ایصالِ ثواب کے جواز پر بہترین رسالہ

ہدیہ

مدینہ پبلشنگ کمپنی ایم اے جناح روڈ کراچی

جنگ آزادی نمبر ۱۸۵۷ء

جمادی الاخریٰ ۔ رجب المرجب ۱۳۹۵ھ

جولائی ۱۹۷۵ء

زرسالانہ ۔ بیس روپے ۔ ششماہی گیارہ روپے
قیمت فی شمارہ ——— پانچ روپے پچاس پیسے
سالانہ بذریعہ رجسٹری ڈاک ——— ۲۷ روپے
سالانہ بھارت کیلئے بذریعہ رجسٹری ڈاک ——— ۴۵ روپے
بیرون ملک بذریعہ ہوائی جہاز سالانہ ——— ۳½ پونڈ
فی شمارہ ——— ۲۵ نئے پنس

دفتر: ۲۷۔ محمدی مینشن، مارسٹن روڈ کراچی

اداریہ

نوامیس ربی

شخصیات جنگ آزادی

انٹرویو

آخری مغلیہ خاندان

فوجی مجاہد

اسباب و نتائج

مختصر مختصر

کاسہ لیس

ان کی زبانی

محب وطن

ادبی زبان میں

خزانے جو ضائع ہو گئے

منظومات

تعارف کتب

نوازش نامہ نظر نواز ہوا۔ یہاں نہ احقر کی ذاتی کتابیں ہیں اور نہ کوئی کتب خانہ
اس لئے مضمون لکھنے سے معذور ہوں اور کرم فرمائی کیلئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔
مٹھی عجیب و غریب شہر ہے یہاں تقریباً ۹ ہزار ہندو ہیں اور سات آٹھ سو
مسلمان، سب کے سب غریب نادار، ہندو خوشحال و مالدار۔ یہاں نہ بجلی ہے نہ
سڑکیں۔ رات کو ماہتاب جگمگاتا ہے اور دن کو آفتاب۔ تھر کی زمین بہت
وسیع و عریض ہے، سڑک کی کیا ضرورت؟ سر سر تکلیف ہیں۔ یہاں آنے کے بعد
جانا مشکل اور جانے کے بعد آنا مشکل۔ اگر مولیٰ فضل فرمائے اور یہاں تشریف لائے
تو ضرور [illegible] رکھئے۔

حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ وطن میں سفر اختیار کرو
اور یہ ممکن نہ ہو تو ہجرت کرو۔ یعنی سفر در وطن یعنی مخلوق میں رہتے ہوئے علیحدہ
رہنا بہت مشکل ہے اس لئے تزکیہ قلب اور اصلاح نفس کے لئے ہجرت ضروری ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد
ایم اے گولڈ میڈلسٹ۔

پیغام

پیغام

محمد منشا تابش قصوری

خطیب [illegible] مریدکے (شیخوپورہ)

یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ مئی ۱۹۷۵ء میں آپ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر ماہنامہ ترجمان اہلسنت کا نمبر نکال رہے ہیں۔
اس نمبر کی اس وقت شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو بفضلہ تعالیٰ آپ کی مساعی جمیلہ سے پوری ہوتی نظر آ رہی ہے اس نمبر کو ہر لحاظ سے کامیاب بنانے کیلئے ترجمان اہلسنت کا ہر کارکن بڑی سرگرمی سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ اللہ کرے یہ نمبر پوری آب و تاب سے شہود پر جلوہ گر ہو۔

تابش قصوری

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی برصغیر کے مسلمانوں کے لئے فتح کا عظیم دروازہ ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں شریک ہو کر مسلمانوں نے انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔ لیکن بعض کی ناعاقبت اندیشی اور دشمن کی مکاری کی وجہ سے وہ مقصد فی الفور تو حاصل نہ ہو سکا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ تقریباً نوے سال بعد مسلمان آزاد قوم کی طرح ابھرے اور اپنے لئے ایک خطۂ زمین حاصل کر لیا۔ جنگ آزادی پر مورخین بہت کچھ لکھ چکے ہیں کچھ لکھ رہے ہیں اور اپنا فرض پورا کر رہے ہیں لیکن آزادی کی تحریک کا ایک بڑا حصہ اب تک ترتیب دینے کے لئے پڑا ہے۔ جنگ آزادی کے حقیقی مجاہدین کی کوششوں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور انگریز کے وفاداروں کو مجاہدین کے روپ میں پیش کر کے تاریخ کو مسخ کیا جا رہا ہے اور حقیقت سے آنکھیں چرائی جا رہی ہیں۔

جنگ آزادی میں اہلسنت وجماعت سے تعلق رکھنے والے ہر طبقہ کے افراد نے جو نمایاں حصہ لیا اس کا بہت کم حصہ منظر عام پر لایا گیا ہے۔ اگر مجاہد کبیر حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ جزیرہ انڈیمان میں بیٹھ کر کوئلہ سے وہ حالات رقم نہ فرماتے جو "الثورۃ الھندیہ" کے نام سے ہمارے سامنے ہیں تو شاید ہماری داستان تک کبھی نہ ہوتی داستانوں میں۔

ہمارے اکابرین نے ہر موقع پر کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہم نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ اصل واقعات وحقائق کو جمع کر کے منظر عام پر لائیں۔ ہمارے بہت سے بزرگ جو ان تاریخی واقعات سے بخوبی واقف تھے تمام راز اور اسرار اپنے سینوں میں لئے ہوئے ہم سے جدا ہو کر دفن ہو گئے۔ بعض بزرگ

جو کچھ لکھ گئے وہ ہمارے لئے آج مشعل راہ اور منارۂ نور کا کام دے رہا ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ہمارے ہزاروں مجاہدین نے جام شہادت نوش کئے لیکن آج ہم ان کے ناموں تک سے واقف نہیں۔ اکثر مورخین نے اپنی کتب میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اہلسنت کے صرف ایک عالم مولانا فضل حق خیرآبادی ہی جنگ میں شریک تھے وہ بھی معمولی طور پر اور باقی جہاد ان کے علاوہ دوسرے طبقہ کے لوگوں نے کیا ہے۔

لیکن تاریخی حقائق جھٹلائے نہیں جاسکتے۔ اور جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے۔ جوں جوں جدید تحقیقات سامنے آرہی ہیں اہل سنت وجماعت کے سینکڑوں مجاہدین آزادی کے تذکرے عوام تک پہنچ رہے ہیں جس سے اس فریب کا پردہ چاک ہورہا ہے جو بعض متعصب اور تنگ نظر مورخوں نے قائم کیا تھا۔

ہم کافی عرصہ سے کوشاں تھے کہ کسی طرح جنگ آزادی کے مجاہدوں پر مشتمل ایک خاص اشاعت جلد تحریر کے اسٹیج کی زینت بنائیں جو ادباء۔ شعراء علماء و مشائخ اہلسنت کے کارناموں پر مشتمل ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اور ہم بہت سے ان مجاہدین کا تذکرہ منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں جنھیں ناکارہ سمجھ کر نسیان کی گہری وادیوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ لیکن ہماری اس کوشش کو آخری اور حتمی تصور کرلینا درست نہیں ہوگا کیونکہ یہ تو در اصل ان اسلاف کے کارناموں کو تاریخ میں جگہ دینے کے لئے ایک تمہید ہے اصل کام کے لئے تو ابھی ایک وسیع میدان خالی پڑا ہے جس کے لئے ایک ماہر ٹیم کی ضرورت ہے جو اس میدان میں بہت کچھ کرسکتی ہے۔ امید ہے کہ منصف مزاج مورخوں کے لئے ہماری یہ کوشش ایک تاریخی دستاویز ثابت ہوگی۔

جس وقت ہم نے یہ نمبر نکالنے کا اعلان کیا تھا تو ہمارے بہت سے دوستوں نے کوئی توجہ نہ دی جسکی وجہ سے ہمیں اپنے اس اعلان پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ لیکن اسی دوران چند دوستوں کے خطوط موصول ہوئے جس میں ہماری اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس طرح ہماری ہمت بندھ گئی۔

اس نمبر کی تیاری میں ملک کے بڑے بڑے نامور ادیبوں سے ملاقات کا موقع ملا ہمارے بعض علماء نے اس سلسلے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اس وجہ سے ہم نے ادبا کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور جیسا کہ ہمارے قارئین دیکھیں گے ہم نے کوشش کی ہے کہ اس نمبر میں بڑے نامور ادبا اور علماء کے مضامین شامل اشاعت ہوں۔ یہ فیصلہ ہمارے قارئین کریں گے کہ ہم کہاں تک اس مقصد میں کامیاب رہے ہیں۔

اس موقع پر ہمارے لئے ان دوستوں کا تذکرہ کرنا نہایت ضروری ہے جن کی ذاتی کوششوں اور کاوشوں سے جنگ آزادی نمبر مضامین حاصل ہو سکے۔ خصوصاً ہم محترم محمد صادق صاحب قصوری کے تہہ دل سے ممنون ہیں جنہوں نے اپنے قیمتی وقت کو ہمارے لئے وقف رکھا اور خود اس نمبر کے لئے کوشش کر کے مضامین بھجوائے۔ اسی کے ساتھ مرکزی مجلس رضا کے سرپرست قبلہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری مدظلہ اور ان کے ساتھیوں کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنی خاص نوازشوں سے ہمارے لئے راہ ہموار کی۔ ہم جناب اسد نظامی صاحب اور ان تمام اہل قلم حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس نمبر کو کامیاب بنانے میں ہمارے ساتھ قلمی تعاون فرمایا افسوس کہ چند مضامین اس حصہ کی زینت نہ بن سکے۔ انشاء اللہ دیگر مضامین "جنگ آزادی نمبر، حصہ دوم" میں شامل کر دیئے جائیں گے۔

ہم آپ کے اور جنگ آزادی کے تذکرہ کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں ہونا چاہتے اس لئے اجازت چاہیں گے۔ نمبر کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے سے ضرور مطلع فرمائیں۔

نوامیس وحی

والضحیٰ

پروفیسر مفتی سید شجاعت علی قادری

وَالضُّحٰی (۱) وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی (۲) مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی (۳) وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی

قسم ہے چاشت کی اور قسم ہے رات کی جب پھیل جائے کہ تمہیں نہ تو تمہارے رب نے چھوڑا اور نہ مکروہ جانا اور بلاشبہ آخرت تمہارے لئے دنیا سے کہیں بہتر ہے۔

تفسیر :

یہ سورۃ بالاتفاق مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کا شانِ نزول اکثر مفسرین نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ یہود نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا امتحان لینے کے لئے اہل کتاب کے ایک وفد کو آپ کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ وہ آپ سے مندرجہ ذیل سوالات دریافت کریں۔ یہ سوال ایسے ہیں جن کا جواب بغیر علوم نبوت کے ممکن نہیں، وفد نے یہ تین سوال کئے۔

۱:- روح کیا ہے ؟

۲:- ذوالقرنین کون تھا ؟

۳:- اصحاب کہف کون تھے ؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں ان کا جواب کل دوں گا، مگر اس وعدہ کے ساتھ آپ نے انشاء اللہ (یعنی اگر اللہ نے چاہا) کا اضافہ نہ فرمایا۔ اس لئے ۱۴ دن تک ایک روایت کے مطابق آپ پر وحی نہ آئی، اس اثناء میں آپ پر شدید قلق و اضطراب کی کیفیت طاری رہی، اور کیوں نہ ہوتی، کہ وحی کی لذت ہر کلام کی لذت سے زائد ہے ہر شخص اپنے محبوب سے سلسلہ کلام جاری رکھنے کا متمنی ہوتا ہے، کلام اللہ کی تاثیر سے تو پتھر پہاڑوں سے لڑھکتے، اور چٹانوں سے چشمے بہہ نکلتے ہیں، وحوش، طیور، جن وانس دم بخود ہو جاتے ہیں اور خوف خدا کا سرمایہ رکھنے والے جب کلام الٰہی پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گلستان ایمان میں بہار آجاتی ہے۔

پس ایسے لذیذ کلام کا انقطاع آپ پر گراں کیوں نہ گزرتا، اس پر مستزاد یہ کہ ابولہب کی بیوی، آپکی سگی چچی ام جمیل، جو آپ کی راہ میں کانٹے بچھایا کرتی تھی، بطور طعنہ کہنے لگی۔

یا محمد ما اری شیطانک الا قد ترکک۔

ترجمہ:۔ اے محمد میرے خیال میں تمہارے شیطان نے تمکو چھوڑ دیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ اپنے بدخواہوں اور ایذا دینے والوں کو جواب نہ دیتے اور نہ انکے لئے بددعا فرماتے، مگر خود آپ کا رب کریم آپ کا دفاع فرماتا۔ یہاں بھی معاملہ ایسا ہی ہوا۔ اہل مکہ مدعی تھے کہ محمد کو ان کے رب نے چھوڑ دیا اور اب وہ ان سے ناراض ہے۔ اللہ تعالٰی نے ...لے اپنے رسول سے کئے جانے والے دعوے کو خود اپنے اوپر لے لیا۔ اب اہل مکہ مدعی تھے اور اللہ تعالٰی مدعا علیہ، قاعدہ ہے کہ مدعی اپنے دعوے پر گواہ پیش کرے۔ اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز آجائے تو مدعا علیہ پر قسم لازم ہے۔

ظاہر ہے کہ اہل مکہ اپنے دعویٰ پر گواہ پیش نہ کر سکتے تھے پس قاعدہ کے مطابق حق تعالیٰ نے قسم بیان فرمائی کہ "والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ" یعنی اے اہل مکہ، میں ضحیٰ اور لیل" کی قسم کے ساتھ ارشاد فرماتا ہوں کہ تم اپنے دعویٰ میں قطعاً جھوٹے ہو۔

ضحیٰ اور لیل کی مختلف تفاسیر ہیں۔

یا تو ضحیٰ سے مراد دن اور لیل سے مراد رات ہے، اس قسم کو مضمون سے مناسبت

اس طرح ہوگی کہ اے لوگو! جس طرح اللہ تعالیٰ نے زمانے کو دو حصوں میں منقسم فرمادیا ہے، دن، اور رات میں، تاکہ تم رات کی تاریکی دیکھ کر دن کے اجالے کی اہمیت جان جاؤ اور دن کا شور و شغب سن کر رات کے سکون اور اطمینان کی قدر و قیمت واضح ہو جائے۔ اسی طرح نزول وحی کے انقطاع سے نزول وحی کے زمانے کی عظمت کا حال معلوم ہو جائے گا۔ لہٰذا وحی کا نازل کرنا بھی حکمت اور اس کا منقطع کرنا بھی حکمت الٰہیہ ہے۔ انقطاع وحی سے خدا کی ناراضگی پر استدلال درست نہیں۔

تفسیر کبیر میں ہے کہ ضحیٰ سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ اقدس ہے اور لیل سے مراد آپ کی زلف عنبریں۔ امام رازی مزید فرماتے ہیں۔

ترجمہ:- "والضحیٰ سے مراد آپ کا نور علم بھی ہو سکتا ہے جس سے آپ غیب کی باتیں پہنچاتے ہیں اور لیل سے مراد آپ کا عفو و کرم ہے جس سے آپ خطا کاروں کو معاف فرماتے ہیں۔ (کبیر جز ۸۔ ص ۲۰۹)

الحاصل، ان قسموں کے بعد فرمایا کہ آپ کے رب نے نہ تو آپ کو چھوڑا ہے نہ وہ آپ سے ناراض ہے، یہ سب کچھ اس کی حکمتوں کے پیش نظر ہے۔

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ روز یہود آپ سے دریافت کرتے کہ ہمارے سوالوں کے جواب کیا ہوئے اور آپ روز ان سے آئندہ کا وعدہ فرماتے اس صورت حال سے مشرک اور منافق بہت خوش ہوئے اور سمجھنے لگے کہ اسلام کے دن پورے ہوئے، ایک دن وعدہ کے ساتھ آپ نے انشاء اللہ بھی فرما دیا تو سلسلہ وحی دوبارہ جاری ہو گیا، آپ نے یہود کے تمام سوالات وحی کی روشنی میں حل فرما دیئے۔ انقطاع وحی کے زمانے میں جبکہ مشرک و منافقین بغلیں بجا رہے تھے، امور نبوت اور وحی سے واقف اہل کتاب مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ محمد اگر جھوٹے ہوتے اور یہ کلام ان کا من گھڑت ہوتا تو چالیس دن تک اپنے دشمنوں کی سخت سست باتیں کیوں سنتے از خود کوئی نہ کوئی جواب بنا کر پیش کر دیتے۔ مگر اس مدت دراز کے بعد جواب دینا اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ آپ بغیر وحی کے کچھ ارشاد فرماتے ہی نہیں۔ اس واقعہ سے انشاء اللہ کی فضیلت و اہمیت بھی بتانا مقصود تھی، مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ مستقبل کے عزائم کے ساتھ لفظ انشاء اللہ ضرور کہا کریں تاکہ اس مبارک کلمہ کی برکتوں سے عزائم میں کامیابی نصیب ہو۔

پھر فرمایا کہ آپ کا ماضی تو اچھا ہے مگر مستقبل کی ہر ساعت برتر و بالا ہے۔ آپ کی عزت اور آپ کے مناصب بڑھتے ہی جائیں گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ چڑھتے سورج کی طرح دعوت اسلام پھیلتی گئی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و عظمت دو بالا ہوگئی۔

امام رازی نے اس موقع پر تحریر فرمایا :-

كانه تعالى يقول له انك في الدنيا على خير لانك تفعل فيها ما نريد ولكن الآخرة خير لك لانا نفعل فيها ما تريد۔

ترجمہ۔ "گویا اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرما رہا ہے کہ آپ دنیا میں بھی بھلائی پر ہیں کیونکہ یہاں وہی کرتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں مگر آخرت میں زیادہ بھلائی پر ہیں کہ وہاں ہم وہ کریں گے جو آپ چاہیں گے۔

آپ کے لئے آخرت اس لئے بھی بہتر ہے کہ وہاں آپ کو آپ کی امت مجتمع ملے گی امت نبی کے لئے اولاد معنوی کی حیثیت رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ تمام اولاد سے بیک وقت ملاقات انتہائی مسرت کا باعث ہوگی۔

پھر آخرت کو آپ نے خرید لیا ہے۔ لہٰذا آخرت آپ کے لئے دنیا سے بہتر ہے۔ آخرت اس لئے بھی بہتر ہے کہ دنیا میں کفار آپ پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ مگر آخرت میں سوائے تعریف کے کچھ نہ ہوگا۔ آپ کی امت تمام امتوں کی گواہ اور آپ تمام نبیوں کے گواہ کی حیثیت میں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ گواہ باعزت اور باوقار لوگ ہی ہوتے ہیں۔

خاص اشاعت ہونے کی وجہ سے اس شمارے میں خبرنامہ شریک اشاعت نہیں ہے۔ جس کے لئے ہم تمام اداروں انجمنوں اور تنظیموں سے معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

شہیدِ حریت حضرت مولانا مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی علیہ الرحمۃ

اللہ اللہ اس رہِ حق کے مسافر کا چلن
جو رہا باطل کے ہر ظلم و ستم پر خندہ زن

وہ نشانِ عظمتِ اسلام، بطلِ حریت
جس کی ٹھوکر میں رہا تاجِ سلاطینِ زمن

آسمانِ اہلسنت کا درخشاں آفتاب
ہند کے ظلمت کدوں پر جو رہا پرتو فگن

جس کی درویشی پہ دارا و سکندر ہوں نثار
تاجِ شاہی سے بھی بڑھ کر جس کی تارِ پیرہن

شیر دل، بے باک، جرأت آزما، جنگ آشنا
مردِ میداں، قوتِ بازوئے حق، باطل شکن

موت کا رسیا، طلبگارِ شہادت، مردِ حق
زندگی سے کھیلنے والا شہیدِ بے کفن

پابجولاں جرمِ آزادی میں گھر کو چھوڑ کر
تیرہ و تاریک صحرا میں رہا جو خیمہ زن

جس کے نعروں نے پریشاں کر دیا صیاد کو
مدتوں رو دیں گے جس کو ہم صفیرانِ چمن

جس نے بنیادیں ہلا دیں قصرِ استعمار کی
کاٹ ڈالے جس نے محکوموں کے زنجیر و رسن

کعبۂ اہلِ صفا، قبلۂ اربابِ دین
ماحیِ کفر و ضلالت، حامیِ دینِ حسن

تا دمِ آخر عنایت جس پہ احمد کی رہی
اب بھی جس کی قبر پر ہے سایہ سے فگن

جس سے تاریخِ جہادِ حریت تابندہ ہے
نام جس کا زندہ ہے جس کا عمل پائندہ ہے

(اسد نظامی نے رقم کیا)

تحریک آزادی کے سنی مشائخ

جہاں سنی نواب صاحبان اور علماء و شعراء اہلسنت و جماعت فرنگی تسلط کے خلاف اپنی جد و جہد کر رہے تھے وہیں حضرات مشائخ کرام بھی بے خبر نہ تھے۔ بلکہ اپنے مساکن کو خیر باد کہہ کر میدان میں تشریف لے آئے۔ ان بے شمار شخصیتوں میں سے اختصار کے ساتھ چند مشائخ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ محراب شاہ صاحب قلندر گوالیاری علیہ الرحمۃ

آپ خطۂ گوالیار کے مشہور بزرگ خواجہ محمد غوث صاحب گوالیاری علیہ الرحمۃ کی اولاد امجاد میں سے تھے۔ جنگ آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو حضرت مخدوم مولانا فضل حق خیر آبادی کے فتویٔ جہاد کے ایما پر آپ نے بھی گوالیار اور مضافات کے علاقوں سے اپنے تمام مریدوں اور دوستوں کو جمع کر کے انگریزوں کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ مخبروں نے انگریزوں کو یہ خبر پہنچائی تو جنرل لاک نے اپنی فوج لے کر گوالیار پر حملہ کر دیا جس میں آپ کے مرید و دوست شہید ہو گئے۔ اس واقعہ کو صاحب تاریخ گوالیار نے اسطرح نقل کیا ہے۔

"جب گوالیار کے مشہور سجادہ نشین خواجہ محراب شاہ نے انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد شروع کی تو مخبروں کی مخبری سے میجر جنرل لاگ نے آپ کو اور آپ کے مرید و دوستوں کو شہید کر دیا۔"[1]

آپ اور آپ کے ساتھی و مرید تو شہید ہو گئے مگر شمع آزادی بدستور فروزاں رہی آزادی کے فریفتہ پروانے جلتے رہے فرنگی جور وستم کرتے رہے۔ مگر قافلۂ آزادی رواں دواں رہا۔ آپکی تاریخ شہادت ۱۱ محرم الحرام ۱۲۳۳ھ ہے آپ کو حضرت مخدوم شاہ محمد غوث صاحب کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

حضرت خواجہ قطب الدین صاحب دہلوی علیہ الرحمۃ

آپ سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ فخر الدین صاحب چشتی نظامی دہلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلف الرشید تھے جب برطانوی حکمرانوں نے برصغیر پاک و ہند پر اپنا تسلط جمانے کی خاطر پر و بال کھولے تو علماء و مشائخ اہلسنت نے برطانوی حکمرانوں کی عیارانہ چالوں کو بھانپ گئے اور ان کے خلاف اپنی تحریک چلائی۔ ان مجاہدین میں سے حضرت ممدوح مذکور بھی شامل تھے چنانچہ آپ نے دہلی کی جامع مسجد میں حضرت مولانا فضل حق صاحب کے فتویٔ جہاد کی تائید و توثیق فرمائی اور آپ نے نہ صرف اہالیان دہلی کو بلکہ تمام برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو دعوت جہاد دی جن کا تذکرہ صاحب مشائخ دہلی نے کیا ہے۔

"مولانا خواجہ فخر الدین صاحب دہلوی کے صاحبزادے خواجہ قطب الدین دہلوی نے مشہور عالم دین مولانا فضل حق خیر آبادی کے اس جہاد کے فتویٰ کی تائید کرتے ہوئے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو برطانوی حکمرانوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔"[2]

حضرت خواجہ صحب جب تقریر کرنے کے بعد واپس اپنی درگاہ شریف میں تشریف لے گئے تو برطانوی حکمرانوں نے رات کی تاریکی میں آپ کو شہید کر دیا آپکی تاریخ شہادت ۱۸ محرم الحرام ۱۲۳۳ھ ہے۔ آپ کی یہ رباعی بھی مشہور ہے۔

دور باش از مکر و فریب فرنگیاں ✦ وقت جہاد است ازیں غافل شو
ہر کہ از میدان جہاد بگریزد ✦ او را منافق دان و از وی دور شو

سلطان بہادر شاہ ظفر مرحوم بھی آپ کا مرید تھا۔

آپ سلسلہ نقشبندیہ کے حضرت خواجہ شاہ غلام علی صاحب دہلوی علیہ الرحمۃ کے خلفاء میں سے تھے۔ آپ علوم عقلیہ و نقلیہ میں مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی و شاہ مولانا فضل امام صاحب خیرآبادی و مفتی شرف الدین صاحب دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے۔

جب تحریک آزادی کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ نے بھی حتی الوسع جد و جہد کی جسکا اعتراف ایک برطانوی مخبر عبد اللطیف دہلوی یوں کرتا ہے۔

"جانشین شاہ غلام علی شاہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مولانا پیر رشید شاہ احمد سعید ستودہ برگزیدہ، نخستین بعزم جہاد ایں مفسدان برخاست و علم جہاد رو بروئے جامع برافراشت و تلقین جہاد نہاد و صدائے عام دادہ شنیدن مردم ہا گرد آمدن ہماں، پیش گاہ جامع مجمع ارادت مندان آمد پس از مجاہدان اکثرے را متام بودن ہماشد از دوکانداران بیشترے راہمت خوردو نوشی دادن اشیای آمد" ۳ھ

برطانوی جاسوس و مخبر نے "بعزم جہاد ایں مفسدان برخاست" کا جو فقرہ استعمال کیا ہے۔ وہ نہ صرف محل نظر ہے بلکہ بے سروپا بھی۔ کیونکہ جو شخصیت جہاد میں شامل ہو کر کفر کی یلغار کا مقابلہ کرنے میں خود کو شریک تصور کرے تو اس پر مفسدان جہاد کا فقرہ چسپاں کرنا بعید از حقائق ہے۔ مگر چونکہ عبد اللطیف، برطانوی مخبر تھا۔ اس نے برطانوی حاشیہ برداری کے زعم میں جو جی میں آیا سو وہ لکھتا چلا گیا۔ مگر اس کے باوجود بھی عبد اللطیف نے حضرت خواجہ صاحب کے متعلق تحریک آزادی میں حصہ لینے کا اعتراف کیا ہے جو بالکل صحیح ہے۔

"آپ تحریر و تقریر میں بھی ید طولیٰ اور قدرت رکھتے تھے علمی و فکری محاذ کے بھی آپ شہکار تھے"۔ بقول صاحب حدائق الحنفیہ کے آپ نے بے شمار کتابیں تصنیف فرمائیں۔ صاحب تصنیف و تالیف ہونے کے علاوہ آپ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے چنانچہ آپ نے فرنگی تسلط کے خلاف جو کاوشیں فرمائیں ان کی مختصر سی جھلک ان شعروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

دوستو مہربانو ہے وقت یہ جہاد کا
نکال دو انھوں کو تم کھٹکا نہ رہے فساد کا
یہ فرنگی بے دین ہیں دشمنانِ دین ہیں
رہا ہے نہ فرق اب تو محمود و ایاز کا ۴ھ

آپ نے بھرپور حصہ لیتے ہوئے انگریزوں کے خلاف دھلی کے لوگوں میں ... حرارت آزادی پیدا کرنے کی ہرچند کوششیں کیں مگر جب آپ نے یہ دیکھا کہ قوم بے حس ہو چکی ہے لوگوں کی رگوں میں حمیت کا خون منجمد ہو چکا ہے۔ تو پھر آپ دہلی سے ترک سکونت کر کے بیت اللہ شریف تشریف لے گئے۔ اور یہیں پر آپ کا وصال ہوا سالِ رحلت ۱۲۷۷ھ ہے۔

جناب سید محمد قاسم شاہ صاحب داناپوری علیہ الرحمۃ

مولانا جناب سید محمد قاسم شاہ صاحب علیہ الرحمۃ خطۂ داناپور کے مشہور مشائخ اہلسنت کے خاندان میں سے تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت شاہ تراب الحق صاحب داناپوری نے بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کے خلاف اپنی افواج و عوام کو مجتمع کرنے کی ہرچند تاکید کی اس جدوجہد میں آپ کے خلف الرشید بھی ساتھ تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۱۸ھ میں ہوئی آپ نے تمام تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ آپ فن شاعری میں حضرت مولانا غلام امام شہید علیہ الرحمۃ کے شاگرد رشید تھے۔

۱۲۶۱ھ میں جب مولانا شاہ احمد اللہ شاہ دلاور جنگ نواب زادہ چیناپٹن خلیفہ محراب شاہ صاحب قلندر گوالیاری آگرہ میں آئے اور سید محمد قاسم شاہ صاحب داناپوری سے ملاقات کی تو آپ نے انگریزوں کے خلاف عوام میں بغاوت کرنے کے منصوبے بنائے اور باقاعدہ عملی طور پر اپنی جدوجہد شروع کر دی۔ ۵

ان سطور سے معلوم ہوا کہ آپ نے برطانوی سامراج کے خلاف کس قدر جدوجہد کی اور لوگوں میں شعورِ آزادی پیدا کرنے کی کتنی مساعی کی۔ مفتی انتظام اللہ شہابی نے لکھا ہے کہ:۔

"شاہ صاحب اپنے مریدوں کو ملحہ میدان میں فوجی قواعد سکھاتے اور ارکانِ مجلس علماء میں بھی شرکت کرتے ہیں"۔ ۶

مفتی صاحب کے اعتراف کے بعد اب ایک اور حوالہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"سید محمد قاسم شاہ صاحب داناپوری کو بجرم آزادی و خلاصی از فرنگیان کے چار سال کی سزا دی گئی اور جیل میں آپ کو کافی تکالیف پہنچائی گئیں رہائی کے بعد بھی آپ کی صحت بحال نہ ہو سکی"۔

آپ کا وصال شریف ۱۴ ماہ ذی القعد ۱۲۹۸ھ میں ہوا داناپور کی ایک جامع مسجد میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

حضرت بابا نگاہی شاہ صاحب شہید چنیوٹی علیہ الرحمۃ

آپ جھنگ مگھیانہ کی مشہور تحصیل چنیوٹ کے باشندہ تھے۔ سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور سلسلۂ سہروردیہ سے منسلک تھے علاقۂ جھنگ و چنیوٹ میں آپ کے بیشمار مرید تھے۔ جب ۱۸۵۷ء کا دور آیا تو آپ نے اپنے مرید نواب احمد خاں کھرل شہید مراد فتیانہ شہید و سردار احمد خان ملتانی کو ساہیوال و جھنگ و ملتان کے علاقے کا سپہ سالار منتخب کر دیا۔

جب بارکلے جھنگ پر ۱۸۵۷ء کے آخر میں اپنی بھاری فوجی جمعیت لے کر آیا تو آپ نے اپنے مریدوں کو ان برطانوی فوجیوں سے جہاد کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ مراد فتیانہ نے بارکلے کو جہنم واصل کر دیا۔

"جب بارکلے نے جھنگ پر حملہ کر کے جھنگ کو فتح کرنا چاہا تو بابا نگاہی شاہ اور اس کے مرید مراد فتیانہ، سردار احمد خاں کھرل و نواب احمد خاں کھرل نے ان برطانوی افواج پر بے تحاشہ حملہ کر کے برطانوی جرنیل بارکلے کو قتل کر دیا اور برطانوی فوج پسپا ہو کر تتر بتر ہو گئی" ۔ ؎

پھر صاحب تاریخ جھنگ ان الفاظ میں رقمطراز ہیں۔

"بابا نگاہی نے فاتح دستے سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جو برطانوی فوجی بچ کر نکل گئے ہیں وہ سیدھے دہلی پہنچ چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہڈسن دوبارہ کسی دستے کو بھیجے گا اور ہم پر حملہ کرائے گا۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہر وقت برطانوی افواج سے چوکنا رہیں کسی وقت بھی غافل نہ رہیں" ۔ ؎

حضرت بابا نگاہی شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے اس وعظ سے مجاہدین میں از سرِ نو انگریزوں کے خلاف خونِ آزادی حرکت کرنے لگا۔ جوش و خروش اور ولولہ انگیزی بام عروج پہ طلوع ہوئی۔

برکلے کی ہلاکت

جب برکلے ۲۲ ماہ ستمبر ۱۸۵۷ء کو کوڑے شاہ سے دریائے راوی کے ساحل پر ایک گھنے دار درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوا تو مجاہدین آزادی نے ان خاردار درختوں میں اس کا محاصرہ کر کے یک لخت حملہ کر دیا۔ بقول صاحب تاریخ جھنگ۔ (قلمی)

"مجاہدین آزادی بر افواج برکلے حملہ کردند و جملہ را در جہنم واصل کردند حضرت

بابا نگاہی شاہ درمیدانِ آنجا شہادت نوشیدند" [۹]

جب برکلے اور اس کی فوج کا خاتمہ ہوا تو اسی میں حضرت بابا نگاہی شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے بھی جامِ شہادت نوش فرمایا تاریخ شہادت ۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء ہے۔

حضرت مخدوم حافظ جمال اللہ والدین ملتانی چشتی نظامی قدس سرہ العزیز

حضرت مخدوم قبلہ حافظ محمد جمال اللہ والدین چشتی نظامی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مخدوم قبلہ خواجہ ابو الحسن خرقانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد امجاد میں سے تھے۔ آپ اعوان قوم سے متعلق تھے۔ آپ کے جدا مجد حضرت حافظ عبدالرشید صاحب علیہ الرحمۃ اعوان قادری۔ ضلع گجرات سے بہ عہد شاہجہاں ملتان میں بہ عالم عنفوان، تشریف فرما ہوئے۔

حضرت مخدوم حافظ صاحب کی ولادت باسعادت ۱۱۲۵ھ کو ملتان ہی میں ہوئی۔ آپ نے علوم اور معارف وحفظ قرآن کریم اپنے والد ماجد حضرت قبلہ حافظ محمد یوسف علیہ الرحمۃ ہی سے حاصل فرمایا۔

حضرت حافظ صاحب میدان جہاد میں

جب احمد شاہ ابدالی کی رحلت کے بعد شاہ زمان غزنی کے تخت پر متمکن ہوا تو شاہ زمان کی نااہلی کی بنا پر رنجیت سنگھ نے اپنا لاؤ لشکر لے کر پنجاب کے شمالی وجنوبی علاقوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ملتان کے گورنر نواب مظفرالدین شہید نے شاہ زمان سے سکھوں کے خلاف مدد طلب کی تو اس نے کوئی جواب نہ دیا جس سے نواب صاحب کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر نواب نے ملتان کے قلعہ پر اپنا مدد و سامانِ رسد جمع کیا اور سکھ شاہی کا مقابلہ کرنے پر تل گیا۔

نواب صاحب کے لشکر کے ساتھ حضرت قبلہ حافظ محمد جمال اللہ الدین ملتانی علیہ الرحمۃ اور آپ کے دو خلیفہ حضرت خواجہ محمد خدا بخش صاحب خیر پوری، وحضرت خواجہ غلام حسن ملتانی علیہم الرضوان بھی آپ کے دائیں اور بائیں شمشیریں سونت کر ملتان کے قلعہ کی نگرانی کر رہے تھے۔ بقول صاحب مناقب المحبوبین شریف:

"کہ درآں وقتِ جنگ حافظ صاحب مرحوم در برج قلعہ ملتان تیر وکمان بدستِ خود گرفتہ تیر برکافراں مے انداختند و در ہر برج کہ میدیدند حافظ صاحب موجود بودند۔" [۱۰]

حضرت قبلہ حافظ صاحب کی یہ کرامت تھی۔ جب بھی سکھ قلعہ کے کسی برج پر آتے

توحضرت صاحب کو ہر برج میں موجود پاتے اور حملہ کرنے کی سکت نہ پاکر واپس مایوس لوٹ جاتے۔ صاحب گلزار جمالیہ حضرت علامہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں۔

" آں حضرات از شجاعان ترین مرداں چنانکہ خوانده شد شبے بسوئے خوف پس سبقت کرد از جواناں قوم مجانے کہ تیغ بدست گرفتہ بود و چوں سکھ کافر ملتان آمد محاصرہ کرد قلعہ واپس گفتہ شد آں حضرت را پیش ازاں کہ محاصرہ کرده شود۔ شہر بہتر آں ست کہ ہجرت فرمائی شہر دیگر پس فرمود آواز جنگ بکفار عام است و اکنوں جنگ ما یان فرض عین کرد پس فی الحال بیرون نمے رویم کہ برائے ما دو درجہ است۔ یکے از درجۂ غزا دوم شہادت الخ . . . . . ؎

الغرض حضرت حافظ صاحب سکھ شاہی کے خلاف قلعہ کے اندر اور باہر نبرد آزما رہے اور سکھوں کی یلغار کا مقابلہ ہمہ تن مستعدی کے ساتھ کرتے رہے۔ اسی رن گاہ میں آپ شدید زخمی بھی ہو گئے۔

پھر اس کے بعد آپ صحت یاب نہ ہو سکے۔ آپکی رحلت ۵ رجادی الاول ۱۲۲۶ھ میں ہوئی۔

حضرت خواجہ منشی غلام حسین صاحب شہید علیہ الرحمۃ

حضرت خواجہ منشی غلام حسن صاحب شہید علیہ الرحمۃ قوم کھٹی سے تعلق رکھتے تھے آپ کا خاندان کئی صدیوں سے ملتان میں آباد تھا۔ حضرت منشی صاحب حضرت قبلہ حافظ محمد جمال اللہ والدین ملتانی علیہ الرحمۃ کے مرید و خلیفہ تھے۔ جب سکھوں نے ملتان کے قدیم قلعہ پر حملہ کیا تو آپ بھی اپنے مرشد گرامی قدر کے ہمراہ تھے۔ حضرت مخدوم منشی خواجہ غلام حسین شہید علیہ الرحمۃ علوم و فنون کے متبحر ہونے کے ساتھ ساتھ میدان نخچیر گاہ کے زبردست ماہرین میں سے تھے۔ گویا کہ میدان جہاد میں آپ کو تجربہ و مہارت تامہ حاصل تھی۔

"جب انگریزوں نے قلعے پر حملہ کیا تو آپ مجاہدین آزادی کی سرپرستی کر رہے تھے۔ احمد خاں کھرل شہید آپ کا مرید تھا۔ آپ کی تحریک پر احمد خاں کھرل نے انگریزوں کے خلاف بھرپور حصہ لیا" ؎

پھر صاحب ملفوظات حسنیہ فارسی آپ کے متعلق رقمطراز ہیں۔

"حضرت خواجہ منشی غلام حسین — در معرکہ جہاد بمقابلۂ فرنگیان شہید شدند" [۱۲]

خواب کے اندر قبلہ حافظ محمد جمال اللہ والدین ملتانی قدس سرہٗ نے اپنے ایک مرید کو یہ ارشاد فرمایا کہ جب تک میرا منشی غلام حسن ملتان کے قلعہ پر موجود رہے گا اس وقت تک یہ انگریز ملتان پر ہرگز قبضہ نہیں کر سکیں گے حضرت صاحب ملتان کے قلعے پر پہرہ دے رہے تھے اور اسوقت ملتان کے مشرق جانب برج پر تشریف فرما تھے کہ مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا آپ نے مع زرہ بکتر پوش نماز شروع کردی۔ دشمن نے موقعہ غنیمت جانتے ہوئے آپ پر بندوق کی گولیوں سے بوچھاڑ کر دی اور عین نماز میں آپ نے جام شہادت نوش فرمایا۔

"حضرت حسن شہید بتدبیر کردگار — زانجا بہ جنت رفت بہ جنت شدش قرار
تاریخ وصل جستم وہاتف جواب داد — از مظہر جمال الٰہی است آشکار" [۱۳]

۱۲۶۵ھ

تاریخ شہادت ۲۹ ماہ محرم الحرام شریف ۱۲۶۵ھ۔ آپ کا مزار شریف بیرونی خونی برج ملتان شریف موجود ہے۔

حضرت مخدوم شاہ محمد صاحب

آپ کی ولادت باسعادت بدایوں کے قصبہ زمانیہ میں ہوئی آپ حضرت مخدوم شاہ احمد عرف اچھے میاں صاحب مارہروی قادری علیہ الرحمۃ کے مرید و خلیفہ تھے۔

بقول صاحب تاریخ محبوب الاذکار کے۔

"آپ نے کمال تجرد اور آراستگی سے اوقات بسر کی آپ کا دست غیب محض توکل علی اللہ پر تھا۔" [۱۴]

جب برطانوی استعمار کا خونچکاں باب شروع ہوا تو یہ متوکل علی اللہ تسبیح و سجادہ کے دور سے گزر کر میدان جہاد میں کود پڑا جیسا کہ صاحب تاریخ محبوب الابرار نے اعتراف کیا ہے۔

"حضرت شاہ محمد صاحب بدایونی شہید اپنے حلقہ ارادت مندوں و مریدوں سمیت تیغ و سناں سے آراستہ و پیراستہ ہو کر بے خوف و خطر کود پڑے لارڈ ہیسٹنگ کے فوجی دستے پر آپ نے حملہ بول دیا جس میں کافی لوگ برطانوی فوج کے مارے گئے" [۱۵]

حضرت شاہ صاحب معہ ساتھیوں کے انگریز قاتلوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرما گئے۔

آپ کا تعلق حضرت مولانا شاہ احمد اللہ صاحب شہید مدراسی علیہ الرحمۃ سے تھا جنرل بخت خاں شہید آپکی علمی و حربی صلاحیتوں کا بے حد قدر داں تھا۔
آپ کی شہادت ۵ رماہ شعبان المعظم ۱۲۵۵ ھ میں ہوئی۔

حضرت مخدوم پیر حافظ عبدالعزیز صاحب روہیلکھنڈ شہید

آپ حضرت مخدوم پیر حکیم حاجی الٰہی بخش صاحب بنوی مرحوم کے خلف الرشید تھے آپ کا سلسلۂ بیعت حضرت مخدوم شاہ محمد صاحب شہید علیہ الرحمۃ سے تھا آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۱۱ھ میں ہوئی۔ آپ روہیلکھنڈ سے شاہجہاں آباد میں سکونت پذیر ہو گئے۔ آپ غلام قادر خاں روہیلہ کے استاد تھے۔

آپ نے [illegible] کے مقابلے میں جام شہادت نوش فرمایا۔

تاریخ شہادت [illegible] ماہ محرم الحرام ۱۲۹۶ھ [illegible] سال تاریخی مادہ خاص خدا ۱۲۹۶ھ —— آپ کا مزار مقدس شاہجہاں آباد کے اندر موجود ہے۔

حضرت پیر شاہ بولن صاحب قادری شہید علیہ الرحمۃ

آپ کا سلسلہ نسب یوں ہے کہ حضرت مخدوم پیر شاہ بولن بن شاہ کریم اللہ بن شاہ رحمت اللہ بن شہود تا صحیح بولاقی قادری علیہ الرحمۃ۔

آپ قصبہ بوری میں سکونت رکھتے تھے۔ جب حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ نے دہلی کی جامع مسجد میں فتویٰ جہاد دیا تو آپ نے اسی فتویٰ جہاد کی نہ صرف توثیق و حمایت کی بلکہ عملی طور پر میدان جہاد میں حصہ لیا۔ نتیجہ آپ اسی معرکے کے اندر شہید ہو گئے۔

بقول صاحب تحفۃ الابرار کے۔

آپ کی جائیداد کثیر کئی لاکھ کی تھی ۔ چاندنی چوک میں آپ کی رہائش تھی
۱۸۵۷ء کے غدر میں معرض جائیداد ضبطی میں آگئی تھی پھر آپ کو شہید کیا گیا۔
آپ کی شہادت ۱۲۷۶ھ میں ہوئی۔ تاریخی مادہ یہ ہے۔ مادلے جہاں غلام یونس ۱۲۷۶ھ

حضرت خواجہ سید عبد النبی شاہ صاحب قادری ملتانی شہید علیہ الرحمۃ

آپ کی ولادت تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان شریف میں ہوئی۔ آپ نے موضع پیران غائب تحصیل وضلع ملتان شریف میں تشریف فرما کر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

جب دیوان مولراج انگریزوں کے ہاتھوں مارا گیا تو آپ معہ اپنے احباب و تلامذہ کے ملتان کے قلعے پر مجاہدین آزادی کی حوصلہ افزائی کرنے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کی غرض سے تشریف فرما ہوئے۔ آپ معہ احباب و تلامذہ کے شمشیر وسناں کے ساتھ محض اللہ کے بھروسے پر انگریزوں کے خلاف برسرپیکار رہے۔

مگر غداروں کی غداری نے آپ کو اور آپ کے احباب و تلامذہ کو ملتان کے قلعے پر شہید کر دیا۔ آپ نہ صرف عالم دین تھے بلکہ فنون شاعری اور بزم گاہی کے تمام نشیب و فراز سے بھی بخوبی واقف تھے۔

آپ کا مزار شریف کھاد فیکٹری پیران شریف کی دیوار کے ساتھ متصل موجود ہے۔

تاریخ شہادت ۱۷۔ ماہ رجب ۱۲۶۷ھ

حضرت خواجہ خدا بخش صاحب چشتی نظامی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کی ولادت باسعادت ۱۱۵۲ھ میں بمقام ٹلمبہ ضلع ملتان میں ہوئی۔ آپ قریشی النسل اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد امجاد میں سے تھے۔

آپ کا خاندان سرزمین عرب سے محمد بن قاسم کے ساتھ ملتان میں آیا تھا۔ مختلف ادوار میں وقتاً فوقتاً اسلامی عہد میں مختلف عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔

ابتدائی تعلیم حضرت مولانا عبد الحکیم صاحب قادری گڑھی اختیار خان ضلع رحیم یار خان میں حاصل کی اور منتہی کتب علوم و معارف دہلی شریف میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمۃ سے پڑھیں سکھا شاہی اور مرہٹوں سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے حضرت شاہ صاحب نے جو وفد غزنی احمد شاہ ابدالی کے ہاں بھیجا تھا۔ اس وفد کے سرخیل حضرت خواجہ صاحب ہی تھے گویا کہ احمد شاہ ابدالی حضرت خواجہ صاحب کی وساطت ہی سے پانی پت کے میدان اور دیگر معرکوں میں کامیابی حاصل کر سکا۔

حضرت خواجہ صاحب دہلی شریف سے واپس تشریف لا کر ٹلمبہ ملتان شریف محلہ کلاں میں قیام فرما ہوئے اور ملتان شریف ہی میں آپ نے حضرت مخدوم خواجہ حافظ محمد جمال اللہ والا چشتی نظامی ملتانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دست پر بیعت کی اور خرقہ خلافت حاصل فرمایا۔

آپ کا جہاد میں حصہ

جب احمد شاہ ابدالی کا انتقال ہوگیا تو شاہ زماں تخت نشین ہوا۔ یہ شخص نہایت ہی نااہل ثابت ہوا جس کی بناء پر سکھا شاہی پنجاب کے بیشتر حصوں پر قابض ہوگئی۔

ملتان کے نواب حضرت مظفر الدین شہیدؒ جو کہ احمد شاہ ابدالی کی جانب سے ملتان میں گورنری کے عہدے پر فائز تھے ان کی افواج کیلئے محدد علاقے بالکل کم ہوکر رہ گئے تھے۔

سازشیوں کی سازشوں کی بناء پر رنجیت سنگھ ملتان کے قلعے پر اپنا لاؤ لشکر لے آیا اور باقاعدہ ملتان پر حملہ کردیا۔ اسی نواب صاحب کے فوجی دستے میں حضرت خواجہ حافظ جمال اللہ والدین، حضرت خواجہ منشی غلام حسین شہید، حضرت مولانا خواجہ سراج الدین شہید حضرت خواجہ خدا بخش صاحب علیہ الرحمت بھی شریک جہاد تھے۔ جن کا تذکرہ صاحب احوال و آثار نے بھی کیا ہے۔

"چوں لشکر سنگھاں بقلعہ ملتان بر لشکر نواب مظفر خاں حملہ کردند۔ حضرت خواجہ حافظ صاحب و حضرت خواجہ خدا بخش صاحب خیرپوری قدس سرہ العزیز بہ ہمت شمشیر بے نیام بدست خود گرفتہ بسیار سنگھاں را تہ تیغ در جہنم داصل کردندہ۔

رزمگاہ میں حضرت قبلہ حافظ صاحب و حضرت خواجہ صاحب بھی زخمی ہوگئے نتیجۃً سکھ ناکام ہوکر واپس لاہور کی جانب لوٹ گئے۔ حضرت قبلہ حافظ صاحب کا وصال ہوگیا۔

حضرت خواجہ صاحب ملتان سے خیرپور شریف میں نواب بہاول خاں مرحوم کے اصرار پر تشریف لے گئے سکھوں نے دوبارہ حملہ کرکے نواب صاحب کو شہید کردیا اور ملتان پر قابض ہوگئے۔

آپ کا وصال ۳۰ محرم الحرام ۱۲۵۰ھ میں ہوا۔ آپ کی تصانیف میں توحیدیہ، توفیقیہ، ذوقیہ جیسی اہم اور بلند پایہ کتابیں غیر مطبوعہ موجود ہیں۔

حضرت خواجہ غلام فرید صاحب چشتی نظامی علیہ الرحمۃ

آپ کی ولادت باسعادت چاچڑاں شریف ضلع رحیم یار خاں میں ہوئی۔ آپ نے تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد حضرت خواجہ خدا بخش صاحب کوٹ مٹھن سے حاصل کی آپ اپنے برادر مکرم حضرت خواجہ محمد کے مرید و خلیفہ تھے آپ عربی، فارسی، سرائیکی، سندھی زبان کے زبردست شاعر تھے۔ آپ نے سرائیکی زبان میں اکثر و بیشتر اپنا اظہار مدعا کیا۔

اس وقت برطانوی تسلط پوری طرح برصغیر پاک و ہند کو لپیٹ چکا تھا مسلمان حکمرانوں کی بساط

بالکل الٹ چکی تھی۔ علم دعمل کے سارے مرکز یا تو بالکل مٹ چکے تھے یا اگر کہیں تھے تو وہ محدود پیمانے پر تھے۔

حضرت خواجہ صاحب نے جب یہ دیکھا کہ انگریز ہمارے ملک کی عنان اقتدار کو سنبھال کر پوری طرح اپنے دام صیاد میں مبتلا کر چکا ہے تو آپ نے پوری قوم کو ایک پیغام حیات دیا۔ از سر نو لوگوں کے منجمد خون میں حرارت اور ولولہ انگیزی پیدا کی چنانچہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔

اپنی نگری آپ وس توں   پٹ انگریزی تھانے

یعنی اے میری قوم خواب غفلت سے بیدار ہو کر غلامی کی زنجیروں کو اپنی قوت سے توڑ کر ابلیسی سرشت سے بالکل آزاد ہو جا اور یہ نصرانی تھانوں کی بیخ و بن کو اکھاڑ کر سمندر سے پار پھینک دے کیونکہ یہ برطانوی حکمران غاصب ہیں جو غاصب ہو۔ اسے ہمارے ملک پر قبضہ کر کے حکمرانی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ایک اور مقام پر آپ نے یہ رباعی ارشاد فرمائی۔

بہار آئی کہ صیاد سے حکم فغاں دیوے   میرے ہاتھوں میں اب بہر خدا میری عناں دیوے
نہ گل نہ لالہ و ریحاں نہ قمری چاہتا ہوں میں   مگر رخصت مجھے اک بار طرف آشیاں دیوے

آپ کا وصال شریف بعمر دبیع الآخر ۱۳۱۷ھ میں ہوا۔ آپ کا مزار شریف کوٹ مٹھن ضلع ڈیرہ غازی خان پنجاب میں ہے۔

باقی صفحہ ۲۳ پر

جنگ آزادی کے چند دیگر سرفروش مجاہد سنی علماء کرام کا تذکرہ مختصراً درج ذیل ہے ان کے بارے میں تفصیلی مضمون آزادی نمبر حصہ دوم میں شائع کیا جائیگا۔ ہمہ تحدیث سند نمبر

۱۔ حضرت مولانا سید عبدالنبی شاہ صاحب قادری ملتانی   متوفی سنہ ۱۲۵۷ھ
۲۔ حضرت مولانا سلطان محمود صاحب شہید انصاری   " ۱۲۵۹ھ
۳۔ " " نور مصطفےٰ صاحب الملکی شہید ملتانی   " ۱۲۷۵ھ
۴۔ " " غلام محمد رسول صاحب انصاری شہید ملتانی   " ۱۲۷۵ھ
۵۔ " " قاضی محمد ملتانی قادری شہید   " ۱۲۷۴ھ
۶۔ " " سید عبدالقادر شاہ صاحب قادری ملتانی   " ۱۲۵۸ھ
۷۔ " " محمد شریف صاحب ملتانی   " ۱۲۵۸ھ

۸۔ 〃 〃 نور اللہ صاحب ملتانی شہید 〃 ۱۲۸۵ھ

۹۔ 〃 〃 فضل حسین صاحب بدایونی شہید 〃 ۱۲۵۸ھ

۱۰۔ 〃 〃 پیر علی صاحب تاذری شہید 〃 ۱۲۷۷ھ

۱۱۔ 〃 〃 محمد عمر صاحب شہید 〃 ۱۲۸۱ھ

۱۲۔ 〃 〃 قاضی جندوڈا صاحب شہید 〃 —

۱۳۔ 〃 〃 عبدالحق صاحب کانپوری شہید 〃 ۱۸۴۷ء

۱۴۔ 〃 〃 سید نوازش علی صاحب پانی پتی شہید 〃 ۱۲۷۲ھ

۱۵۔ 〃 〃 ملا محمد ابراہیم صاحب غازی شہید 〃 ۱۲۷ھ

۱۶۔ 〃 〃 اخوند عبدالغفور صاحب سوات 〃 ۱۲۹۵ھ

۱۷۔ 〃 〃 کمال الدین صاحب نقشبندی کوہاٹی 〃 ۱۸۷۷ء

۱۸۔ 〃 〃 محمد اسماعیل صاحب شہید مردانی 〃 ۱۳۲۴ھ

۱۹۔ 〃 〃 قاضی محمد عیسیٰ صاحب چشتی نظامی ملتانی شہید 〃 ۱۲۶۷ھ

۲۰۔ 〃 〃 شاہ غوث محمد صاحب بدایونی شہید 〃 ۱۲۵۵ھ

۲۱۔ 〃 〃 اخوند حافظ عبدالکریم صاحب شاہ جہاں آبادی 〃 ۱۲۹۶ھ

۲۲۔ 〃 〃 فضل احمد عرف جنن شاہ شہید 〃 —

۲۳۔ 〃 〃 غلام امام شہید 〃 ۱۲۹۳ھ

۲۴۔ 〃 〃 فیض احمد عثمانی بدایونی 〃 ۱۲۷۴ھ

مستقل خریداروں کے لئے

"جنگ آزادی نمبر، ۱۸۵۷ء" کے لئے خریداروں نے ہماری اپیل پر رجسٹری خرچ روانہ کیا تھا۔ چنانچہ شمارہ ہذا ہر خریدار کی خدمت میں بذریعہ رجسٹری روانہ کیا گیا ہے۔ تاہم بعض خریداروں کے ٹکٹ نہ آنے کی صورت میں ان کا پرچہ دفتر میں محفوظ ہے۔ وہ جب چاہیں ساٹھ پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر اپنا شمارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ٹکٹ کے ساتھ نام اور خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

جنگ کے بعد مسلمانوں کی حالت زار

(ایم نواب نفیس)

۱۸۵۷ء کی وہ جنگ جسے اہل ہندوستان جنگ آزادی اور انگریز "غدر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے نزدیک یہ جنگ اپنے حقوق کی بحالی کے لئے تھی۔ اپنی بقا و سلامتی کی مظہر تھی اور اپنی اس آزادی کی جد وجہد کے لئے تھی جو انگریزوں نے ان سے چھین لی تھی۔

یہاں یہ مرکوز خاطر رہے کہ نہ صرف آزادی ہی چھین لی تھی بلکہ ہندوستانیوں کو سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ یہی وہ عوامل تھے جن کی بحالی و تحفظ کی خاطر اہل ہندوستان انگریزوں کے خلاف کمربستہ ہوئے۔ اس پر مجھے ایک شعر یاد آتا ہے

بہر کار کہ ہمت بستہ گردد　　اگر خار بود گلدستہ گردد

آغاز جنگ کچھ اس طرح ہوا کہ بتاریخ ۲۳ جنوری ۱۸۵۷ء کی چھاؤنی رانی گنج میں آگ لگی یہ آگ کیا تھی گویا بھڑکتے ہوئے وہ جذبات، وہ ارمان تھے، وہ حسرتیں تھیں جن کی تکمیل شاید اب کوئی نہیں روک سکتا تھا

ع　　یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

چنانچہ اس کے بعد دوسار جنٹ میجر صاحب کا یہی حال ہوا تمام ٹھکانہ جل کر خاکستر ہوگیا۔ اور اسی طرح ۲۵ جنوری کو برقی تار کا دفتر واقع بارکپور میں زبردست آگ بھڑکی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بھی کام تمام ہوگیا۔ ان حقائق کے پیش نظر بادشاہ نادری نے اپنے غیض وغضب سے کام لیتے ہوئے مکمل تفتیش کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن شاید وہ اس بات سے غافل تھے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو

مڑ نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے　　پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

لیکن ولے نصیبا۔ ان گرگ صفت صحرائی درندوں نے مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ ان کے اتحاد کو منتشر کر دیا۔ ستم بالائے ستم ان کی مکاراور بے رحم عدالت میں مسلمان مفتوح اور ظالم فاتح کی حیثیت سے اکھڑے ہوئے۔ اس پر مسلمانوں سے نہ رہا گیا تو وہ فوراً مالک حقیقی کے دربار میں پکار اٹھے۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر　　برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

اس جنگ میں ہند و پاک کے جن علاقوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس کا بالتفصیل حال میں بیان کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ علاقے بے شمار ہیں۔ اس تنگی کے باعث درج ذیل میں صرف نام ــــ رقم کر رہا ہوں۔

روہتک، کلکتہ، انبالہ، لکھنؤ، شملہ، رڑکی، گوالیار، برہام پور، کوہ منصوری، ا دھولپور، کوہ مینی تال، ملتان، فیروزپور، روہنی، حصار، نوگانون، ڈلیسا، پشاور، دیناپور، کوہ مری، امرت سر، راولپنڈی، پونا، شکارپور، جلپیگوری، مراد آباد، لاہور، سہارنپور، فتح گڑھ، آگرہ، جہلم، نصیر آباد، کراچی مہدپور، سیالکوٹ، جونپور، جھانسی، شاہ جہانپور، سدورہ ضلع اودھ، بریلی شریف، الہ آباد، ہمیرپور، ساگر جالندھر، بلند شہر، سرسا، گوپی گنج، اندور، مئو، اعظم گڈھ، منگیر، بنارس، حیدرآباد (دکن) ناگ پور، جبلپور، فیض آباد، اوریا، کوہ آبو، سلطان پور اودھ، اورنگ آباد، مدراس، حیدرآباد (سندھ) وغیرہ

سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں میں ایک عجیب سی بزدلی پھیل گئی۔ وہ عمل سے بے گانہ ہوکر بے یار و مددگار پھرنے لگے۔ ان کے دلوں میں ایک مایوسی سی گھر کر گئی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہم ایک شکست خوردہ قوم ہیں انگریز فاتح ہیں اور ہر فاتح قوم کی زبان بھی حکومت کرتی ہے۔

ادھر انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنے ظلم و بربریت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ان کی سیاسی معاشی تعلیمی، اقتصادی حالت ختم کر کے رکھ دی۔ اس کا مختصر حال کچھ اس طرح کا ہے۔

سیاسی حالت

انگریزوں نے جنگ آزادی کے بعد اپنے اقتدار کو بہت ہی مضبوطی سے جمالیا اور مسلمانوں کو تخت و تاج سے محروم کر دیا۔ چنانچہ اس طرح مسلمانانِ ہندوستان سیاسی اعتبار سے بالکل ختم ہو کر رہ گئے۔

معاشی حالت

جنگ آزادی کے بعد جب امن بحال ہوا تو اقتدار تو چھن ہی چکا تھا۔ لیکن جب حالات کا اور جائزہ لیا گیا تو مسلمانوں کو پتہ چلا کہ ہم اور بھی کئی شعبوں میں پیچھے رہ گئے ہیں اور ہمارے ہم وطن یعنی ہندو ترقی کی شاہراہوں پر گامزن ہو چکے ہیں۔۔۔ انگریزوں نے انہیں عزت شہرت کے منصب پر فائز کر دیا ہے۔ اس کے برعکس ہم مکمل طور پر تباہ ہو چکے ہیں ہمارے لئے آئندہ بھی ترقی کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ تو مسلمانوں کے دلوں میں۔۔۔ انگریزوں کے لئے نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ چنانچہ مسلمانوں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے سر ولیم ہنٹر ———— نے اپنی کتاب انڈین مسلمانز ———— میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے" سنہ ۱۸۵۲ء سے سنہ ۱۸۶۸ء تک جن ہندوستانیوں کو وکالت کے لائسنس دیئے گئے ان میں ۲۳۹ ہندو تھے اور صرف ایک مسلمان"

اس انکشاف سے آپ کو اپنے آباؤ اجداد کی زبوں حالی کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

تعلیمی حالت زار

جنگ آزادی کے بعد مسلمان تعلیمی اعتبار سے بہت ہی مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ مسلمان جو اپنے دور اقتدار میں علم و فضل میں سب سے افضل

سمجھے جاتے تھے ہندوؤں کے مقابلہ میں ان کا تناسب بہت کم ہو گیا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس حقیقت سے لگا سکتے ہیں کہ ۱۸۷۰ء میں بمبئی، مدراس اور کلکتہ یونیورسٹیوں سے ۱۵ گریجویٹوں میں صرف ۰، مسلمان تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اس کے علاوہ مسلمان بعض دوسری وجوہات کی بنا پر بھی انگریزی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے سے گریز کرتے تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) درسگاہوں میں عربی اور فارسی کی تعلیم بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

(۲) مسلمان اساتذہ کی تعداد بہت قلیل تھی اور غیر مسلموں کی بہت زیادہ اس وجہ سے مسلمان اپنے بچوں کو غیر مسلم اساتذہ سے تعلیم دلانا معیوب سمجھتے تھے۔

(۳) مسلمان طلبہ کو جمعہ کی نماز ادا کرنے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔

غیر مسلم درسگاہیں دن بدن قائم ہو رہی تھیں اسی وجہ سے مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی کا جرم حکومتِ برطانیہ پر عائد ہوتا ہے۔

اقتصادی حالت

جنگ کے بعد مسلمان اقتصادی طور پر ـ بالکل تباہ ہو چکے تھے وہ بڑی مصیبت اور پریشانی میں اپنی زندگی بسر کر رہے تھے ان کی تمام جائدادیں چھین لی گئی تھیں سرکاری محکموں میں انہیں ملازمت ... نہیں ملتی تھی اور بے حیائی اس قدر غالب تھی کہ حکومت کی جانب سے یہ اعلان تھا کہ مسلمان ملازمتوں کے لئے درخواست دینے کے اہل نہیں۔

سر ولیم ہنٹر ـــــــــــــــ نے کلکتہ کے ایک اخبار کی شکایت کچھ اس طرح نقل کی ہے۔

"تمام ملازمتیں اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ مسلمانوں سے چھینی جا رہی ہیں اور دوسری قوموں بالخصوص ہندوؤں کو بخشی جا رہی ہیں۔"

غرض ہر میدان میں مسلمان زبوں حالی کے دور دورے سے گزر رہے تھے۔ مسلمان اساتذہ نکال دیئے گئے منکرین کا کہنا تھا کہ مسلمان بچے چیتھڑوں میں نظر آتے تھے۔ یہی وہ بال دیر کا جمود تھا جس کے خاتمے کے لئے ہمارا شاعر سپاہی بنکر ٹکرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ؎

دیکھ خونخوار درندوں کے وہ غول
میرے محبوب وطن کو یہ نگل جائیں گے
ان سے ٹکرانے بھی دے
جنگ آزادی میں کام آنے بھی دے

انگریز کے خادم

(تحریر میاں محمد شفیع)

جناب میاں محمد شفیع مرحوم سابق ڈپٹی کمشنر لاہور نے ۱۹۵۷ء میں ایک کتاب "۱۸۵۷ء" لکھی تھی ۔ جو اب نایاب ہے ۔ ذیل کا مضمون اسی کتاب سے ناشر کے شکریہ کے ساتھ نذرِ قارئین ہے ۔

یہ غرض کے بندے ، ملک کے بیری ، مذہب کے دشمن تین طرح کے تھے ۔ ایک تو وہ جو انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر آزادی خواہوں کو تباہ کرتے رہے یا اپنی فوجوں سے ان کی مدد کی جیسے ریاست ہائے جیند و نابھا اور سب سے زیادہ پٹیالہ ان کے ساتھ راجپوتانے کی چند ریاستیں ۔

دوسرے انگریزوں کے جاہل غریب شاگرد پیشہ جیسے بیرے ، خانسامے ، سقے ، دھوبی ، نائی ، فیل بان وغیرہ جنہوں نے حق نمک ادا کرنے میں ان سے رفاقت کی ..... جان بھی بچائی اور رسد بھی پہنچائی ۔ ان کا کچھ اتنا گلہ نہیں ۔ وہ کندۂ ناتراش ملک کی آزادی و بہبود کو کیا سمجھ سکتے تھے ۔ شکایت تو والیانِ ریاست سے زیادہ ہے ۔

تیسرے مخبروں کے زیادہ تر ہندو اور کمتر درجے کا مسلمان جو رسد رسانی میں مدد کرتے رہے ۔ حالانکہ

واقعات، انقلابیوں کی نقل و حرکت اور پروگرام، اندرونی اور بیرونی تجاویز کی اطلاعیں دیتے رہے۔ بعض نے روزنامچے بھی لکھے اور دم دم کی خبریں بھی پہنچائیں۔

ایسے لوگ ہر جگہ، ہر خطے میں موجود تھے۔ کہیں کم، کہیں زیادہ، سراغرسانی بھی کرتے تھے اور بھوکے مرتے آقاؤں کا پیٹ بھی بھرتے تھے۔ ان سب میں سے چند اہم لوگوں کے حالات درج ہیں۔

مرزا الٰہی بخش

یہ شاہی خاندان کا بوڑھا سمجھدار آدمی بادشاہ کا رشتے میں چچا اور سمدھی تھا۔ بہادر شاہ اس سے تمام معاملات میں مشورہ لیا کرتا تھا۔ اس ظالم کو ملک و مذہب سے تو کیا ہمدردی ہوتی، خاندان کی بہتری سے بھی بے بہرہ نکلا۔ انگریزوں کا پٹھو بن کر ٹمٹماتا دیا بھی بجھا دیا۔ ذرا ذرا سی خبریں پہنچائیں۔ زینت محل کو سبز باغ دکھا کر ہم رائے کر لیا۔ حکیم احسن اللہ خاں پر بھی ڈورے ڈالے اور انقلابیوں کو بدنام کرتا رہا۔ ہر معاملے میں انہیں غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی تاکہ اس کا انعام نہ مارا جائے۔

سب سے بڑا کارنامہ جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روکا۔ پھر اپنی موجودگی میں بادشاہ کو پکڑوا دیا اور شہزادوں کی گرفتاریوں کے وقت بھی پہنچ کر ان کو تسلیاں دیں اور ذبح کرا دیا۔ چالاک اتنا تھا کہ سب پر شبے کئے گئے اور گرفتاریاں ہوئیں اور شور مچے لیکن یہ ہر طرح محفوظ رہا نہایت چرب زبان اور سلجھا ہوا تھا۔ ایک اور ظلم اس نے یہ کیا تھا کہ خفیہ طور پر جمنا کا پل تڑوا دیا۔ جس کی وجہ سے انقلابیوں کی مشرقی رسد رسانی بند ہو گئی۔

انگریز نے بھی پیٹ بھر کے انعام دیئے۔ دربار میں پہلی کرسی مقرر ہوئی۔ ۲۲۸۳۰ روپے سالانہ پنشن دی جو نسل در نسل تھی۔ بیوی کی الگ، لڑکیوں اور لڑکوں کی الگ۔ عزیزوں کی ان کے علاوہ۔ بعد میں مختلف تقریبوں پر اضافے ہوتے رہے۔ یہ ننگ خلق مع اپنے خاندان کے درگاہ حضرت سلطان جی میں رہا۔ اور ۱۸۷۸ء میں مرا۔ اس قوم فروش کو سٹسے اور سانڈرس نے یوں جانچا ہے۔

"فاتحوں کی ادنیٰ خوشی کے لئے اگر ضرورت ہو تو وہ اپنے باپ کو پکڑوا دے"۔

ایسے نابکاروں کی سوانح عمری کیا۔ جب زندگی ہی سراسر لعنت ہے۔

مولوی سید رجب علی

یہ مولوی یا منشی، انگریز کا ارسطو جاہ، جسے علم ارسطو کی ہوا بھی نہ لگی تھی، جگراؤں ضلع لدھیانے کا رہنے والا تھا۔ دہلی کالج کا ذہین طالب علم، ملک و ملت کے درد سے بالکل بیگانہ تھا۔ حالات یوں ہیں کہ کالج سے نکل کر انبالے کے پولیٹیکل ایجنٹ کے یہاں کسی اچھی آسامی پر لگ گیا۔ پھر ریڈری مل گئی اور وہاں سے انیس صاحب کے ماتحت ۱۸۳۹ء میں لدھیانے پہنچا۔ بعد میں لارنس صاحب کے ساتھ لاہور آیا۔ چلتا ہوا صاحب قلم انسان تھا

خوب رسوخ پایا۔ ہربرٹ ایڈورڈ نے اس کے بارے میں رائے لکھی کہ رازداری میں یہ شخص بہت قابلِ اعتبار ہے۔ لاہور کے گارڈ کشتی کے بلوے ۱۸۴۶ء میں بہادری اور تدبیر کے بہت ثبوت دیئے ہیں۔

افغانستان کی جنگ میں پنجاب سے گزرنے کے لئے مولوی نے سکھوں سے اجازت دلوائی۔ غدر میں دفتر کوارٹر ماسٹر جنرل دہلی کا انچارج ہوا۔ اور محکمہ خفیہ میں بہترین خدمات انجام دیں جو ہڈسن کے ماتحت تھا۔ ان خدمات کے صلے میں انگریز نے اسے خوب نوازا۔ اور دو ہزار چھ سو چھیانوے روپے سالانہ کی جاگیر کے ساتھ ساتھ خان بہادر اور ارسطو جاہ کا خطاب دیا۔

وائسرائے کا میر منشی بھی رہا۔ بڑا کام کیا کہ دہلی کے بڑے قوم فروش الٰہی بخش وغیرہ کو اپنے ساتھ ملالیا۔ اور ایسے کام کرائے کہ رہتی دنیا تک دونوں کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ثبت رہے گا۔ عہدے، پنشن، خطاب، عزتیں، بلندیاں حاصل کرنے کے لئے ملک و ملت کا باغ اجاڑ گئے۔ ان سمجھ دار اور پڑھے لکھے تجربہ کاروں نے سارا زور اس بات پر لگایا کہ کسی طرح ملک ایک اجنبی قوم کے ہاتھ غلام بن جائے۔ ساری لیاقت اور عقل اسی بات پر صرف کردی۔

حکیم احسن اللہ خاں

بہت سمجھ دار، تعلیم یافتہ اور معاملات میں بصیرت رکھنے والا آدمی تھا۔ لیکن جس پر رجب علی اور الٰہی بخش کا جادو چلے، وہ غداری نہ کرے یہ کیونکر ہو سکتا تھا؟ افسوس تو یہ ہے کہ جس پر بادشاہ اور عوام کو پورا اعتماد ہو، عزت سے وقت گزار رہا ہو، ہر طرح کی دل جوئی بھی ہوتی ہو۔ وہ ملک و قوم اور اپنے ولی نعمت سے بے وفائی برتے۔

حکیم کا دامن صاف نہ تھا۔ ہنری گریٹ ہڈ اپنے ایک مراسلے میں لکھتا ہے۔

"مولوی رجب علی نے حکیم احسن اللہ خاں کو جو مراسلہ بھیجا تھا، وہ باغیوں کے ہاتھ پڑ گیا اور حکیم کو سخت نقصان پہنچا۔ گھر بھی جلا دیا گیا اور جان بھی بصد مشکل بچی۔"

اس سے آلودگی ظاہر ہو جاتی ہے۔ گو یہ بے چارہ بہت کھنچا۔۔۔ لیکن انگریزوں نے بھی داد نہ دی۔ بادشاہ کے خلاف گواہی دی۔ اس سے زیادہ اور کیا کرتا۔

نواب احمد علی خاں

منڈل خاندان کا نواب جس کی خدمات تعریف لارڈ کیننگ تک نے کیں۔ سالانہ پانچ سو روپے لگان کے ادا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے معاف کر دیا گیا اس لئے کہ اس نے غدر میں انگریز کی ایسی مخلصانہ مدد کی کہ ملکہ وکٹوریہ کا بیٹا بھی نہ کرتا۔

مولوی محمد علی

نگینہ ضلع بجنور کا رہنے والا اور انگریز کا مخبر اور خیر خواہ تھا۔ جب شہر کو فوجوں نے لوٹا تو اس کو کیمپ میں بلا کر محفوظ کر لیا گیا۔ اور گھر کی بھی حفاظت ہوئی۔

تاہم نگینے کی جنگ میں باغیوں نے لیفٹیننٹ کاسٹلنگ کو ٹھکانے لگا دیا جو بہادری کے بہت دعوے کرتا تھا۔

جیون لال

یہ مخبر تعلیم یافتہ، روزنامچہ لکھنے والا اورنگ زیب کے وزیر رگھوناتھ کی اولاد سے تھا۔ ڈاکٹر لونی اور مٹکاف کا وزیر رہا۔ پھر شاہی پنشنوں کا محاسب ہوا۔ جس کی وجہ سے دربار، خاندان اور روسا کے حالات اور انقلابیوں کی کوششوں کا سراغ لگاتا رہا۔ خود بھی دو ہندو چھوڑ رکھے تھے جو اسے سارے دن پھر پھرا کے خبریں بہم پہنچاتے تھے۔

اس پر کئی مرتبہ شبہ ہوا۔ اور باغی قتل کرنے کے لئے لپکے۔ لیکن قلعہ کے تعلقات نے ہر مرتبہ جان بچائی۔ اس کی خبریں انگریزی کیمپ میں باقاعدہ پہنچتی تھیں۔ غدر کے بعد آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر بنا دیا گیا اور جب مرا تو اپنے اخلاق کی وجہ سے سب کو غم دے گیا...... لیکن ملک و وطن اور دین و قوم سے غداری کا داغ ساتھ لے گیا۔

اودھ

لکھنؤ میں جب انگریز ریذیڈنسی کی دیواروں سے سرمار رہے تھے تو ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہوئی۔ اس لئے کہ ان کے شاگرد پیشہ ہر چیز مہیا کر دیتے تھے۔ اور خبریں بھی پہونچاتے تھے۔ جب انقلابیوں نے اس کی نقل و حرکت کی سخت نگرانی کر دی اور وہ خود باہر نہ نکل سکے تو البتہ ایک ہندو نے، جس کا ذکر گذر چکا ہے جاسوسی کا بڑی کامیابی سے فریضہ ادا کیا۔ ہیولاک وغیرہ کی آمد کی خبریں بہم پہونچائیں اور خود کسی کے ہاتھ نہ آیا۔

جب شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو دربار سجایا گیا اور جنہوں نے خدمات انجام دی تھیں، ان کو انعام و اکرام دیئے۔ ان انعام پانے والوں میں زیادہ تر وہ تھے جو غیر جانب دار رہے تھے یا تھوڑی بہت خدمات بھی کی تھیں۔ جیسے مہاراجہ بال کرشن، شرف الدولہ، غلام رضا، منصف الدولہ، سید باقر وغیرہ اور وہ بھی تھے جنہوں نے کارگزاریوں کی داستانیں سنائیں۔

شاہ محمود

ملتان کے مخدوم مرشد شاہ محمود نے بھی ملک و ملت سے آنکھ پھیر کر انگریز کی رضا جوئی کو خدا کی خوشنودی سمجھ کر مخبری بھی کی۔ آدمی، گھوڑے اور سپاہی دیئے اور کرنل ہملٹن کے ساتھ باغیوں سے لڑنے گئے۔ جب باغیوں نے دیکھا کہ روحانی پیشوا مقابلے پر ہے تو جی چھوڑ دیئے۔

اس کی خیر خواہی مخدوم پاک پٹن سے زیادہ مخلصانہ تھی۔ اس لئے کہ ادھر کے ہر مرحلے میں انگریزوں کے دوش بدوش رہا۔ فوجوں سے ہتھیار رکھوائے گئے۔ تب مع مریدوں کے موجود۔ پل کی حفاظت میں فوج بھیجی گئی تب موجود۔ پاک پٹن کے مخدوم خود شریک بغاوت نہ تھے لیکن ان کے مرید گوگیرا (منٹگمری) کی بغاوت میں سب سے پیش پیش تھے۔

اس کو تین ہزار روپے انعام نقد اور تیئس ہزار تین سو کے قریب جاگیری مالیت عنایت ہوئی۔

سرفراز خاں کھرل

اس کھرل رئیس نے انگریزوں پر بری طرح جان چھڑکی۔ پنجاب میں قدم رکھتے ہی ان پر قربان ہوگیا۔ ۱۸۴۱ء میں لیفٹنٹ برنس کو لاہور کے سفر میں خلوص سے امداد دی۔ سکھوں کی دوسری لڑائی میں، جو ۴۹-۱۸۴۸ء میں ہوئی، انگریزوں کی طرف سے لڑا۔ اور ریذیڈنٹ کے اشارے پر سکھوں سے قلعہ چھین لیا۔ جب غدر میں کھرل باغی ہو کر احمد خاں کے ساتھ ہوگئے تو وہ پھر بھی انگریز کی چاہ سینے میں لئے رہا اور مخبری کردی کہ فساد ہونے والا ہے۔ جس پر لاہور سے فوج بلوائی گئی۔ ان خدمات کے صلے میں اسے خان بہادر کا خطاب پانسو روپے کی خلعت اور پانسو بیگھے کی جاگیر دی۔ ان تمام غداروں کے حالات تذکرہ رؤسائے پنجاب سے لکھے جارہے ہیں۔

محمد حیات خاں

یہ پشاور کا پٹھان نکلسن کی سرپرستی میں پروان چڑھا اور جب نکلسن فوجیں لے کر دہلی کی طرف چلا تو اپنی ڈی کانگ بنالیا۔ اس نے انقلابیوں کو تباہ کرنے میں نہایت جاں فشانی سے خدمات انجام دیں۔ فتح کے بعد نکلسن زخم سے جاں بر نہ ہو کر مرگیا تو حیات خاں پشاور آگیا۔ اور تھانے دار مقرر ہوا۔ پھر تحصیل دار بنا کر جہلم بھیج دیا گیا۔ ہنوں کی بغاوت کو اسی نے فرو کیا اور اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا۔ سی ایس آئی کا خطاب ملا۔ ۱۸۹۰ء میں نواب کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۱ء میں مرگیا۔

ملک فتح خاں

یہ ملک صاحب خاں کا بھائی ۱۸۴۸ء میں ایڈورڈز کی فوجوں میں ملتان اور چنیوٹ کی لڑائیوں میں خدمت کرتا رہا۔ لیکن دہلی پہنچ کر باغیوں کی تباہی میں بہت ہی سر توڑ کوشش کی۔ انعام میں ۱۵۰ ایکڑ زمین ملی۔ ۱۸۹۴ء میں مرا۔

ملک شیر محمد خاں

پہلے دہلی میں دستے بھرتی کرکے پہنچائے۔ خود بھی لڑا اور لارڈ کیننگ کی ماتحتی میں اودھ کے معرکوں میں بہادری دکھائی۔ انعام میں خان بہادر کا خطاب، چھ ہزار روپے کی جاگیر علی الدوام اور بتیس سو چالیس کی پنشن تاحین حیات پائی۔ اس کی ایک لاکھ تیرہ ہزار ایکڑ زمین تھل اور خوشاب میں تھی اور جہلم میں پندرہ سو ایکڑ ٹھیکے پر بھی لے لی۔ یہ دنیا طلب ۱۸۹۰ء میں مرا۔

ملک صاحب خاں ٹوانہ

مئی ۱۸۵۷ء میں تین سو سواروں کا ایک دستہ بھرتی کرکے جہلم میں پلٹن نمبر ۱۴ کے باغیوں سے لڑا۔ پھر ظالم کوپر کے ساتھ مل کر نمبر ۲۶ کے باغیوں سے چال بازی کی اور ان کو گرفتار کرایا۔ اور اجنالے کا کنواں آزادی خواہوں کی سرد لاشوں سے پاٹنے میں اس کا ہاتھ تھا۔ اس کے بعد مختلف علاقوں میں بہت کارگزاریاں کیں۔ تانتیا کے مقابلے میں کالپی کا میدان انقلابیوں کے خون سے رنگین کیا اور وہاں سے جنرل نیپیر کے ساتھ وسطی ہند کے جھگڑے نمٹائے۔

پنجاب میں واپس آکر خان بہادری کا خطاب، چار سو اسی روپے کی پنشن اور بارہ سو روپے سالانہ کی جاگیر ملی۔ اپنی محنت وجستجو سے بہت سی زمین حاصل کر کے دریائے جہلم سے نہر کھدوائی۔ گھوڑوں کی نسل کو قابل رشک ترقی دی۔ خاندانی جھگڑوں سے الگ تھلگ رہا۔ عزت پائی اور اے۔سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔ اور آخر میں تمام جائیداد ملا کر ایک اچھی خاصی ریاست ہو گئی اور صرف تدبیر سے شاہ پور کا نہیں بلکہ پنجاب کا ایک رئیس اعظم بن گیا۔ بالسے محبان وطن اور جاں نثاران دین و ملت کے خون کی بہا ہی کہاں جا سکتی ہے۔؟

صادق محمد خاں یہ ملتان کا رہنے والا غدر کے وقت لاہور میں تھا۔ چھٹ سو سوار بھرتی کر کے انگریزوں کے قدموں میں جا گرا۔ گوگیرا کے باغیوں کی مہم پر گیا اور آخر وقت تک وہاں رہا۔ پھر ملتان میں انکم ٹیکس آفیسر مقرر ہوا۔ خدمات کے انعام میں لطف آباد کوٹ ملک میں تا حین حیات جاگیر اور بہاول پور میں ایک کنواں بھی پایا کل جائیداد ۲۹۲ روپے کی تھی۔ تحصیل دار بھی رہا۔ ۱۸۶۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔

مراد خاں گردیزی خاندان کے بزرگوں میں سے ہے۔ غدر میں جو خدمات کیں۔ ان کے بدلے میں ایک سند اور دو سو روپے کا ایک خلعت ملا۔ ۱۸۶۵ء میں ریاست بہاولپور کا ایجنٹ پھر پولیٹیکل ایجنٹ اور نائب سپرنٹنڈنٹ ہوا۔ پنجن واہ اور فورڈ واہ کی نہریں اس کی کارگزاری میں بنیں۔ سات ہزار روپے انعام ملا۔ چیف ججی بھی مل گئی۔ جس کی تنخواہ انعام میں ایک ہزار روپے تک بڑھا دی گئی۔ ۱۸۷۶ء میں مر گیا۔

غلام قادر خاں غلام قادر خاں قادیان کے زمینداروں میں سے تھا۔ اس کے والد نے غدر میں بہت خدمت کی۔ بھرتی دی اور خود غلام قادر نکلسن کی اس فوج میں شریک تھا۔ جس نے سیالکوٹ کے آزادی خواہوں کو تباہ کیا۔ نکلسن نے اس خدمت پر ایک سند دی اور لکھ دیا کہ یہ لوگ گورنمنٹ کے سب سے زیادہ نمک حلال ہیں۔

بڈھا خاں یہ بھی بندۂ زماں بروار انگریزوں کا جاں نثار بڑے خانہ میں رہا اور سرکار میں اتنا رسوخ حاصل کیا کہ جب ہتھیار رکھے گئے تو پھر بھی چالیس تلواریں بلا لائسنس رکھنے کی اجازت ملی اور موضوع کھڈوال کی جاگیر پانچ سو روپے کی اور پانچ سو کا خلعت حاصل کیا اور آخر کار ۱۸۶۶ء میں وہاں کے روبکار کے لئے چلا گیا۔

مظفر خاں یہ شخص کالا باغ کا رہنے والا نہایت مخلصانہ وفاداری کے ساتھ اپنے بیٹے یار محمد خان کو ساتھ لے کر اور سو آدمی بھرتی کر کے ایڈورڈز کی خدمت میں حاضر ہو کر کورنش بجا

لایا اور تن دہی سے خدمت انجام دی۔ دوسرا بھائی مسٹر کارکس کے ساتھ بنوں گیا اور بندوبست کی مہم میں مدد دی۔

شیر خاں

مری میں جب دیسی پلٹن بگڑی تو اس کے تباہ کرنے میں اس نے بڑی ہی جانفشانی دکھائی۔ لیکن غیور باغیوں نے اتنی دلیری سے مقابلہ کیا کہ شیر خاں اور اس کے سفید فام آقاؤں کو پتہ چل گیا کہ آزادی کے متوالے کیوں کر لڑا کرتے ہیں۔ یہ پھر گرفتار شدہ باغیوں کو لے کر ملتان گیا اور تمام خدمات کے بدلے سات سو پچاس روپے کی معافی حاصل کی اور پانسو روپے کا خلعت پایا۔ ہتھیار رکھنے کی بھی اجازت مل گئی۔

ملک جہان خان

غدر میں اس بہادر نے پہلے تو حبیب خاں کے ساتھ مل کر جہلم اور اجنالے کے آزادی خواہوں کو تباہ کیا، پھر کالپی میں تانتیا کے مقابلے میں اچھی خدمات کیں۔ داناڈے کی لڑائی میں، جو وسط ہند میں ہوئی، پانچ چھ انقلابیوں پر اکیلا جا پڑا۔ لیکن زخمی ہو کر مغلوب ہو گیا۔ بعد ازاں اٹھارویں بنگالی رسالے کا رسالدار اور لارڈ نیپیر کا ایڈی کانگ ہوا اور اپنی بہادری اور جنگی قابلیت پر سردار بہادر کا خطاب پایا۔

تفضل حسین خاں

ان تمام فوددستوں کے حالات "تذکرہ روسائے پنجاب جلد اوّل و دوم" میں ملتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا سچائی پیش کی جائے ناگپور کی بغاوت بڑی دانائی سے ہتھیار چھین کر فرو کی گئی۔ اس کارگزاری میں تفضل حسین خاں کا بڑا حصہ تھا۔ اس لئے اسے رسالداری اور سردار بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۸۷۰ء میں کپتانی کے ساتھ فرخ نگر، ریواڑی اور گوڑگانواں میں ساٹھ ہزار کی جاگیر ملی۔

فتح خاں

یہ سردار سکھوں کی لڑائیوں میں بھی انگریزوں کا وفادار رہا تھا۔ اور چھ سو روپے سالانہ کی پنشن اور ہزار روپے کا خلعت پایا۔ غدر کی خدمت میں مجسٹریٹ اور فوجداری و دیوانی کے اختیارات ملے اور کالا چٹا پہاڑ لیوں میں تیرہ ہزار ایکڑ رقبہ گھوڑوں کی چراگاہ کے لئے مل گیا۔ پھر ۱۸۸۹ء میں خان بہادری کا بھی خطاب پایا

علی رضا خاں قزلباش

اس نے غدر میں دہلی کے قریب ایک رسالہ بھرتی کیا اور جائیداد بیچ کر خرچ بھرا۔ اس میں اس کے۔۔۔۔ بھتیجے عبداللہ خاں، محمد حسن خاں، محمد زماں خاں، غلام حسین خاں اور شیر محمد خاں بھی تھے۔ اس فوج نے لکھنؤ کی نمایاں خدمات انجام دیں اور بہت شجاعت دکھائی۔ محمد رضا خاں اس کا بھائی بہت دلیر تھا۔ مالوے اور شمس آباد میں دو مرتبہ زخمی ہوا اور دو گھوڑے مرے۔ سخت معرکوں میں بے محابا گھس جاتا تھا۔ اس لئے آرڈر آف میرٹ حاصل کیا۔

سردار بہادری کا خطاب اور دو سو روپے پنشن علی الدوام ملی۔ علی رضا خان کو بھڑائچ اور اودھ میں تعلقداری ملی۔ خان بہادری کا خطاب پایا اور تمام بھائیوں کو خان بہادری کے خطاب ملے۔ ۱۸۶۴ء میں علی رضا خان کو نوابی کی عزت ملی۔ اس کے بڑے بیٹے نوازش علی خان کو مختلف اعزاز بخشے گئے اور باپ کے بعد نوابی کا خطاب ملا۔ دوسرے بیٹے ناصر علی خان کو بعد میں اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا۔

نوازش علی خان نے خدمتِ خلق سے بڑی عزت پائی اور لاہور کا سب سے بڑا آدمی ہوا بلکہ پنجاب کے چوٹی کے رئیسوں میں شمار ہونے لگا۔ سی۔ آئی۔ ای۔ کا خطاب بھی پایا۔ بعد میں چھوٹا بھائی ناصر علی خان نواب ہوا۔ اور عزت سے کارگزاری دکھا کر ۱۸۹۶ء میں مرا۔ فتح علی خان نے اس کی جگہ لی۔ جو بھتیجا تھا۔ یہ نواب بھی اطاعت و فرمانبرداری سے انگریز کے نزدیک سربلند و باوقار رہا۔

انگریزوں پر جو مصائب کابل کی پہلی جنگ میں گزرے تھے۔ ان میں علی رضا خان نے ایسی سچی وفاداری و غمخواری دکھائی تھی کہ لندن تک کے انگریز شکر گزار ہوئے۔ یہ سب کچھ تھا۔ انسانیت و ہمدردی اور خدمتِ خلق کا جذبہ رکھتے تھے۔ لیکن اس وقت تو ملک کی آزادی کا ذکر ہے۔ اگر وہ ہندوستانی ہو گئے تھے، تو ہندوستان کو اجنبی طاقت کے ہاتھ بیچنے کے بجائے خود مختاری کی راہ پر ڈالنے میں جاں نثاری کرتے۔ پھر ہم کیا، سارا جہاں ان کی قصیدہ خوانی کرتا۔ جیسے مولوی احمد اللہ شاہ شہید۔ بخت خان اور خان بہادر خان اور دیگر رہنماؤں کی ہو رہی ہے۔

دہاڑا سنگھ کھرل قوم نے اپنے سردار احمد خان کے ماتحت بغاوت کی تو دہاڑا سنگھ نے اس دشمن سے بدلہ لینے کے لئے میجر مارسڈن سے جا ملا اور اسی کی روایت ہے کہ احمد خان اس کی گولی سے مارا گیا۔ سے تین سو روپے سالانہ منصب ملا۔ گاش کوڑی اور دان مہر سنگھ کے گاؤں جاگیر میں عطا ہوئے۔

دلیوا سنگھ پنجاب پر انگریز کا تسلط ہوا۔ یہاں سے فوجیں بھی بھرتی ہونے لگیں تو دیوا سنگھ کو ملٹری پولیس کا افسر منتخب کیا گیا۔ غدر میں امرتسر کی اہم بغاوت میں جب ہندوستانی رجمنٹ سے ہتھیار چھینے گئے تو ان پلٹنوں کی اس نے نگرانی بھی کی اور اپنی جمعیت سے حکومت کے قیام و انتظام میں بھی جان لڑائی۔ دہلی کے لئے بھی فوج بھرتی کی۔ اجنالے کے کنوئیں کو آزادی خواہوں کی لاش سے پاٹنے کا کام بھی اسی کے ہاتھوں ہوا۔ پھر کیوں کر سی۔ ایس۔ آئی اور سردار بہادر نہ بنتا۔ بارہ سو روپے سالانہ کا وظیفہ اس پر مزید تھا۔

لچھمن سنگھ یہ دستہ فوج کے ساتھ ڈینٹن پراین کی ماتحتی میں دہلی گیا اور ایسی جانبازی اور جاں نثاری دکھائی کہ افسر کے نزدیک بے مثل شجاع قرار پایا۔ خوف اس کے پاس نہ تھا ہر خطرے

میں گھر کر خوش ہوتا تھا۔ اور اسے آرڈر آف میرٹ ملا۔ رسالدار میجر ہوا۔ چار ہزار آٹھ سو روپے سالانہ تنخواہ تھی۔ اس کے علاوہ ضلع جہلم و ضلع گجرات میں ایک سو چھبیس کی معافی بھی ملی۔

جواہر سنگھ یہ غدر کی اٹھارہ لڑائیوں میں شریک رہا۔ لکھنؤ، بٹھور، کانپور اور کالپی کی لڑائیوں میں ایسی جرأت دکھائیں کہ انگریز لوہا مان گیا اور میدان ہی میں آرڈر آف برٹش انڈیا کا تمغہ حاصل کیا۔ ۱۸۶۲ء میں گوجرانوالے کا آنریری مجسٹریٹ ہوا۔ اور ۱۸۷۰ء میں مر کر اس عہدے کو آقاؤں کے حوالے کر گیا۔ پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسی بہادریاں سکھوں نے صرف انگریز کی طاقت اور ہنر کے ماتحت دکھائیں۔

راجہ صاحب دیال اس نے غدر میں صلاح مشورے اور کارگزاری سے انگریز کی بڑی خدمت کی۔ ایک ہزار کا خلعت اور ۱۸۶۰ء میں دو ہزار کی جاگیر علی الدوام حاصل کی۔ مجلس وضع آئین و قوانین کا ممبر بنا جو ایک قابل رشک عہدہ تھا۔ اور کلکتے کے اجلاس میں شرکت کر کے سی، ایس، آئی کے خطاب سے سربلند ہوا۔ اور بمقام امرتسر ۱۸۸۰ء میں مر گیا۔ ساری قابلیت ملک کو غلام بنانے میں صرف کر دی اور دنیا کے لئے دھرم کو تیاگ دیا۔

نہال سنگھ جب گوگیرا کے قبائل بگڑے تو یہ سرداروں انگریزوں سے مل کر نہایت خلوص کے ساتھ ان کے خلاف لڑا۔ غدر میں خبریں بھی دیں۔ فوج میں بھرتی بھی کی اور ان پرانے سکھ سپاہیوں کو بھی کھینچ لایا جنہوں نے پنجاب کی جنگوں میں انگریز سے لڑ کر داد شجاعت دی تھی۔ اس صلے میں اسے دس ہزار روپے نقد اور چھ ہزار کی جاگیر عطا ہوئی۔

نندھ سنگھ، مکھن سنگھ غدر ہوتے ہی یہ دونوں بھائی انگریز کی خدمت کے لئے بے چین ہو گئے۔ مری کی بغاوت میں جان لڑا دی۔ نند سنگھ نے مخبری کا کام بھی بڑی لیاقت سے کیا۔ راولپنڈی سے لے کر پھلواڑ تک چھ دنوں میں جاسوسی اتنی احتیاط سے کی کہ ایک حرف بھی خلاف نہ نکلا۔ بدلے میں موضوع لیر لوٹ، موضوع کٹاریاں، ۳۰ روپے کی پنشن سے سرفراز ہوا۔ بھائی کو بھی ۲۰ روپے کی پنشن نصیب ہوئی۔ انہوں نے مقامی حکام کو ہر طرح کی صحیح خبریں بھی بہم پہنچائیں اور فوجی بھرتی سے بھی مدد کی۔

شہزادہ نادر خاں کابل والا شاہ شجاع جولدھیانے میں نظر بند اور گورنمنٹ سے پنشن پاتا تھا۔ پھر وہ پنشن اس کے بیٹے شاہ پور کو ملی۔ اڑتالیس ہزار روپے سالانہ۔ اس کے بعد یہ شہزادہ نادر خاں وارث ہوا۔ اور انگریز نے عزتیں بخشیں۔ کمیٹی کا پریذیڈنٹ اور آنریری مجسٹریٹ اور خاص درباری تھا۔

غدر میں اس نے انگریز کی بے حد مدد کر کے حق نمک ادا کیا۔ شاہ پور میں ۴ ہزار ایکڑ زمین ملی۔ اور ۱۸۸۸ء میں سی۔ آئی۔ ای کا خطاب بھی پایا۔ بہر صورت ان لوگوں کو ہندوستان سے کیا ہمدردی تھی کہ وہ آزادی کی قدر کر کے اجنبی حکومت سے نفرت کرتے۔

جے سنگھ اس سکھ نے ملک سے منہ پھیر کر ساری لیاقت و شجاعت انگریز کے حوالے کر دی۔ آخر میں سوار پولیس کی چوتھی رجمنٹ کا میدان بنایا گیا۔ آرڈر آف برٹش اور آرڈر آف برٹش انڈیا کی عزت لی۔ بھڑائچ میں ۲۶ گاؤں کی جاگیر ملی۔ جنرل جان واٹسن اس کے بارے میں لکھتا ہے۔

" وہ سب سے قابل اور عمدہ ترین افسروں میں ہے۔ مجھے ایسے آدمی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا جو اس سے زیادہ دیانت دار اور کھرا ہو۔ غدر کی تمام لڑائیوں میں دہلی سے لکھنؤ تک میرا دست راست رہا ہے۔" ہوپ گرانٹ اور سر کولن نے بھی اس کو سراہا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں مرا۔

پنجاب سنگھ دہلی کے محاصرے میں رہا۔ بلند شہر، علی گڑھ کی لڑائیوں میں تھا۔ آگرے کانپور کے معرکوں میں داد شجاعت دی۔ لکھنؤ میں کارنامے کئے۔ اس کو بھی آرڈر آف میرٹ اور آرڈر آف برٹش انڈیا کے اعزاز ملے۔ اودھ کے ضلع کھیری میں چار ہزار روپے سالانہ کی، پنجاب میں رکھ سوکر چک، ترن تارن، ضلع امرتسر میں سات سو ایکڑ اجارہ اور بے اجارہ اراضیات عنایت ہوئیں۔ ہوپ گرانٹ کہتا ہے۔ " وہ بہادر نادر اولعزم سپاہی ہر معاوضے کا مستحق ہے۔"

صورت سنگھ اس نے پہلے سرکشی اور بغاوت کی تھی۔ اور جلا وطن کر کے بنارس بھیج دیا گیا تھا۔ لیکن غدر شروع ہوتے ہی انگریز کی غلامی کا پٹہ گلے میں ڈال لیا جب راجپوتوں نے بنارس پر حملہ کیا تو صورت سنگھ ہی سے ان سے اُلجھا۔ اور ران پر زخم کھا کر لنگڑا ہو گیا۔ انگریز نے صلے میں اڑتالیس سو کی پنشن اور ڈہری ضلع گورکھپور میں بڑی جاگیر عطا فرمائی۔ پھر پنجاب آنے کی بھی اجازت دے دی۔

مان سنگھ ایک حصہ رسالے کا جو اس نے خود بھرتی کی۔ اور باقی اور دو حصوں کو لے کر ہڈسن کی مدد کے لئے دہلی گیا۔ دہلی میں اس نے ہڈسن کو بادشاہ اور شہزادوں کی گرفتاری میں مدد دی اور قتل میں شریک رہا۔ پھانسیاں بھی دیں۔ پھر لکھنؤ اور دوسرے علاقوں میں بھی لڑتا رہا۔ جب اس نے مسٹر ٹبلر کو نرغے میں سے نکالا تو دو زخم بھی کھائے اور گھوڑا زخموں سے چور ہو گیا۔ اودھ کی لڑائیوں میں شریک رہا۔ نند گنج میں توپیں چھینیں۔ انعام میں آرڈر آف میرٹ اودھ کی چھ سو

کی اور پنجاب میں چار سو روپے سالانہ کی جاگیر ملی۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سے ہزاروں لوگ ایسے تھے۔ بشری پرشاد، کینہ معمولی سا نوکر ڈپٹی کلکٹر بنا۔ غزنی خان نے ہزاروں مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ چھجو لال نے مخبری سے بہت سے فائدے اٹھائے معین الدین حسن خاں نے روزنامچہ بھی لکھا۔ اور خبریں بھی پہنچائیں۔ پنجابی سوداگروں میں سے گامی خان بدمعاش نے کتنے گھر تباہ کرائے اور خود بھی نہ بچا۔

بقیہ حوالہ جات سنی مشائخ

۱؎ جناب محمد علی صاحب صدیقی گوالیاری۔ تاریخ گوالیار ص ۲۵۷ مطبوعہ شمس المطابع مراد آباد۔

۲؎ مولانا فضل علی خاں دہلوی "تذکرہ مشائخ دہلی" ص ۱۶۵ مطبوعہ افضل المطابع دہلی۔

۳؎ عبداللطیف۔ "۱۸۵۷ء کا روزنامچہ" ص ۸۹-۸۸ فارسی۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔

۴؎ مولانا فضل علی خاں دہلوی "تذکرہ مشائخ دہلی" ص ۱۶۷ مطبوعہ افضل المطابع۔ دہلی۔

۵؎ حضرت سید شاہ قمر الدین حسین عظیم آبادی۔ "حضرت شاہ محمد قاسم داناپوری" ص ۲۴۲ " " "

۶؎ مفتی انتظام اللہ شہابی "علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں ص ۸۲ مطبوعہ دینی بکڈپو دہلی۔

۷؎ سلیم احمد خاں کھرل "تاریخ جھنگ" قلمی مخطوطہ۔ مملوکہ اسد نظامی۔ ص ۵۱۷۔

۸؎ " " " " " " " " ص ۵۱۸۔

۹؎ " " " " " " " " " "

۱۰؎ حضرت مولانا حافظ محمد نجم الدین صاحب "مناقب المحبوبین شریف" ص ۱۲۴۔ مطبوعہ لاہور۔

۱۱؎ حضرت علامہ عبدالعزیز صاحب "گلزار جمالیہ شریف" قلمی ص ۱۷ مملوکہ اسد نظامی۔

۱۲؎ حضرت مولانا عبدالغفور صاحب انصاری القریشی "ملفوظات حسینہ" قلمی ص ۱۴ مملوکہ اسد نظامی

۱۳؎ دیباچہ دیوان حسن فارسی ص ۴ مطبوعہ ملتان شریف۔

۱۴؎ تاریخ محبوب الاذکار۔

۱۵؎ تاریخ محبوب الابرار۔

۱۶؎ نواب مرزا بیگ صاحب دہلوی "تحفۃ الابرار جدول ثالث ص ۵۲ مطبوعہ رضوی دہلی شریف۔

۱۷؎ احوال و آثار قلمی۔ ص ۱۷ مولفہ حضرت مولانا عبدالمجید صاحب خیرپوری علیہ الرحمۃ

۱۸؎ جناب صدیق طاہر صاحب سہ ماہی الزبیر بہاولپور جنگ آزادی نمبر ص ۴۴۳۔

محمد صادق قصوری

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مجاہدین کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں پر جو خوفناک مظالم توڑے اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ذیل میں تراشے کے عنوان سے ان بھیانک اور انسانیت سوز مظالم کی چند جھلکیاں بشکریہ" العلم "کراچی "جنگ آزادی نمبر" و "مشہور تاریخی واقعات" مطبوعہ لاہور پیش کی جارہی ہیں جس سے فرنگی سامراج کی بربریت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

• شریف صورت اور ذرا چلے پوش ہونا غضب تھا " ایں ہمہ بچۂ شتر است" کہہ کر اسے دار پر کھنچوا دیا جاتا تھا۔ مٹکاف کوتوالی کے باہر کرسی بچھائے بیٹھا رہتا تھا اور ڈھنڈوا ڈھنڈوا کر ایسے مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا۔ روزانہ سلیم شاہی جوتیوں کے انبار لگ جاتے تھے۔

(ملا واحدی دہلوی)

● امرتسر کے ڈپٹی کمشنر کوپر نے باغیوں کو گرفتار کروایا۔ انہیں تھانے میں لے جایا گیا۔ اور ایک کمرے میں ٹھونس دیا گیا۔ پہرے داروں میں کئی مسلمان بھی شامل تھے۔ کوپر کو خیال گزرا کہ شاید وہ ہم مذہب ہونے کے باعث قیدیوں سے رعایت برتیں اس لئے انہیں عیدالاضحیٰ منانے امرتسر بھیج دیا۔ تھانے کے قریب ایک اندھا کنواں تھا۔ دس دس قیدیوں کو بلانے کر باہر لایا جاتا اور باڑھ ماردی جاتی اور لاشوں کو کنوئیں میں پھینک دیا جاتا۔ اس طرح ۲۳۷ باغی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ باقی قیدی کمرے سے باہر نہیں نکلتے۔ جب دروازہ کھول کر دیکھا گیا تو ۴۵۔ افراد خوف۔ حبس اور گھٹن کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر چکے تھے۔ ان کی لاشیں بھی کنوئیں میں پھینک دی گئیں اور اوپر سے مٹی ڈال دی گئی۔ پنجاب کے گورنر لارنس نے کوپر کی اس سفاکی اور بربریت کی بڑی توصیف وستائش کی (ایڈورڈ ٹامس۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کا دوسرا رخ) ●

● لوگوں کو عبرت ناک سبق دینے کے لئے نجیب آباد میں انہیں مظالم کا اعادہ کیا گیا جو بقیہ ہندوستان پر توڑے جارہے تھے۔ ۱۹ اپریل ۱۸۵۷ء کو (ضیاء الملک جنرل) محمود خاں کے چھوٹے بھائی جلال الدین خان اور سعد اللہ خاں کو نور پور میں پھانسی دی گئی اور ان کا دیوان خانہ بارود سے اڑا دیا گیا۔ نگینہ کے باغوں میں چھپے ہوئے لوگوں کو انگریزی فوج نے قتل کیا۔ قاضی محلہ کے سب آدمی مارے گئے۔ دھام پور کی سڑک پر جس قدر لوگ ہاتھیوں پر سوار ملے سب کو قتل کیا گیا۔ خاص باغی دیہات بنا دیئے گئے تھے کہ وہ بالکل غارت کر دیئے جائیں اور ان میں تمام باغیوں کے سر لٹکائے جائیں۔ ● (حالات سرکشی بجنور از سرسید)

● جنرل نکلسن نے ایک خط میں لکھا: ہمیں ایسا قانون بنانا چاہیئے جس کے ذریعے ہم ۔۔۔ چمڑہ ادھیڑ سکیں اور زندہ جلا سکیں۔ محض پھانسی دینے سے ہمارا جذبۂ انتقام سرد نہیں پڑ سکتا ●

❝ جالنس کی رائے تھی کہ موت کی سزا طرح طرح کی تکلیفیں دے کر دی جائے۔ مثلاً مجرم کی کھال اتار دی جائے۔ زندہ جلا یا جائے۔ پھانسی آسان موت ہے۔ جو مسلمان تندرست اور وجیہہ تھے۔ انھیں پکڑ کر کوتوالی پہنچایا گیا۔ بہت کم ایسے مسلمان تھے جو سپاہیانہ شان نہ رکھتے ہوں اور پھانسی سے بچے ہوں۔ پشاور سے لیکر شرق و شمالی ہند تک شاید ہی کوئی مالدار، مولوی نمازی مسلمان ہوگا جو نہ پکڑا گیا ہو۔ دس برس تک برابر ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامتِ صغرا برپا رہی۔ ایک محکمہ گواہوں کی دار و گیر کیلئے بھی تیار رہا۔ جس کو چاہا حبس دوام کر دیا۔ بہت سے مجرموں کو اکڑوں بٹھا دیا جاتا اور شکلیں کسی ہوتیں۔ تختہ پر مجرم کو چڑھا کر گلے میں پھندے کو ڈال دیا جاتا اور نیچے گرا دیا جاتا۔ ❞ (عروج عہد انگلشیہ از مولوی ذکاء اللّٰہ)

❝ ہلسن نے سوہنری کاٹن کو ایک واقعہ سنایا کہ ایک شام قیدیوں کو دیکھنے میں حوالات گیا وہاں بیسیوں مسلمان قیدی زمین پر بندھے پڑے تھے اُن جسموں کو گرم تانبے سے داغا گیا تھا۔ وہ اذیت اور کرب سے کراہ رہے تھے۔ مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور میں نے انھیں جان کنی کے اس عذاب سے نجات دلانے کے لئے گولی سے ہلاک کر دیا۔ ❞ (۱۸۵۷ء کا دوسرا رخ ایڈورڈ ٹامس)

❝ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ملنے پر انگریزی گماشتے بقایا مالگذاری وصول کرنے دیہات میں جاتے تو بے پناہ مظالم توڑتے۔ جس کاشتکار پر روپیہ واجب ہوتا اس کو ٹکٹکی پر باندھ کر کوڑے لگاتے۔ جب وہ خون میں لہو لہان دم توڑنے کے قریب ہوتا تو اس کا بوڑھا باپ فریاد کرتا تو مضروب بیٹے کو کھول کر بوڑھے باپ کو باندھ دیتے اور اس کے کوڑے لگاتے اس پر عورتیں روتی پیٹتی آتیں تو بانس چیر کر ان کی چھاتیوں کو پھنسا دیا جاتا ❞
(مقدمہ وارن ہسٹنگز۔ تقریر ایڈمنڈ برک)

۱۷۹۶ء میں جزیرہ انڈیمان اپنی ھولناک اور جانکاہ آب وہوا کی وجہ سے اجڑ چکا تھا۔ مجاھد علماءِ ہند کی بدولت پھر آباد ہوا۔ ان جزائر کی آب وہوا سم قاتل تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے جاکر دیکھا کہ اس غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسیوں راجے مہاراجے اور نواب زمین دار، مولوی۔ مفتی۔ قاضی۔ ڈپٹی کلکٹر منصف، صدر امین، رسالدار صوبیدار اور جمعدار وغیرہ قیدہیں جو گھوڑے اور چھاروں کی طرح موٹا جھوٹا کھانا کھاتے ہیں۔ عام لوگوں کے ساتھ محنت مشقت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور انتہائی شرمناک سزا نوشتۂ تقدیر کی تھی ہم جب پہنچے ہزاروں مرد وں عورت قیدیوں کو دیکھا کہ ماتھا کھود کو پیشانی پران کا نام اور جرم اور لفظ دائم الحبس لکھا ہوا ہے کہ وہ قتل نوشتۂ تقدیر کے تمام ختم نہیں ہوتا۔ (کالا پانی از مولوی جعفر تھانیسری)

جب ہزاروں مسلمان مارے گئے تو ان کی لاوارث بیویاں، کنواری اور بیاہی لڑکیاں، بہنیں، مائیں بے سہارا رہ گئیں۔ ان میں سے بہت سی عورتوں نے انگریزی فوج کے مسلمانوں سے شادیاں کرلیں اور بعض نے بد چلنی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ بہادر شاہ کی ایک بیٹی ربیعہ بیگم نے روٹیوں سے محتاج ہونے کے سبب دھلی کے مشہور باورچی سے شادی کرلی۔ بہادر شاہ کی ایک دوسری بیٹی فاطمہ سلطان پادریوں کے زنانہ سکول میں معلمی کا پیشہ کرنے لگی۔ اگر کوئی شخص ایک خیری روٹی یا ایک مٹھی چنے یا کوڑیاں تقسیم کرتا تھا تو مسلمان عورتوں کے غول کے غول جمع ہوجاتے تھے۔ یہ وہی عورتیں تھیں جو سال دو سال پہلے خود ہزاروں روپے خیرات اپنے گھروں میں بیٹھ کر کرتی تھیں۔

(خواجہ حسن نظامی)

" ان لوگوں کو رسی سے باندھا گیا اور دریا کی ریت میں قطار بناکر کھڑا کیا ان مقتولین میں ہندوستان کے دو تین سورج بھی تھے۔ ایک مولانا صہبائی (امام بخش صہبائی) جنکی فارسی دانی تمام ہندوستان میں مسلم تھی۔ اور دوسرے محمد امیر عرف پنجہ کش جنکی خوش نویسی کا لوہا ہندوستان مانتا تھا اور ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حروف سونے چاندی کے عوض خریدے جاتے تھے " (ایک مورخ)

" ہماری فوج کے شہر میں داخل ہوتے ہی تمام وہ لوگ جو گلی بازاروں میں چلتے پھرتے نظر آئے فوراً سنگینوں سے چھید دیئے گئے۔ ایک گھر میں چالیس پچاس ایسے آدمی ہمارے خوف سے پناہ گیر تھے جو ہماری معافی کا یقین رکھتے تھے لیکن ان کو بھی فوراً سنگینوں سے ذبح کردیا گیا۔ "

(ایڈورڈ ٹامس)

" اب ہم شہر میں نہیں جاتے۔ اس لیئے کہ کل ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھا، جس سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ یہ کہ راستہ میں ہم نے چودہ عورتوں کی لعشوں کو شالوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا، جن کے سر ان کے شوہروں نے خود کاٹے تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ غیرت مند شوہروں نے خود ان کے گلے کاٹے تھے تاکہ انگریز سپاہی ان کی عصمت دری نہ کریں اور خود بھی خنجر مار کر ان کے پاس گر گئے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک طرف ان کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں "

(ٹامس)

آئندہ اگست ستمبر کے مشترکہ شمارے میں تحریک آزادی میں علماء اہلسنت کی خدمات پر تحقیقی مضمون، اسلامی افسانہ "مقدس خاتون" کی نئی قسط، حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی آف میراں شریف کی سوانح و دیگر کئی دلچسپ علمی مضامین ملاحظہ فرمائیں!

جنگِ آزادی کے اسباب

مشتاق احمد علوی

انگریز کی مکاریت مشہور ہے۔ اس نے تجارت کے بہانے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی اور پھر یہاں باقاعدہ طور پر اپنے مذہب کا پرچار شروع کر دیا۔ بعض پس ماندہ علاقوں میں غریب عوام کو لالچ دے کر انھیں مذہب سے برگشتہ کرنا شروع کر دیا اور اس طرح وہ اپنے قدم برصغیر میں روز بروز مضبوط کرنے لگے۔ اہلِ ہندوستان نئی تہذیب کو فوری طور پر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مگر انگریز نے جلد بازی سے کام لے کر مغربی تہذیب ان پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔ اس سے عوام کے جذبات بھڑک اٹھے۔

اس جنگ کو انگریز مورخین نے غدر (MUTINY) کا نام دیا ہے اور بعض نے اسے فوجی بلوہ (SE.P OY MUTINY) کے نام سے یاد کیا ہے۔

۱:۔ سر جان لارنس نے ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ کو فوجی بغاوت کا نام دیا ہے۔

۲:۔ برطانوی جرنیل سر جیمز آؤٹرم کے الفاظ کچھ یوں ہیں۔

"IT WAS A MOHAMMADAN CONSPIRACY MAKING CAPITAL OF HINDU GRIENANCES IT WAS HEATENCD BY THE CATRIDGE OFFAIR BEFORE IT WAS FULLY RIPE"

(دراصل یہ مسلمانوں کی سازشں تھی۔ یہ لوگ ہندوؤں کی شکایات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے تاکہ لوگوں کو بھڑکائیں۔ لیکن میرٹھ کی فوج کارتوسوں کے قضیئے سے یکایک بھڑک اٹھی اور سازش کا مواد پکنے سے قبل ہی پھٹ گیا)

۱۳۔ تیسرا نظریہ، یہ ہے کہ یہ برصغیر کی پہلی ناکام جنگ آزادی تھی۔ پاک و ہند کے اکثر مورخین کا خیال یہی ہے۔

اگر تاریخ پاک و ہند کے آئینے پر غور سے نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں اس جنگ کی مندرجہ ذیل وجوہات نظر آئیں گی جو مختصراً اس طرح ہو سکتی ہیں۔

معاشرتی وجوہات

مغربی تہذیب اور مشرقی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انگریز نے بڑی سرعت سے اپنی تہذیب برصغیر میں عام کرنی شروع کر دی۔ غیرت مند عوام اس سے بہت متنفر تھے۔ علماء نے خدشہ ظاہر کیا کہ انگریز اپنی تہذیب برصغیر کے عوام پر ٹھونس کر ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیں گے لہٰذا یہ بات انھوں نے عوام کے دلوں تک پہنچائی مسلمان قوم اگرچہ سو سکتی ہے مگر اس کا ضمیر مردہ نہیں ہو سکتا اپنی تہذیب کا جنازہ اٹھتے دیکھ کر عوام تڑپ اٹھے۔ اور کھلم کھلا انگریز سے نفرت کا اظہار کرنے لگے۔ پنجاب اور دیسی ریاستوں کے علاوہ باقی ہندوستان میں فوجی طاقتیں عوام کے ساتھ تھیں۔ پنجاب میں چند بک جانے والے لوگ تھے جنھوں نے انگریزوں سے وفاداری کا ثبوت دیا۔ اس کے باوجود عوام متحد ہو کر اپنی پرانی روایات کو محفوظ رکھنے کے لئے یکجا ہو کر دشمن کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

مذہبی وجوہات

انگریز نے کھلم کھلا عیسائی مبلغین کو تبلیغ کے لئے برصغیر کے طول و عرض میں بھیجا جو عوام کو نئے مذہب کی ترغیب دلاتے اور انھیں ہر صورت میں عیسائیت کی طرف لانے کی کوشش کرتے۔ ہندو لوگ سمندری سفر کو بہت بڑا پاپ خیال کرتے تھے۔ مگر فوجیوں کے لئے سمندری سفر لازم تھا۔ ادھر لارڈ ڈلہوزی نے والیان ریاست کو متبنیٰ بنانے کی اجازت منسوخ کر دی ہندوؤں کے نزدیک متبنیٰ بنانے کا طریقہ مذہب کا خاص جز وتھا۔ ان حالات نے ہندوؤں کے دل میں بھی انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا کر دی اور اس طرح ان کی نفرت جنگ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

سیاسی وجہ

مغل شہنشاہ بہادر شاہ کی اولاد کو خدشہ تھا کہ بہادر شاہ کے بعد انھیں شاہی محلات سے

نکلنا پڑے گا۔ یہ سیاسی وجہ تھی جس کی وجہ سے بہادر شاہ کے خاندان میں انگریز کی نفرت اور دشمنی روز افزوں بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر جنگ کے موقع پر انھوں نے فوجیوں کا ساتھ دیا اور انگریز کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔

معاشی وجوہات

برصغیر کے عوام پر انگریز نے بڑی بڑی ملازمتوں کا دائرہ تنگ کر دیا۔ بند و بست اراضی کی بدولت بڑی بڑی جاگیریں ختم کر دی گئیں۔ دیسی ریاستوں کے الحاق سے مقامی فوج توڑ دی گئی۔ اس طرح لوگ قلاش ہو گئے اور بے روزگاری نے عوام میں سخت بے چینی اور حکومت کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔

فوجی وجوہات

برطانوی حکومت نے انگریز فوجیوں کو جنگیں لڑنے کی خاطر ایران اور چین میں بھیج دیا تھا اب برصغیر ہند میں زیادہ تعداد دیسی فوج کی تھی۔ جنھیں انگریزی کمانڈر بہت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہندوستانی سپاہیوں کی ترقی کے راستے مسدود تھے۔ ان کی تنخواہ کم اور ناکافی تھی۔ انگریز جرنیل اور کمانڈر فرعون خصلت تھے اور معمولی سی بات پر انھیں گالیاں دیتے اور سزائیں سناتے اس چیز نے ہندوستانیوں کے دل میں انگریز کے خلاف نفرت کی آگ اور بھڑکا دی۔ اور ہندوستان میں انگریزی فوج کی حیرت انگیز کمی دیکھ کر انھوں نے بغاوت کا آغاز کیا۔

فوری وجہ

۱۸۵۷ء کے شروع میں سپاہیوں کو بندوق میں استعمال کرنے کے لئے ایسے کارتوس مہیا کئے گئے جنھیں دانتوں سے کترنا پڑتا تھا اور یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ان کارتوسوں پر گائے اور سور کی چربی لگائی گئی ہے اس چیز نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے جذبات کو ابھارا۔ لہذا مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی میں پچاس دیسی سپاہیوں نے یہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ سارے واقعات جب ملے تو جنگ کی صورت میں رونما ہوئے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی علم وفضل کے بحرِ بیکراں

(میاں عبدالرشید)

علامہ فضل حق خیرآبادی نابغۂ روزگار تھے۔ غالب جیسے لوگ ان سے استفادہ کرتے تھے۔ غالب کا حسب ذیل شعر مشہور ہے ؎

ہمچیاں در تتق غیب ثبوتے دارند
بوجودیکے ندارند نہ خارج اعیاں

حالی لکھتے ہیں کہ مرزا غالب نے خود انھیں بتایا تھا کہ پہلے انھوں نے اس شعر میں لفظ "ثبوتے" کی بجائے نمودے لکھا تھا۔ لیکن علامہ فضل حق خیرآبادی کو یہ شعر سنایا تو انھوں نے فرمایا کہ اعیان ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے۔ اس کی جگہ ثبوت کر دو۔

غالب ایک جگہ علامہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را
بہ سخن پرورش تواند کردا"

علامہ ہی نے غالب کو مشکل گوئی سے منع کیا۔ اور مرزا کا موجودہ دیوان آپ ہی کا رہین منت ہے۔ دونوں کا سال ولادت بھی (۱۷۹۷) ایک ہے۔ سرسید نے بھی آپ کی انتہائی صلاحیتوں کی جا بجا تعریف کی ہے۔ اس دور کے جملہ اہل قلم آپ کی قابلیت کے معترف تھے اور آپ کی مجلس میں بیٹھنا باعث فخر سمجھتے تھے۔

آپ نے سند حدیث حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی سے حاصل کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے سامنے بھی زانوئے ادب تہ کیا۔ اپنے عربی اشعار انھیں کو دکھاتے تھے۔ شاہ غوث علی قلندر کا بیان ہے

کہ علامہ فضل حق نے اوائل عمر میں عرب کے مشہور شاعر امرؤالقیس کے ایک ۔۔۔۔۔قصیدے کی طرز پر عربی میں ایک قصیدہ لکھا۔ حضرت شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں علامہ نے اپنے شعر کے حق میں متقدمین کے بیس اشعار پڑھ دیئے۔ ان کے والد مرحوم بھی اسوقت وہاں موجود تھے۔ وہ فرمانے لگے "بس ادب چاہیئے"۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا "برخوردار تم سچ کہتے ہو مجھے سہو ہوا۔

روایت ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنی مشہور کتاب "تحفہ اثنا عشری" تحریر فرمائی تو ایران سے ایک متبحر عالم و مجتہد اونٹوں پر کتب فریقین لاد کر شاہ صاحب سے مناظرے کے لئے دہلی پہنچے۔ شاہ صاحب نے فرائض میزبانی عطا فرمائے قیام کے لئے مناسب جگہ تجویز کر کے رخت سفر کھلوایا۔ شام کو علامہ فضل حق جو ابھی صغر سن تھے۔ مجتہد صاحب کی خدمت میں پہنچے باتوں باتوں میں ایک مشہور کتاب افق المبین پر بحث چل نکلی علامہ نے ایسی مدلل تقریر کی کہ مجتہد صاحب کو جان چھڑانا مشکل ہوگیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد ہیں تو وہ بغیر مباحثہ کئے راتوں رات دہلی سے واپس چل دیئے کہ جب خانقاہ کے بچوں کے علم و فضل کا یہ عالم ہے تو خود شیخ خانقاہ کا کتنا بلند مرتبہ ہوگا۔ شاہ صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے قابل شاگرد کو اس پر ڈانٹا اور نہ خوشی کا اظہار کیا۔

علامہ نے آنکھ کھولی تو گردوپیش علم و فضل، اور امارت و ریاست کو جلوہ گر دیکھا۔ پڑھنے کے لئے جاتے تو ہاتھی پر سوار ہو کر جاتے والد ماجد کے انتقال کے بعد آپ کی عمر اٹھائیس برس تھی اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دلی میں انگریزوں کی طرف سے ریذیڈنٹ مقرر تھا۔ آپ پہلے پہل اس کے محکمہ میں سررشتہ دار ہوئے۔ یہاں سے استعفا دیکر والی جھجر کی ملازمت اختیار کرلی۔ ولی عہد سلطنت مرزا ابوظفر بہادر نے رخصت کرتے وقت کہا کہ "لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے"۔ ایک عرصہ تک جھجر رہنے کے بعد مہاراجہ الور نے بلالیا۔ دو سال وہاں رہے۔ پھر وہاں سے رام پور چلے گئے جہاں کے نواب نے ان سے تلمذ اختیار کیا آٹھ برس کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں صدر الصدور مقرر ہوئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا اور بعد میں اسی جرم کی بنا پر انگریزوں نے عمر قید کی سزا دیکر جزائر انڈیمان بھیج دیا۔ آخری ایام وہاں بطور قیدی نہایت تنگی اور عسرت میں گزرے۔ آپ کے صاحبزادے نے انگلستان تک مقدمہ لڑا جب رہائی کا پروانہ لے کر انڈیمان پہنچے تو سامنے سے جنازہ آتا ملا۔

علامہ مرحوم نے انڈیمان سے ایک کتاب "باغی ہندوستان" اور دو قصیدے کسی نہ کسی

طرح کوئلے وغیرہ سے لکھ کر بھجوائے۔ عقیدت مندوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی قلمی نقلیں اپنے پاس رکھیں۔ یہ تینوں چیزیں عربی زبان میں ہیں۔ آپ نے اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات اور اسباب بیان کئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی سیاسی نظر کس قدر گہری تھی اور آپ کا حریت پسندوں کے ساتھ کس قدر تعلق تھا۔ کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں۔

"میری یہ کتاب ایک دل شکستہ، نقصان رسیدہ، حسرت کشیدہ اور مصیبت زدہ انسان کی کتاب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جسے قید کر کے ہر ممکن مصیبت پہنچائی گئی۔ اس کا قصور صرف ایمان اور اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ اس ۔ ۔ ۔ حادثۂ فاجعہ (انقلاب ۱۸۵۷ء) کی وجہ سے ہوا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس سے غموں کے بادلوں سے کڑکتی ہوئی بجلیاں مصیبت زدگان وطن پر گریں اور ان پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محتاجی و ناداری مسلط کر دی گئی۔"

"یہ داستانِ الم اس طرح ہے کہ (برطانوی) نصاریٰ نے تمام باشندگان ہند کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی (تاکہ) سب انہی کی طرح ملحد و بے دین ہو کر ایک ملت پر جمع ہو جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے بعد علامہ نے برطانوی حکومت کی معاشی پالیسی کو جس طرح سے بے نقاب کیا ہے اس سے ان کی بلند نظری اور دقیقہ رسی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

(انگریزوں نے) دوسری ترکیب یہ سوچی یہاں کے مختلف طبقوں پر اس طرح قابو حاصل کیا جائے کہ غلہ کی ساری پیداوار نقد دام ادا کر کے لے لی جائے۔ کسی کو غلہ کی پیداوار کی خرید و فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے اس طرح بھاؤ کے گھٹ جانے بڑھ جانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے یا نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ تاکہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں میں آگرے اور خوراک نہ ملنے پر ان کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔"

ابو ظفر بہادر شاہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"سچ پوچھیئے تو وہ آمر و حاکم ہونے کی بجائے اپنی شریک حیات (زینت محل) اور وزیر (حکیم احسن اللہ) کا کارپرداز اور ان کی محبت میں مگن تھا

۔ ۔ ۔ ۔ بارث ضعیف الرائے تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کرسکتا تھا نہ بھلا برا سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔"

"اس نے اپنی عاقبت نااندیش، سفیہ، خائن اور بزدل اولاد کو امیر لشکر بنایا۔ (مرزا مغل اور خضر سلطان وغیرہما کی طرف اشارہ ہے) یہ لوگ دیانت دار عقلمندوں سے متنفر تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انھوں نے بازاری لوگوں کو اپنا ہمنشین وہم جلیس بنالیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ لوگوں سے لشکروں کے ساز و سامان کے بہانے جمع کرتے۔ اور اس میں سے ایک پیسہ بھی کسی لشکری پر خرچ نہ کرتے۔ ۔ ۔ ۔ انہیں زنانِ فاحشہ نے لشکروں کے ساتھ سفر کرنے سے روک دیا۔ ۔ ۔ ۔ وہ رات سوکر اور دن بدمست ہوکر گزارتے اور جب بیدار و ہشیار ہوتے تو غافل و حیران پھرتے۔

" نصاریٰ جب لڑتے لڑتے تھک گئے تو ہندوؤں سے مدد اور معاونت کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے کثیر لشکر اور ساز و سامانِ حرب سے تھوڑی سی مدت میں ان کی پے درپے مدد کی۔ تب نصاریٰ نے سخت لڑائی ٹھان لی۔

چار مہینے تک متواتر جنگ ہوتی رہی۔ مگر دشمن کثیر لاؤ لشکر اور ساز و سامان کے باوجود شہر میں داخل نہ ہوسکا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر مجاہدین کی ایک مختصر سی جماعت رہ گئی جو بھوک پیاس برداشت کرکے رات گزارتی اور صبح ہوتے ہی مت بلہ پر ڈٹ جاتی۔ ۔ ۔ ۔ بدقسمتی سے ایک شب محاذ پر بزدل اور کسل مند جماعت مقرر کردی گئی جو ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سوگئی۔ دشمن نے موقع غنیمت سمجھ کر شب خوں مارا اور ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کرکے انھیں موت کی نیند سلادیا۔

جب نصاریٰ نے اس محاذ پر قبضہ کرلیا تو بہت سی توپیں اور منجنیقیں شہر کے قریب نصب کردیں اور دن رات گولیوں کا مینہہ برسانا شروع کردیا۔ جس سے شہر پناہ کا پھاٹک گرپڑا اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب بنیوں اور دوسرے ہندوؤں نے جو نصاریٰ کے دوست

تھے اپنا غلہ چھپالیا اور باہر سے آنے والے غلہ کی آمد روک دی گئی۔ نتیجہ
یہ ہوا کہ لشکری اور شہری بھوک سے پریشان ہو کر شہر سے بھاگ گئے اور دشمن
نے شہر پناہ قلعہ، بازار اور مکانوں پر قبضہ جمالیا"
اس کے بعد لکھنؤ کی جنگ کا حال بیان کیا ہے جو واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل نے انگریزوں
کے خلاف لڑی تھی۔ وہاں کے سب اعیان سلطنت کو نا اہل، سست، بزدل، احمق، خائن ٹھہرایا
ہے۔ ان میں سے اکثر ذلیل اور بعض بندگانِ زر تھے۔ وزیر ممو خاں اور راجہ بلدیو سنگھ کی غداری کا
بھی ذکر ہے۔
انگریزوں کی فتح کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے جو عام معافی کا اعلان کیا گیا تھا اس کا یوں
ذکر ہے:۔

"میں غربت و اضطراب کی زندگی گزار رہا تھا کہ امن و امان کا پروانہ نظر پڑا
مجھے بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین کی قسم پر اعتماد
کسی حالت میں درست نہیں ہے خصوصاً جب وہ جزا و سزائے آخرت کا قائل
بھی نہ ہو۔۔۔۔ انھوں نے عہد و پیمان توڑ کر ہزاروں بندگان خدا کو پھانسی
قتل، جلاوطنی اور قید و حبس میں ڈال دیا۔

جزائر انڈیمان کے حالات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"ترش رو دشمن نے مجھے دریائے شور کے کنارے ناموافق آب و ہوا
والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر رہتا ہے اس کی نسیم صبح گرم و تیز ہوا سے
زیادہ سخت ہے اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی ہے۔ اس کا پانی سانپوں
کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں ہے۔ اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا ہے
اس کی زمین آبلے دار ہے۔ اس کی ہوا ذلت و خواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی ہے"۔

آخر میں لکھتے ہیں:۔

"ظاہر اسباب پر نظر کر کے اپنی نجات سے مایوس ہوں اور اپنی امیدوں
کو منقطع پاتا ہوں۔ لیکن اپنے رب عزیز رحیم اور رؤف و کریم کی رحمت سے
ناامید نہیں۔ وہی جابر فرعونوں سے عاجز و کمزوروں کو نجات دلاتا ہے
وہی زخمی مظلوموں کے زخموں کو اپنے رحم و کرم کے مرہم سے بھرتا ہے وہ

ہر سرکش کے لئے جبار و قہار، ہر ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنے والا ہر بیمار و محتاج کو مشکل سے نجات دینے والا اور ہر دشوار کام کو آسان بنانے والا ہے۔

"میں بھی مظلوم و دل شکستہ و مضطر و مسکین و ذلیل و محتاج ہو کر اسی خدائے برتر کو پکارتا ہوں۔ اور اس کے حبیب پاک کو وسیلہ بنا کر اسکی رحمت کا امیدوار ہو کر اس کی بارگاہ میں بصد تضرع التجا کرتا ہوں . . . وہی مجھے تکلیف سے نجات دے گا وہی قلق و اضطراب سے آزاد کرے گا۔ وہی امراض سے شفا بخشے گا۔ وہی ظالم سے چھڑائے گا . . .

اے احکم الحاکمین! تو ہی ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لینے والا ہے . . . . ."

علامہ نے برطانوی حکومت کی معاشی پالیسی کو جس طرح بے نقاب کیا ہے اس سے ان کی بلندی نظری کا پتہ چلتا ہے۔

★★★★

صدرالصدور دہلی

مفتی محمد صدرالدین آزردہ

:- شاہ محمد چشتی :-

ولادت

مفتی محمد صدرالدین خاں رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء کو دھلی میں ہوئی ۔ والد کا اسم گرامی شیخ لطف اللہ تھا ۔ آباؤ اجداد کا وطن کشمیر تھا ۔ "چراغ" مادۂ تاریخ ولادت ہے شمس الشعرا ظہورالدین ظہور نے لکھا ہے ؂

چراغش ہست تاریخِ ولادت[1]

تعلیم و تربیت

آپ نے ہوش سنبھالا تو ماحول نہایت سازگار تھا ۔ علوم دینیہ کے لئے دہلی رشکِ دوراں کی حیثیت رکھتی تھی ۔ علوم عقلیہ میں سلسلۂ خیرآباد کے مشہور معلم مولانا فضل امام رحمۃ اللہ علیہ ممتاز تھے تو علوم نقلیہ میں مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ مایہ ناز استاد شمار ہوتے تھے ۔ یہ دونوں صدر سے اپنی اپنی کارکردگی میں شہرۂ آفاق تھے ۔ چنانچہ آپ نے علوم عقلیہ کی تحصیل مولانا فضل امام خیرآبادی سے کی اور علوم نقلیہ کے لئے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں زانوئے تلمذ طے کیا ۔ آپ مولانا فضل حق خیرآبادی ابن مولانا فضل امام کے ہم سبق رہے اور علامہ سے عمر میں آٹھ سال بڑے تھے ۔[2]

یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں احباب ہم سبق، ہم مکتب، ہم عہدہ تھے۔ دونوں بلند پایہ مدرس تھے۔ خوش نویس تھے اور شاعر بھی تھے۔ دونوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا، دونوں کو اس جرم کی پاداش میں سزا ملی اور دونوں نے ہر اعتبار سے تاریخ میں خوب نام پیدا کیا۔

وقار

آپ کا حلقۂ احباب نہایت وسیع تھا۔ اور ہر ایک کی نظر میں آپ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ تمام علوم میں صاحب کمال ہونے کی وجہ سے آپ کے ہاں احباب کا جمگھٹا رہتا تھا اور محفلیں خوب جمتی تھیں۔ ہر فن کے لوگ آپ کی محفل میں شریک ہوتے تھے۔ مولانا فقیر محمد جہلمی جو آپ کے تلمیذ رشید تھے لکھتے ہیں:

> "بجز شاہِ دہلی کے تمام اعیان و اکابر اور علماء و فضلاء خاص دہلی اور اس کے نواح کے، آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے......: طلباء تو واسطے تحصیل علم اور اہل دنیا واسطے مشورتِ معاملات اور منشی (انشاء پرداز) بغرض اصلاح انشا اور شعراء واسطے مشاعرے کے آتے تھے۔ اس اخیر دور میں ایسا فاضل بایں جمعیت و قوتِ حافظہ وحسنِ تحریر و متانتِ تقریر اور فصاحتِ بیان اور بلاغتِ معانی کے صاحب مروت و اخلاق اور احسان دیکھا نہیں گیا"[۲۵]

یہ شاندار محفلیں مفتی صاحب کے علاوہ علامہ فضل حق خیر آبادی، غالب اور حکیم مومن خاں مومن کے ہاں بھی ہوتی تھیں۔ نادم سیتا پوری لکھتے ہیں:

> "انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کی ادبی فضا جن عناصر اربعہ سے ترتیب پا رہی تھی وہ یہی چار ہستیاں تھیں، مولانا خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، مرزا غالب اور حکیم مومن۔ مٹیا محل کی حویلی صدر الصدور اس دور کی سب سے بڑی علمی و ادبی درسگاہ تھی۔ جہاں دہلی بھر کے اہل

کمال جمع ہوا کرتے تھے ۔[۳]

ان مجالس کے شرکاء یہ لوگ ہوتے تھے :

شعراء میں غالب، صہبائی، مومن، آزردہ، احسان، نیر، نثار، شیفتہ، ضمیر ممنون، نصیر ۔ علماء میں مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی عبدالخالق، مولوی محبوب علی مولوی نصیرالدین شافعی، مولوی کریم اللہ، مولوی نورالحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک علی، مفتی سید رحمت علی خاں، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، مولوی محمد رستم علی خاں وغیرہم ان کے علاوہ دیگر مختلف فنون کے ماہرین بھی شرکت کرتے تھے ۔[۴]

ان مجالس میں شمولیت کرنے والے ایک صاحب نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مفتی صاحب کو ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں ۔

"فاضلوں میں افضل، عالموں میں اعلیٰ، گرانمایہ بلیغوں کے قائد، عالی مقام فصیحوں کے پیشوا، چھوٹے اور بڑے اوصاف حمیدہ سے متصف ۔ . . . ان کی تمام تر کوشش مخلوق کی حاجت روائی میں صرف ہوتی ہے ۔ ان کے الطاف کی برکت ہر خاص و عام پر محیط ہے ۔ . . . . . میرے نزدیک انکی صحبت کے بغیر جو دن گزر جائے وہ ایام عمر میں شمار نہیں ہوتا ۔"[۵]

سر سید مفتی صاحب کی مدح سرائی سے پہلے اس شعر سے مضمون کی ابتدا کرتے ہیں ؂

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست[۶]

نیز مولانا شاہ عبدالعزیز نے بھی اپنے ایک فارسی خط میں آپ کو دہلی کے فضلائے نامدار میں شمار کیا ہے ۔[۷]

یہ تمام تر کمالات آپ کو اپنے مہربان اساتذہ مولانا فضل امام اور شاہ عبدالعزیز وغیرہما سے ورثے میں ملے تھے ۔ مولانا فضل امام کی علمی ثقاہت پر طعن کرنے والے احباب کو مفتی صاحب کی لیاقت بے پایاں سے ان کے استاد کی لیاقت کے بارے میں اندازہ لگانے میں آخر کون سی دشواری پیش آتی ہے ۔؟

ملازمت

مفتی صاحب برٹش حکومت کے عہد میں تقریباً ۳۵ سال تک ممتاز عہدوں پر فائز رہے پہلے مفتی مقرر ہوئے پھر جب مولانا فضل امام خیرآبادی نے عہدۂ صدر الصدور سے علیحدگی اختیار کی تو آپ صدر الصدور بنائے گئے۔ اور اس منصب پر ۲۵ سال تک رہے۔ یہ کوئی معمولی عہدہ نہ تھا۔ ان دنوں مفتی صاحب چار سو روپے ماہوار لیتے تھے۔[۱۰]

اتنی طویل مدت تک بلند ترین عہدے پر فائز رہنا اور وہ بھی غیر مسلم حکومت میں، آپ کی دیانت کا کھلا ثبوت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مفتی صاحب کرسی عدالت پر بیٹھ کر کسی قریب ترین دوست کو بھی، بشرطیکہ جرم ثابت ہو، معاف نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ غالب جیسا ہم نشین جب ایک مقدمے میں ملوث ہو کر مفتی صاحب کے سامنے پیش ہوتا ہے تو مفتی صاحب اسے بھی معاف نہیں فرماتے، اس کے خلاف ڈگری دیتے ہیں۔ لیکن غالب کا بار اپنے ذمہ لیتے ہوئے رقم اپنی گرہ سے ادا کر دیتے ہیں۔

عابد علی عابد لکھتے ہیں :۔

> "نتیجہ یہ نکلا کہ دعویٰ کا روپیہ مفتی صاحب نے اپنی جیب سے ادا کر دیا۔[۱۱]

تقویٰ

مفتی صاحب اعلیٰ درجے کے فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ قدر متقی، پرہیزگار اور صوفی منش بھی تھے۔ آپ کے تورع سے متعلق ایک واقعہ ملاحظہ ہو، مولوی گل حسن صاحب قادری، شاہ غوث علی قلندر کے ملفوظات میں لکھتے ہیں :

> "ایک روز مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور سبحان شاہ صاحب کے پاس تشریف لائے، مفتی صاحب کی عادت تھی کہ ہر وقت تسبیح پر نفی اثبات کا ورد رکھتے تھے۔"[۱۲]

مولانا شاہ غوث علی قلندر مفتی صاحب کے استاد تھے اور خود صوفی منش تھے اتنے قریبی تعلق کی وجہ سے شاہ غوث علی صاحب کا بیان شاہدِ عدل کی حیثیت رکھتا ہے

جسے ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ مزید برآں مفتی صاحب کے اساتذہ نے (جو خود عامل لوگ تھے اور صالح بھی) ان کی تربیت میں کیا کسر اٹھا رکھی ہوگی۔؟

نیز مولانا فقیر محمد جہلمی لکھتے ہیں:

"مولانا موصوف دہلی میں واپس تشریف لے جاکر
چندے بستی حضرت نظام الدین اولیاء اور پھر اپنی حویلی
خاص واقع دہلی میں خانہ نشین ہوئے اور اپنی حیات
کے باقی ایام کو وظائف وعبادات اور تدریسی علوم
دینیہ میں بسر کیا۔" [۱۳]

اب یہ دونوں سرخیاں (ملازمت، تقویٰ) پیش نظر رکھئے اور بلا تبصرہ یہ عبارت پڑھ کر خود ہی نظر انصاف سے فیصلہ کیجئے، عقدہ کشائی ممکن نظر آتی ہے۔

"میاں رشید! تم ہی اچھے ہو کہ تارکِ دنیا ہو گئے،
ہماری نوکری جائز نہیں تھی اور ہم خوب سمجھتے تھے کہ جائز
نہیں مگر بزورِ علم اس کو جائز کہتے تھے۔" [۱۴]

یہ بیان ہے مظلوم مفتی صاحب کے ایک تلمیذ مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب کا انہی کی زبان سے ذرا یہ بھی پڑھیے:

"مرض الموت میں جب مولانا پر فالج گرا تو خوفِ الٰہی
اس قدر غالب ہوا کہ برابر رویا کرتے اور جب کوئی شخص
عیادت کے لئے پاس جاتا تو فرمایا کرتے تھے کہ "بھائی تمام
عمر میری حرام خوری میں گزری اگرچہ میں علم کے زور سے
لوگوں کو منوا دیتا تھا بھلا پھر نجات کی صورت کہاں؟" [۱۵]

اس سلسلے میں صرف یہ گزارش مناسب مقام معلوم ہوتی ہے کہ لے دے کے مفتی صاحب پر الزام صرف برٹش گورنمنٹ میں ملازمت کا رہ جاتا ہے اور اس الزام کا ازالہ اس عبارت سے کیجئے:

"شاہ صاحب (شاہ عبد العزیز) نے تو کمپنی کی ملازمت
کو جائز قرار دے دیا۔ بلکہ اپنے داماد مولوی عبد الحیٔ

کواجازت دے دی کہ وہ میرٹھ میں کمپنی کی ملازمت
اختیار کرلیں" ۱۶ھ

اب شاہ صاحب کو بھلا کیا کہا جائے گا اور جنھوں نے آپ کے فتویٰ جواز پر عمل کیا۔ ان کے حق میں فیصلہ کیا ہوگا ؟

تحریک آزادی ۱۸۵۷ء میں کردار

تحریک آزادی کا دور مسلمان قوم پر ظلم و بربریت کی وہ داستان ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اسے تاریخ کے صفحات سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ اس تحریک میں عام مسلمانوں کے علاوہ علمائے وقت نے خاص طور سے حصہ لیا، ان علماء میں ایسے بھی تھے جو برٹش گورنمنٹ کے سالہا سال سے ملازم تھے۔ اور بے شمار ایسے تھے جنھوں نے سرے سے ملازمت اختیار ہی نہ کی تھی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر علماء نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا ہوتا تو اس تحریک کا وجود ہی نہ ہوتا۔ دہلی کو اس تحریک میں مرکزی حیثیت حاصل تھی لہٰذا وہاں کے مستند اور مشہور علماء و فضلا کا کردار بھی مرکزی ہوگا۔ تحریک میں حصہ لینے والوں میں خاص طور پر مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ قابل ذکر ہیں۔

مفتی صاحب کے کردار کے بارے میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ مفتی صاحب اپنے ہم نشینوں کے ساتھ جب بھی مل بیٹھتے تھے تو یہی سوچتے تھے کہ انگریز قوم سے چھٹکارا کیونکر ممکن ہے ؟ جناب عشرت رحمانی نے اس بات کا اپنی تصنیف "سن ستاون" ص ۲۱۴ ص ۲۲۸ میں اپنے خاص رنگ میں تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

مفتی صاحب اس سلسلے میں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شریک مجلس مشاورت ہوتے رہے۔

جب فتویٰ جہاد جنرل بخت خاں کی سرکردگی میں مرتب ہوا تو اس پر دیگر فضلاء کے علاوہ حضرت مفتی صاحب نے بھی دستخط کئے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ان دستخطوں کو مخدوش بنانے کے لئے بالجبر یا بالجبر والا افسانہ گھڑ لیا گیا۔ مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کے لئے یہ عبارت ملاحظہ ہو :

"یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جن بزرگوں نے فتویٰ پر سب سے پہلے دستخط کئے ان میں حضرت مفتی صاحب

کا اسم گرامی بھی آج تک زیب قرطاس ہے۔" [18]

پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں:

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد پر دستخط کئے۔" [18]

مولانا عبدالشاہد شروانی کی تحریر ملاحظہ ہو۔

"علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے، مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا، بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی، استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دھلی . . . . . نے دستخط کر دیئے" [19]

اور اس بات سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ جو شخص فتویٰ جہاد پر دستخط کرتا ہے وہ تحریک سے عملی طور پر روگردانی کیسے کر سکتا ہے درانحالیکہ یہ فتویٰ مرتب ہی اس لئے ہوا تھا کہ اس جہاد میں شرکت کی جائے۔

علاوہ ازیں تمام مورخین اس بات پر بھی متفق ہیں کہ مفتی صاحب کو اس جرم کی پاداش میں سزا ہوئی۔ حوالات میں رہے اور جائیداد ضبط کر لی گئی۔ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے: [20]

"حضرت مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف جائیداد ضبط، ناچار، خستہ حال و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لیفٹیننٹ گورنر نے ازراہ رحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔" [21]

اس پر مستزاد یہ کہ تقریباً تین لاکھ کی مالیت کا کتب خانہ بھی اسی جرم کی وجہ سے ضبط ہو گیا۔ [21]

مندرجہ بالا مختصر حوالہ جات کی روشنی میں غور کیجئے کہ کیا مفتی صاحب اس تحریک سے الگ تھلگ رہے اور اس تحریک میں ان کا کردار صفر ہے؟ لیکن مفتی صاحب کی اس ساری دینی

وطنی خدمت پر پانی پھیرنے والا یہ بیان پڑھیے:

"اس طرح مولانا امام بخش صہبائی، مفتی صدر الدین آزردہ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ یقیناً ہدف ستم بنے لیکن انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔"[۲۲]

ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے:۔

"غالباً یہی فتویٰ تھا جو انجام کار مولانا کے خلاف مقدمے کا باعث بنا ورنہ نہ انھوں نے کسی جنگ میں حصہ لیا تھا، نہ ان کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کے قتل میں شرکت کی اور نہ ان کے خلاف کوئی سنگین الزام تھا۔"[۲۳]

رہائی

آخر بد انتظامی کی وجہ سے جب تحریک آزادی کچل دی گئی تو انگریز نے تحریک میں شامل لوگوں کو سزائیں دینا شروع کیں۔ بہت سے جزائر انڈیمان بھیج دیئے گئے۔ کئی ایسے تھے جنھیں پھانسی دے دی گئی۔ مفتی صاحب کا مقدمہ پیش ہوا اور جرم ثابت نہ ہو سکا لہٰذا مفتی صاحب کی ۵۰ سالہ دیانتدارانہ دورِ ملازمت کی بنا پر انھیں رہا کر دیا گیا۔ جناب مشکور احسن رقمطراز ہیں:

"بہرحال ان کے خلاف جرم ثابت نہ ہو سکا۔ اس لیے انہیں اپنے دیرینہ دوست مولانا فضل حق خیر آبادی اور اپنے دوسرے ہمعصروں کی طرح کڑی سزا تو نہ ملی۔"[۲۴]

(یعنی جائیداد وغیرہ ضبط کر کے رہا کر دیئے گئے)

اسی طرح نفرت نامہ گورنمنٹ میں ہے کہ چونکہ پہلے آپ نیک نامی اور دیانتداری سے حکومت کر چکے تھے لہٰذا سابقہ کارگزاریوں کے باعث چند ماہ نظربند رہ کر رہا کر دیئے گئے۔[۲۵]

وصال

مفتی صاحب کی ساری زندگی علم دین کی ترویج و اشاعتِ دین، غربا پروری احسان

ذمہ داری، وطن پرستی، احباب نوازی میں گزری۔ آخر وہ وقت آپہنچا جب آپ اپنے
پیچھے بشیار تلامذہ اور اہم تصنیفات چھوڑ کر اکیاسی برس کی عمر پاکر بروز پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول
۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں راہی ملک بقا ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون [26]
چراغِ دوجہاں، مادۂ تاریخ وصال ہے۔ شمس الشعراء ظہور الدین ظہور نے تاریخ
کہی ہے

کنوں گفتم چراغِ دوجہاں بود [27]

اور بعض نے "چراغ امم" بھی تاریخ لکھی ہے [28]

ضرورت ہے کہ دین کے ان اہم اور دلیر سپوتوں کی خدمات پر زیادہ سے زیادہ
ریسرچ کی جائے تاکہ ان کے نقش قدم پر چل کر آئندہ نسلیں اپنے آپ کو دین متین کی
خدمت کے لئے وقف کرسکیں۔

حوالہ جات:- [1] حاشیہ باغی ہندوستان ص۴۳ نیز گلشن بے خار ص۴۷ [2] تذکرہ
علمائے ہند اردو ص۲۴۷ [3] حاشیہ باغی ہندوستان ص۴۳ [4] حدائق الحنفیہ ص۴۸۱ -
[5] غالب نام آورم ص۱۸ [6] باغی ہندوستان ص۱۲۹ [7] گلشن بے خار ص۴۷،۲۶
[8] مقالات سرسید حصہ شانزدہم ص۲۸۰ [9] ماہنامہ خیال سن ستاون نمبر ص۲۶۶
[10] علم وعمل جلد اول ص۲۷۴ [11] مقدمہ کلیاتِ غالب فارسی جلد اول ص۴۸ نیز تبغیر الالفاظ
روزنامہ [illegible] بابت ۲۹ دسمبر ۱۹۷۴ء [12] تذکرہ غوثیہ ص۱۲۶ [13] حدائق الحنفیہ
ص۴۸۲ [14] تذکرہ الرشید ص۳۲ [15] ایضاً ص۳۴ [16] موج کوثر ص۲۸۸ [17] علمائے ہند
کا شاندار ماضی ج ۴ ص۲۵۰ [18] حاشیہ علم وعمل جلد اول ص۲۷۴ [19] تاریخ ذکاء اللہ بحوالہ
باغی ہندوستان ص۱۴۱ [20] ماہنامہ خیال سن ستاون نمبر ص۲۶۹ نیز تبغیر الالفاظ روزنامہ
نوائے وقت بابت ۹ دسمبر ۱۹۷۴ء بحوالہ جہانِ غالب ص۹۹ [21] حاشیہ تذکرہ علمائے
ہند اردو ص۲۴۸ [22] ۱۸۵۷ء کے مجاہد ص۳ [23] ایضاً ص۱۳۳، [24] ماہنامہ خیال
سن ستاون نمبر ص۲۶۹ [25] نصرت نامہ گورنمنٹ ص۵۶ بحوالہ بہادر شاہ ظفر ص۲۸ -
[26] تذکرہ علمائے ہند اردو ص۲۴۸ [27] ایضاً ص۲۴۸ [28] ماہنامہ خیال سن ستاون نمبر
ص۲۷ آزادی کی ان کہی کہانی از گل محمد فیض بی اے ص۱۵،۳۷ -

مولانا شاہ رضا علی خاں بریلوی

جنہوں نے انگریزوں کے خلاف تلوار سے بھی جہاد کیا

اسد نظامی

اعلیٰحضرت مائۃ حاضرہ مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ جد امجد حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے آپ کا اسم گرامی برطانوی حکمران کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ آپ نے فرنگی تسلط کے خلاف مجاہدین آزادی کی نہ صرف بھرپور حمایت کی بلکہ ہراول دستے کی حیثیت سے جنگ آزادی میں پیش پیش رہے تاریخی اوراق آپ کو مجاہد کبیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کیونکہ آپ فرنگی تسلط کے خلاف تھے آپ کا پورے کا پورا خاندان برطانوی جبر و استبداد اور لادینی نظام کے خلاف بر سر پیکار اور اسلامی اقدار کی بقا و استحکام کی حمایت میں ہر گام موید و موثق رہا۔

اس زمانے میں انگریز اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کے حربوں کو بروئے کار لائے تھے اور انھوں نے چند ایک زر خرید مولویوں سے فتویٰ عدم جہاد حاصل کرکے مسلمانوں کے سینوں سے اطاعت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور جذبۂ جہاد کو بالکل محو کرکے مسلمانوں کی تمام روحانی و جسمانی قوت کو مفلوج کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی، حضرت مولانا سید کفایت علی کافیؔ مراد آبادی، حضرت مولانا سید عبدالجلیل صاحب علی گڑھی، حضرت مولانا امام بخش صاحب صہبائی، حضرت مولانا شاہ رضا علی مجاہد کبیر جیسے جید علمائے اہلسنت و جماعت نے جنگ آزادی میں محدود وسائل ہونے کے باوجود انگریزوں اور ان کے زلہ رباؤں کے خلاف باقاعدہ جہاد کرکے ان کے ناپاک عزائم کو ناکام بنانے کی سعی مشکور کی۔

ان علمائے کرام کی بیش بہا جائدادیں اور وسیع کاروبار بالکل تباہ و برباد ہو گیا، مگر یہ برداشت نہ کر سکے کہ ایک غیر ملکی تثلیث پرست ہمارے سروں پر مسلط ہو۔ حضرت مولانا کی ولادت باسعادت بریلی شریف میں حضرت حافظ کاظم علی صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے گھر میں ہوئی۔ آپ نے سن صغر ہی میں قرآن کریم اور دیگر کتب درس نظامی وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے والد ماجد سے سپہ گری کی تربیت حاصل کی جو اس زمانے کے تقاضے کے مطابق نہایت ضروری تھا۔

آپ کے متعلق ایک دیوبندی مورخ ان الفاظ میں رقمطراز ہے :۔

"الشیخ رضا علی بریلوی، الشیخ الفاضل رضا علی بن کاظم
علی بن اعظم شاہ بن سعادت یار الافغانی البریلوی کان طائفۃ
من ابرٹیچ رہم قوم افغانیوں دخل الہند احد اسلاف
قتال رتبۃ فی العسکریۃ فسکن بلاد بریلی"

قتال رتبۃ فی العسکریۃ کے لفظ سے مترشح ہے کہ آپ عمر بھر باطل قوتوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔

آپ کا جہاد

۱۲۵۰ھ میں جب حضرت مولانا شاہ احمد اللہ صاحب مدراسی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ اور جنرل بخت خاں نے مراد آباد پر حملہ کیا تو آپ اسی لشکر کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ برطانوی فوجی دستہ پسپا ہو کر رام پور کی جانب فرار ہو گیا۔

اس واقعہ کو مولانا محمد احسن دہلوی مرحوم نے بڑی تفصیل کے ساتھ ماہنامہ طریقت۔ دہلی میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"آپ جنگ آزادی کے عظیم رہنما تھے عمر بھر فرنگی تسلط
کے خلاف برسر پیکار رہے۔ آپ ایک بہترین جنگجو
اور بے باک سپاہی تھے۔ لارڈ ہیٹنگ آپ کے نام سے
بے حد نالاں رہا۔ جنرل ہڈسن جیسے برطانوی جنرل نے
آپ کا سر قلم کرنے کا انعام پانچ سو مقرر کیا تھا۔ مگر وہ
اپنے مقصد میں عمر بھر ناکام رہا"

ان حقائق کے باوجود بعض متعصب مورخ آپ کو انگریزوں کا بہی خواہ بتاتے ہیں جو آپ پر انتہائی گھٹیا بہتان ہے۔

آپ کے متعلق ایک برطانوی مورخ رقمطراز ہے :۔

جب کہ برطانوی حکام تمام ہند پر قبضہ کرنے کی
ہر چند کوشش کر رہے تھے تو اس وقت مولانا فضل
حق خیر آبادی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی۔ مولانا
امام بخش صہبائی، مولانا رضا علی بریلوی جیسے الھڑ
مولوی برطانوی تسلط کے خلاف اپنی بھرپور کوشش
کر رہے تھے۔"

مسٹر ملی سن کی خفیہ رپورٹ سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ انگریزوں کے ہرگز وفادار نہیں تھے۔ بلکہ برطانوی تسلط کے خلاف اپنی بھرپور کوشش کرتے رہے:۔

"حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب بریلوی نے
جب برطانوی حکام کے خلاف جہاد میں حصہ لیا تو
انگریزوں نے آپ کے احاطہ سے نقب زنی کرا کے ۲۵
عدد گھوڑے چوری کرا لئے۔ کیونکہ حضرت مولانا اپنے
تمام گھوڑے تحریک آزادی کے کارکنوں کو انگریزوں
پر شب خوں مارنے کے لئے مفت دیتے تھے۔ اور
انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں کا اکثر و بیشتر قیام
آپ کی حویلی کے اندر ہی رہتا تھا۔ لنگر وغیرہ بھی
آپ اپنی گرہ سے تقسیم کرتے تھے۔"

حضرت مولانا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ۲۵ گھوڑوں کا تحریک آزادی کے کارکنوں کو انگریزی حکام پر شب خوں مارنے کے لئے دینا اور ان کے قیام و انصرام کا انتظام کرنا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ آپ برطانوی تسلط کے خلاف تھے۔ بعض مورخین اور مسٹر فیروز الدین روحی نے ان کا مرتبہ گھٹانے کے لئے سامراج کا ایجنٹ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

بقول شاعر ؎

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشہ دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب بریلوی کی ذات گرامی اپنے تدین علمی وجاہت اور جذبۂ حریت میں کسی سے بھی کم نہیں ہیں۔ آپ نے فرنگی تسلط کے خلاف جس قدر جہد وایثار سے کام لیا۔ اس کا انکار فی الحقیقت تاریخ کو منہ چڑانے کے مترادف ہے یہ صرف کور باطنی اور تعصب ذہنی کا نتیجہ ہے کہ علماء ومشائخ اہلسنت کے کارواں کو دانستہ طور پر نظر انداز کر کے لارڈ ہیسٹنگ اور جنرل ہڈسن کے تنخواہ خواروں اور ان کے حاشیہ برداروں کو مجاہد صف اول اور امیر المومنین کے خطابات سے موسوم کر کے اصل واقعات کو مسخ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

حضرت مولانا صاحب کے علمی وفکری کارنامے اور انگریزوں کے خلاف آپ کی جدوجہد ایک اٹل تاریخی حقیقت ہے۔ مورخ کی نگاہ میں آج بھی یہ منظر تازہ ہے کہ خطۂ بریلی سے حضرت مولانا خلیل الرحمٰن صاحب رامپوری کا ممتاز شاگرد اور حضرت مولانا حافظ کاظم علی خاں صاحب کا لخت جگر اپنی شمشیر بے نیام ہے کر نہایت بے باکی وجرأت کے ساتھ سربکف ہو کر دشمنانِ اسلام کا مقابلہ ومقاتلہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔

گویا حضرت مولانا صاحب کا وجود انگریزوں کی معاندانہ سازشوں کے خلاف بر سر پیکار اور موجب چیلنج بنا رہا۔ چنانچہ برطانوی مورخ ڈاکٹر ڈلی سن آپ کے متعلق ان الفاظ میں رقمطراز ہے۔

"شہر بریلی شریف کے اندر جب لوگوں میں برطانوی حکام کے خلاف یورش پھیلی تو اس یورش کے تمام تر ذمہ دار جنرل بخت خاں اور ان کا ساتھی بریلوی ملاں شاہ رضا علی ولد حافظ کاظم علی ولد سعادت یار خاں پٹھان ہی تھے جو بریلی کے عوام ۔۔۔۔ کو برطانوی حکام کے خلاف اکسانے کے نہ صرف مجرم ٹھہرے بلکہ انھوں نے بریلی کے عوام کو برطانوی فوج کے خلاف مقابلہ کرنے پر بے حد برافروختہ کیا۔ اگر ملاں رضا علی اپنے عقیدت مندوں سمیت ہمارا مقابلہ نہ کرتا تو بریلی شہر پر ہمارا

قبضہ ہونا بالکل آسان تھا۔ اس بریلوی مولوی رضا علی
کی بے حد مزاحمت کی وجہ سے برطانوی افواج کو کافی
خون وکشت اور آگ اور خون کا دریا عبور کرنا پڑا پھر
بھی بمشکل بریلی پر قبضہ کیا۔"

حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب مجاہد کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا انگریزی تسلط کے خلاف جہاد کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔

(حضرت مولانا صاحب کی کرامت)

جب حضرت مولانا صاحب کے ساتھی شہید ہو گئے تو آپ اپنی حویلی کے اندر ہتھیار لے کر سینہ سپر ہو گئے۔ انگریزوں نے بریلی شریف پر قبضہ کر لیا۔ بچے کھچے مجاہدین کا تعاقب اور ان کو شہید کرنا شروع کر دیا۔ جو مجاہدین آزادی ان کے ہاتھ آئے انھیں بندوق کی گولی سے شہید کر دیا۔

جنرل بخت خاں اور حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب مدراسی بھی شہید ہو گئے حضرت مولانا صاحب بریلی میں تن تنہا رہ گئے وہ صرف اپنی حویلی کے اندر محصور ہو گئے انگریزوں نے آپ کو زندہ گرفتار کرنے یا آپکا سر مبارک قلم کرنے کی ہر چند سعی کی حتیٰ کہ انگریزی فوج جب آپ کی حویلی کے اندر دیوار پھاند کر داخل ہوئی تو آپ اسوقت زرہ بکتر پوش لباس میں ملبوس ہو کر شمشیر بکف تھے اور آپ کی زبان پر قرآن کریم کی تلاوت تھی دل پرسکون تھا صرف یہی تمنا تھی کہ شہید ہو جاؤں مگر شاید مشیت خداوندی یہی تھی کہ آپ علیہ الرحمۃ ان کی دستبرد سے بالکل محفوظ و مامون رہے بلکہ انگریزی فوج آپ کی حویلی کے اندر داخل ہو کر بھی آپ کو شہید کرنے میں ناکام ہی رہی۔ حالانکہ آپ اس حویلی کے اندر موجود تھے۔

؎ دشمن چہ کند چوں مہربان باشد دوست

اور برطانوی فوج بے نیل و مرام واپس اپنے کنٹرول روم میں چلی گئی۔ اور حضرت صاحب وہیں اپنی حویلی کے اندر ہی قیام پذیر رہے۔ فرنگی تسلط کے باوجود بھی انگریز آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

حضرت مولانا حسن صاحب مرحوم دہلوی کے جد امجد حضرت مولانا فخر الدین صاحب قادری سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور شاگرد بھی تھے۔ بریلی شریف میں آپ کے دستہ میں شریک ہو کر کارہائے نمایاں دکھاتے ہوئے

شہید ہو گئے۔ لہٰذا اسی خاندانی قریبی تعلقات کی بنا پر حضرت مولانا محمد احسن صاحب دہلوی نے ماہنامہ طریقت دہلی ائمہ اہل سنت نمبر میں تفصیل کے ساتھ واقعات درج فرمائے اور ہم تک یہ تاریخی واقعات پہنچے۔

الحمد للہ فالحمد للہ

حوالہ جات

[1] سید عبدالحئی حسنی ندوی۔ نزہۃ الخواطر عربی ص ۱۵۰ جلد ہفتم مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف نعمانیہ، حیدرآباد دکن سال طبع ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء [2] ماہنامہ طریقت ائمہ اہلسنت نمبر ص ۱۱۷ [3] ٹی سن انگریزی مورخ، رپورٹ ان دی ہند ص ۱۱۹ مترجم جناب احمد علی صاحب دہلوی یکے از شاگرد حکیم احسن اللہ خاں دہلوی مطبوعہ دہلی سال طبع ۱۸۹۸ء [4] مولانا محمد احسن صاحب دہلوی، ماہنامہ طریقت دہلی ص ۱۱۸ [5] ڈاکٹر ولسن برطانوی مورخ، رپورٹ ان دی ہند ص ۱۲۰ مترجم جناب احمد علی صاحب دہلوی یکے از شاگرد حکیم احسن اللہ خاں دہلوی مطبع دہلی سال طبع ۱۸۹۷ء۔

حیدرآباد دکن مرحوم

حضرت شیخ طریقت

علامہ مولانا ضیاء الدین احمد صاحب

قادری، مدنی، دامت برکاتہم العالیہ

انٹرویو:۔ پروفیسر شاہ فرید الحق

مدینہ منورہ اہل دل اور اہل محبت کا قبلہ ہے جس مسلمان کو حاضری کا شرف میسر ہو جائے اسکی قسمت کا کیا کہنا۔ احقر کی سالوں سے یہ دیرینہ تمنا اور آرزو تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہہ شریف میں حاضری نصیب ہو تاکہ ذوق وشوق سے بارگاہِ رسالت میں درود وسلام پیش کروں شفاعت کی درخواست کروں۔ گناہوں اور کوتاہیوں پر ندامت کا اظہار کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اپنی گناہ گار زبان سے دور بیٹھ کر درود وسلام کے نذرانے پیش کیا کرتا تھا اور سرکار کی کرم نوازی کا منتظر رہتا تھا۔

آخر کار سرکارِ ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ناچیز کو پچھلے سال حج کے موقع پر طلب فرمایا۔ حج سے پہلے حاضر ہو کر گناہوں پر نادم ہوا اور استغفار کی درخواست کی تاکہ قرآن کی اس آیت کے تحت توبہ قبول ہو سکے۔

ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاؤک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما۔

سرورِ کائنات کی رحمت کاملہ سے مجھے یقین ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کرم فرمایا

تقریباً ۱۲ روز قیام رہا۔ صبح دوپہر شام حاضری ہوتی رہی۔
دوران قیام مدینہ منورہ یہ اشتیاق پیدا ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عاشق بزرگ جو مسجد نبوی کے سایہ میں مدتوں سے قیام پزیر ہیں اور سنی مسلمان ان سے فیض حاصل کرتے ہیں سے ملاقات کی جائے۔ اتفاق کی بات یہ کہ احقر کا قیام اصطفےٰ منزل میں تھا جو باب مجیدی کے بالکل سامنے واقع ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ بزرگ اصطفےٰ منزل کے مرکزی دروازہ کے سامنے۔ جو گلی ہے اسی میں رہتے ہیں۔ باب مجیدی کے سامنے سڑک کے پار گلی کے کونہ پر ڈاکخانہ ہے۔ ڈاکخانہ کے سامنے متصل گلی میں جانے کے بعد داہنی طرف والی گلی میں مڑنے پر داہنی طرف دو تین مکانات کے بعد اس بزرگ اور عظیم شخصیت کی رہائش گاہ ہے۔ میں وہاں عشاء کی نماز کے بعد پہنچا۔ ایک پرانا دروازہ نظر آیا جس میں باہر ایک رسی لٹکی ہوئی تھی اسے کھینچنے پر دروازہ کھل گیا اندر داخل ہوا تو داہنی طرف سامنے ایک کمرہ نظر آیا۔ جس میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے سیڑھیوں پر جوتے رکھے ہوئے تھے۔ میں بھی ہمت کر کے جوتے اتار کر کمرے میں داخل ہوا۔ اور اسلام علیکم عرض کیا۔ لوگوں نے وعلیکم السلام کہا۔ بالخصوص ایک بزرگ ترین شخصیت پر نظر پڑی جو کوتے پر تشریف رکھتے تھے ان کے اردگرد تکیے رکھے ہوئے تھے۔ پیروں پر ایک ... اونی شال پڑی ہوئی تھی سر پر عمامہ تھا۔ گرم کرتہ... اور جیکٹ زیب تن کئے ہوئے تھے۔ دبلے پتلے، ضعیف چہرہ پر سفید چمکتی ہوئی داڑھی ماتھے پر خفیف سا سجدہ کا نشان گندمی رنگ... نظر پڑتے ہی ایسا معلوم ہوا چہرہ پہ نور برس رہا ہے۔ دل نے یہ کہا۔ یہی وہ بزرگ معلوم ہوتے ہیں جن کی شہرت ہند و پاک ہی میں نہیں بلکہ بلاد اسلامیہ میں ہے۔ میں نے لپک کر مصافحہ کیا ہاتھوں کو بوسہ دیا اور ایک کنارے بیٹھ گیا۔

لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ پورا کمرہ بھر گیا نعت خوانی شروع ہوئی ایک گھنٹہ نعت خوانی ہوتی رہی اس کے بعد اعلیحضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور سلام بیٹھ کر پڑھا گیا یعنی :

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

حضرت ضعف پیری کی وجہ سے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ بیٹھ کر صلوٰۃ و سلام پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بشرطیکہ کھڑے ہو کر باادب پڑھنے کو ناجائز حرام اور شرک قرار نہ دیا جائے۔ لیکن اس بزرگ کے یہاں جب اہتمام سے میلاد شریف ہوتا ہے

تو وہ دیوار کے سہارے کھڑے ہوکر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں۔ صلوٰۃ وسلام کے بعد دستر خوان بچھا اور ما حضر پیش کیا گیا۔ جتنے افراد موجود تھے سب نے کھایا۔ ما حضر کیا ہے مکمل رات کا کھانا ہوتا ہے۔ یہ معمول اس بزرگ کے یہاں سالوں سے ہے اور روزانہ یہی ہوتا ہے۔ موسم حج میں لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔

جب سب کچھ ختم ہو گیا۔ دعا ہو گئی پھر میں نے ہمت کر کے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ معلوم ہوا یہی مولانا ضیاء الدین احمد قادری ہیں۔ جو اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خاں کے خلیفہ مجاز ہیں اور تقریباً ستر سال سے مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں۔

احقر زیارت سے فارغ ہو کر روزانہ حاضری دیتا رہا حاضری سے ایمان وعقیدے میں پختگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عقیدت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ قلب پر ایک عجیب سی رقت طاری ہوتی تھی۔ سوچتا تھا کہ آج بھی اس مادی دور میں ایسے بزرگ موجود ہیں جنھیں دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ جذبات وشوق کی لہریں سینوں میں اٹھنے لگتی ہیں۔

اسی سال کی حاضری میں یہ اشتیاق پیدا ہوا کہ حضرت کے کچھ حالات وکوائف معلوم کئے جائیں لیکن ہمت نہیں پڑی۔ حالانکہ حج کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضری دی اور پھر حضرت مولانا کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ بہرحال کف افسوس ملتا کراچی آ گیا۔ روانگی کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں عرض کیا تھا کہ حضور بار بار عنایت ہو اور حاضری کا شرف حاصل ہو طبیعت بھری نہیں اور جب حج کے بعد حاضر ہوا تو خواہش یہ ہوتی کہ اب یہیں رہ جاؤں۔ واپس جانے کو طبیعت نہیں چاہتی تھی۔ حضور کی عنایت سے کشش زیادہ پیدا ہو گئی بالکل ایسا معلوم ہونے لگا کہ اصل وطن میں آ گیا۔ درو دیوار سے ایک لگاؤ اور انسیت پیدا ہو گئی۔

امسال بھی حضور کی عنایت بے پایاں کا شکر کیسے ادا کروں۔ احقر پر کرم فرمایا اور حاضری کا حکم ہو گیا۔ قسمت نے یاوری کی کہ حضرت مبلغ اسلام قائد اہل سنت علامہ مولانا شاہ احمد نورانی صدر جمعیت علمائے پاکستان وصدر ورلڈ اسلامک مشن کی قیادت میں جو تین رکنی وفد بیرونی ملکوں میں تبلیغ کے لئے روانہ ہوا اس میں تیسرا نام احقر کا تھا حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ حج سے فارغ ہو کر حضور کے دربار میں حاضر ہوا۔ ایکی دفعہ بھی اصطفیٰ منزل میں قیام ہوا کہ حضرت مولانا ضیاء الدین احمد صاحب کی خدمت اقدس میں بھی

حاضری دی اور روزانہ ان کی نورانی محفل میں شرکت کا شرف حاصل ہوتا رہا حضرت نے مجبور کیا کہ وفد کے لوگ میرے ساتھ..... کھانا کھائیں - یہ بھی بڑی قسمت ہے کہ بزرگوں کے دستر خوان سے ٹکڑا ملے - پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان کی حیثیت سے جو خاطر تواضع ہوئی اس کا بیان قلم سے ممکن نہیں - قربان جایئے اس سرکار پر جو پورے جہان کو رزق تقسیم کرنے والا ہے - حضرت مولانا سے زیادہ قرب حاصل ہوا - مختلف معلومات ہوتی رہیں - عشق مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا چراغ روشن سے روشن تر ہوتا رہا -

کئی روز ہمت کی کہ حضرت سے کچھ..... تفصیلی گفتگو کر دں - لیکن موقع نہ مل سکا پھر حضرت کی ضعیفی کو دیکھ کر یہ خیال آتا تھا کہ کہیں کوئی تکلیف نہ ہو جائے بہر حال موقع نہ مل سکا - اور ہمارا وفد بیرونی ممالک کے دورے پر روانہ ہو گیا - حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روتے ہوئے عرض کیا کہ دوبارہ حاضری کا حکم صادر فرما دیں - چونکہ انھیں کے دین کی تبلیغ کے لئے وفد باہر جا رہا تھا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت شامل تھی - خوش قسمتی ہے کہ یہ عرضداشت قبول ہو چکی تھی ۲½ ماہ کے دورہ کے بعد پھر حاضری کا شرف نصیب ہو گیا - عمرہ کرنے کے بعد دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری دی اور شکرانہ کا سلام پیش کیا - پورے سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت شامل حال رہی اور بڑا کامیاب دورہ رہا - اب کی قیام مختصر تھا لیکن اس دفعہ میں نے حضرت مولانا ضیاءالدین صاحب قادری سے جسارت کر کے کچھ تھوڑا سا وقت لے لیا اور انکی زبان سے کچھ حالات قلمبند کئے جو ہدیۂ ناظرین ہیں - میرے بے باکانہ سوالات کا جواب حضرت نے عنایت فرمایا وہ اہلسنت کیلئے سرمایہ حیات ہے

۱۴ اپریل ۱۹۷۵ء کو مطابق یکم ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ مدینہ منورہ میں حضرت شیخ طریقت علامہ مولانا ضیاء الدین احمد قادری کے در دولت پر صبح ۸ بجے علامہ شاہ احمد نورانی علامہ عبدالستار خاں نیازی اور احقر حضرت شیخ کے سامنے باادب بیٹھے ہیں - ناشتہ سے فارغ ہو کر فقیر نے قائد اہلسنت مبلغ اسلام مولانا شاہ احمد نورانی کے نورانی چہرے پر نظر ڈالی اور متوجہ ہو کر دھیرے سے ان سے دریافت کیا کہ آیا آج یہ ممکن ہے کہ حضرت شیخ طریقت سے کچھ ان کی زندگی سے متعلق سوالات پوچھ لئے جائیں - قائد اہلسنت کی ایما مل جانے پر فقیر حضرت شیخ کی طرف متوجہ ہوا اور باادب عرض کیا کہ حضرت کچھ سوالات ہیں اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو جواب دیں - جب حضرت شیخ کی رضامندی حاصل ہو گئی تو فقیر نے جسارت کر کے چند سوالات کر ڈالے -

حضرت کیا آپ کچھ اپنی پیدائش، سکونت اور خاندان کے متعلق فرمانا پسند کریں گے؟
حضرت نے جو کچھ فرمایا وہ میں اپنی تحریر میں پیش کر رہا ہوں۔
حضرت شیخ کا پورا نام ضیاء الدین احمد قادری ہے۔ پیدائش ۱۲۹۴ھ سیالکوٹ (پنجاب)۔ آپ کے والد کا نام عبدالعظیم تھا۔ حضرت نے والد کے نام و ذکر سے گریز کرنا چاہا اس لئے کہ وہ ان کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ فرمایا میرے والد بد عقیدہ تھے۔ نسبی طور پر آپ کا گھرانا رحمانی کہلاتا ہے۔ آپ کے دادا بڑے پکے سنی صحیح العقیدہ بزرگ تھے آپ حضرت عبدالرحمٰن بن ابو بکر کی اولاد سے ہیں اسی لئے رحمانی کہلاتے ہیں۔ والدہ کا نام فضل بی بی۔ وہ سنی تھیں۔ حضرت کے بھائی کا نام محمد مقبول ہے۔ وہ پکے سنی ہیں۔
میرا دوسرا سوال تھا:۔
حضرت کیا آپ فرمائیں گے کہ آپ کے والد کی بد عقیدگی کا کوئی اثر آپ پر ہوا؟
فرمایا میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور عقل و شعور کی منزل میں داخل ہوا اسی وقت سے مجھے گمراہ اور بد عقیدہ لوگوں سے نفرت تھی۔ یہ بات میرے اندر خداداد تھی مجھ پر کبھی کسی باطل عقیدہ کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔ پھر فرمایا کہ۔ میں باپ سے علیحدگی چاہتا تھا اور اس ماحول میں گھٹن محسوس کرتا تھا اس لئے ۲۰ سال کی عمر میں وطن کو خیرباد کہہ دیا۔
میرا تیسرا سوال تھا:۔ حضرت کیا آپ کچھ اپنی تعلیم اور بیعت و خلافت سے متعلق کچھ فرمائیں گے۔؟
فرمایا ابتدائی تعلیم میں نے لاہور میں حاصل کی۔ حدیث شریف کا درس پیلی بھیت (یوپی) میں حضرت محدث اعظم شاہ وصی احمد صاحب سے لیا۔ حضرت نے مدینہ شریف میں بھی تعلیم حاصل کی اس وقت مدینہ منورہ میں سیدی احمد الشمس المدنی موجود تھے حضرت نے فرمایا کہ یہ حضرت بڑے بزرگ اور حافظ الحدیث تھے کسی سے بات نہیں کرتے تھے اگر کسی کا جواب دیتے تو وہ بھی حدیث میں دیتے۔ حضرت شیخ نے ان سے بیضاوی شریف پڑھی ہے۔

اعلیٰحضرت سے ملاقات:۔

فرمایا کہ سب سے پہلے ۱۳۱۵ھ میں بریلی شریف میں اعلیٰ حضرت سے ملاقات ہوئی۔ چونکہ شاہ وصی احمد صاحب سے اعلیٰ حضرت کا خصوصی تعلق تھا اس لئے آمد و رفت جاری تھی فرمایا کہ میں ہر جمعرات کو پیلی بھیت سے بریلی شریف جاتا تھا اور جمعہ کی نماز اعلیٰحضرت کے پیچھے پڑھتا تھا۔ بیعت و خلافت کے متعلق فرمایا کہ ۱۳۳۹ھ میں مجھے ایک خواب نظر آیا جس سے میں نے یہ تعبیر نکالی کہ اعلیٰحضرت عظیم المرتبت کا یہ آخری سال ہے اس

لئے میں نے مدینہ منورہ سے بریلی شریف کا سفر کیا اور اعلیٰ حضرت سے بیعت ہوا اور اسی وقت اجازت وخلافت سے نوازا گیا۔

میرا چوتھا سوال تھا۔ حضرت کیا آپ وطن سے ہجرت سے متعلق اور اس کے بعد کے واقعات پر کچھ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے۔؟

فرمایا بیس یا بائیس سال کی عمر میں وطن چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ اس مجبوری میں سب سے بڑی مجبوری میرے والد کا بدعقیدہ ہونا تھا۔ سب سے پہلے میں بغداد شریف پہنچا۔ بے سروسامانی کے عالم میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ پھر مجھ پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی اور میں جنگلوں اور ریگستانوں کے چکر لگاتا رہا۔ اسی جذب کے عالم میں ادھر ادھر پھرتے ہوئے کردستان کے ایک عالم سید حسین حسنی سے ملاقات ہوگئی۔ اس بزرگ کا انتقال ۱۸۲ سال کی عمر میں ہوا۔ نماز میں دو دو تین تین پارے ایک رکعت میں تلاوت کر لیتے تھے۔ جوں ہی اس بزرگ نے میرا ہاتھ پکڑا جذب کی کیفیت ختم ہوگئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کردستان لے گئے جہاں میں ۱½ سال مقیم رہا اس کے بعد پھر میں بغداد واپس آگیا۔

فرمایا اس طرح ۶ - ۷ سال تک بغداد میں رہا بزرگوں سے فیض حاصل کرتا رہا لیکن مدینہ منورہ کی کشش نے مجھے بغداد سے مدینہ پہنچایا۔ یہاں پہنچ کر میں نے مستقل قیام کا تہیہ کر لیا۔ اسوقت مجھے مدینہ منورہ آئے ہوئے تقریباً ۷۰ سال ہو چکے ہیں۔

میرا پانچواں سوال تھا کہ حضرت کیا آپ مناسب خیال فرمائیں گے کہ عرب کی سیاست اور سعودی عرب کی حکومت کے عمل دخل پر روشنی ڈالیں۔؟

فرمایا کہ میں ترکوں کے زمانے میں آیا۔ بڑی امن وسکون کی زندگی تھی۔ ترک بڑی عقیدت مندی سے انتظامات کرتے تھے۔ اور پھر بزرگوں کے آثار کو باقی رکھنے کی جدوجہد کرتے تھے۔ لیکن انگریزوں کی فریب کاری نے شریف مکہ کو بغاوت پر ابھارا اور اس نے ترک حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ انگریزوں کی مدد سے جنگ ہوئی۔ ترک حرمین شریفین میں خونریزی سے بچنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے زیادہ مزاحمت نہیں کی پھر بھی بہت سے مسلمانوں کا خون بہا اور شریف مکہ محافظ حرمین شریفین ہو گئے۔

۱۳۳۳ھ کا واقعہ ہے ۱۱ - ۱۲ سال شریف مکہ کی حکومت رہی اس کے زمانے میں بھی امن وچین رہا۔ حرمین شریفین کی خدمت کو اپنا فریضہ تسلیم کرتا تھا۔ عقائد کے جھگڑے بھی اتنے کھڑے نہیں ہوئے۔ ۱۳۴۴ھ میں سعودی خاندان کی اور شریف مکہ کی جنگ

ہوئی اس جنگ میں البتہ ہزاروں مسلمان شہید ہوئے بلکہ گنبد خضراء پر بھی گولی چلی بہت سے لوگ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ سے ہجرت کر گئے۔ شریف مکہ کو شکست ہوئی اور سعودی حکومت جو نجدیوں کی ہے برسر اقتدار آئی۔ یہ لوگ عبدالوہاب نجدی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی کے عقیدے پر گامزن ہیں۔

میرا چھٹا سوال تھا کہ آیا اعلیحضرت نے آپ کے حجاز مقدس کے قیام کے دوران حج کیا۔؟

فرمایا نہیں اعلیٰ حضرت نے ۱۳۲۳ھ میں حج کیا اور ۱۳۲۴ھ میں مدینہ منورہ تشریف لائے۔ اسی زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم پر وہابیوں کے اعتراض پر معرکۃ الآرا کتاب الدولۃ المکیہ تصنیف فرمائی اور مجھے بغداد تقریظ کے لئے بھیجا۔

میرا ساتواں سوال تھا کہ حضرت کیا آپ۔۔۔ مبلغ اسلام مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کچھ بیان فرمانا مناسب خیال کریں گے۔

فرمایا مولانا مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۳۱۰ھ کی ہے۔ اور اور وفات ۱۳۷۴ھ ہے۔ ویسے تو میری ملاقات بریلی شریف میں ان سے ہو چکی تھی لیکن مدینہ منورہ میں ملاقات کا ایک واقعہ ہے۔

حضرت شیخ طریقت مدینہ منورہ کی بندرگاہ بمبو پر اترے اور مولانا عبدالعلیم صدیقی بھی بندرگاہ میں۔۔۔۔ دونوں نے جامع مسجد میں نماز ادا کی۔ نماز کے بعد حضرت شیخ نے دیکھا کہ ایک نوجوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک کی طرف رخ کر کے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور وظیفہ درود و سلام پڑھ رہا ہے۔ حضرت شیخ نے پیچھے سے دونوں شانوں کو پکڑ کر حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقی کا رخ درست کر دیا۔ اور فرمایا کہ صاحبزادے صحیح رخ یہ ہے۔ بس اس کے بعد حضرت مولانا سے ملاقات ہوئی پھر مدینہ منورہ میں انکی آمد و رفت شروع ہو گئی اور آخر وقت تک حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑے گہرے تعلقات رہے۔

میرا آٹھواں سوال یہ تھا کہ حضرت کیا آپ فرمائیں گے کہ موجودہ عقائد کے لوگوں کے پیچھے آپ نماز پڑھتے ہیں۔ کیا آپ کے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا ہے۔ یہ لوگ تو بزرگوں کے اور محفل میلاد وغیرہ کے قائل نہیں۔ آپ کو کس طرح میلاد وغیرہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ میرا یہ بھی سوال تھا کہ کیا اسوقت ان کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے؟

فرمایاکہ شروع شروع میں بڑی سختی ہوئی۔ میرے خلاف پہرے لگ گئے مجھے بدعتی اور مشرک مشہور کیا گیا۔ مجھ سے مناظرہ کے لئے لوگوں کو بھیجا۔

ایک دفعہ وسیلہ پر مناظرہ کرنے کے لئے کچھ لوگ آئے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا اللہ تک رسائی کے لئے غیر اللہ سے وسیلہ کے آپ قائل ہیں۔ میں نے کہا وسیلہ تلاش کرنے کا حکم قرآن میں ہے انھوں نے کہا اس وسیلہ سے مراد نماز اور نیک کام ہیں۔ حضرت نے سوال کیا صلوٰۃ (نماز) اللہ ہے یا غیر اللہ۔ اس پر سب ساکت ہو گئے جواب نہ بن پڑا اور واپس چلے گئے۔

اسی طرح متعدد مسئلوں سے متعلق گفتگو کرنے کے لئے آتے رہے۔ مجھ سے لوگوں کا ملنا جلنا بند کرتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ حالات دور ہو گئے اور اب بفضلہ تعالیٰ سب کچھ ٹھیک ہے بالخصوص فیصل کے زمانے سے میلاد وغیرہ پر اتنی سختی سے پابندی نہیں ہے۔ مدینہ منورہ میں باقاعدہ میدان میں لاؤڈ اسپیکر ہیں اور گھر گھر میلاد کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ خود حضرت شیخ طریقت کے یہاں ہر سال خصوصی محفل میلاد منعقد ہوتی ہے جس میں سینکڑوں افراد شریک ہوتے ہیں اور دعوت طعام کا خصوصی انتظام کیا جاتا ہے۔

حضرت نے اسی ضمن میں فرمایا کہ میں نے ان کے پیچھے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ اگر کبھی اتفاقیہ پڑھنی پڑی تو دہرالی۔

حضرت نے ایک واقعہ اس ضمن میں بیان فرمایا اور ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ سے میری جان بخشی ہوئی۔ عصر کی نماز گھر میں ادا کی اس کے بعد دل میں حضور کی زیارت کی خواہش پیدا ہوئی۔ پھر خیال آیا کہ دیر ہو جائے گی اور مغرب کی اذان ہو گئی پھر نماز پڑھنی پڑے گی۔ لیکن اس کے باوجود اشتیاق ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں۔ میں زیارت کے لئے حاضر ہوا صلوٰۃ وسلام میں مشغول تھا کہ مغرب کی اذان ہو گئی۔ میں نے نماز ادا کی۔ اس کے بعد باب الاسلام کی طرف آیا کہ مدیر شرط (محافظ پولس) نے بلایا۔ ان سے ملا۔ انھوں نے حکم دیا کہ امیر مدینہ نے حکم دیا ہے کہ آپ کو زبردستی کھینچ کر ان کے سامنے حاضر کیا جائے۔ خیر مجھے حاضر کیا گیا سب سے پہلے نماز کا سوال ہو گیا۔ پوچھا کہ آپ نماز ہمارے پیچھے کیوں نہیں پڑھتے۔ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں۔ ابھی میں کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ مدیر نے خود ہی کہا کہ ابھی تو انھوں نے نماز مغرب ہمارے امام کے پیچھے ادا کی ہے۔ یہ سن کر امیر خاموش ہو گیا۔ اور میری جان بخشی ہوئی۔

اسوقت نماز ان کے پیچھے ادا کرنے سے متعلق فرمایا کہ نماز ادا نہیں ہوتی بعض عقائد

کفر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں احتیاط اسی میں ہے کہ اپنی نماز اگر ممکن ہو سکے تو الگ جماعت
کے ساتھ ادا کرے اور اگر بہتر ہو تو انفرادی طور پر ادا کرے۔ ویسے فساد سے بچنے کے لئے۔ اور
مسلمانوں میں بدگمانی سے دور رہنے کے لئے اگر کوئی پڑھتا ہے تو ٹھیک ہے مگر نماز کا اعادہ
کر لیا کرے۔ اسی سلسلے میں فرمایا کہ امامت اور نماز کا مسئلہ حجاز مکرمہ میں یہ پہلی مرتبہ پیش
نہیں آیا۔ بلکہ اس سے بھی پہلے تین دور ایسے گزر چکے ہیں کہ بہت سے افراد امام وقت کے پیچھے
نماز ادا کرنے سے گریز کرتے تھے یہاں تک کہ بعض صحابۂ کرام کا بھی یہی عمل رہا ہے۔

پہلا دور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے وقت پیش آیا جبکہ بہت
سے صحابی اس زمانے میں مقررہ امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے گریز کرتے تھے۔ کہ کہیں شہادت
عثمان میں یہ بھی شامل نہ ہو پھر دوسرا دور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے بعد آیا جب
مملکت میں خلفشار رہا اور بے دین طاقتیں ابھر کر سامنے آئیں اور اس طرح یزید کا دور
سلطنت آگیا۔ اس زمانے میں بھی لوگوں نے یزیدی امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے گریز کیا۔

اور تیسرا زمانہ حجاج بن یوسف کا تھا۔ عبداللہ بن زبیر سے اس کی لڑائی ہوئی۔
لاکھوں مسلمان شہید ہوئے لوگوں نے اس کے مقررہ امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی۔

اب یہ چوتھا دور ہے۔ بعض فسادی مسلمانوں کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ کچھ مخصوص
عقائد کے لوگ سعودی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے جبکہ لاکھوں مسلمان پڑھتے ہیں۔ لاکھوں
مسلمان اگر عقائد کی واقفیت کے بعد پڑھتے ہیں تو نماز کا ہونا محل نظر ہوگا۔ لیکن ہمیں معلوم ہے
کہ عام مسلمان ان کے تمام عقائد سے واقف نہیں ہیں۔ اسی سال ایک لاکھ سے زائد مسلمان
ترکی سے حج کرنے آئے تھے۔ میں نے خود دیکھا کہ ان کی بڑی بڑی جماعتیں مسجد نبوی میں علیحدہ
ہوتی تھیں۔ جن لوگوں کا عقیدہ ایمان اور دھرم نہیں ہوتا وہ اسی قسم کے الزامات لگاتے ہیں
ہر عقیدہ اچھا ہے۔ ہر شخص کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے۔ یہی کچھ مخصوص جماعتیں عوام میں انتشار پھیلاتی
ہیں، فاسق، فاجر، بدعقیدہ گمراہ کن شاتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے والے
نیک اور بزرگ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق علماء اور اولیاء سب ایک ہی
پلڑے میں ڈال دیئے جائیں تو خیر و شر کا معیار ہی باقی نہ رہے۔ ہاں اتنی بات ضرور
ہے کہ آپس میں فساد سے اجتناب ضروری ہے۔ ایسی صورتوں سے گریز کرنا چاہیئے
جن صورتوں میں خواہ مخواہ مسلمانوں کے درمیان افتراق پیدا ہوتا ہے۔ جہاں تک معتقدات
کا سوال ہے اس پر بڑی بحثیں ہو چکی ہیں سینکڑوں کتابیں بھری پڑی ہیں جس کو شوق ہو

معلومات حاصل کرے۔

بہرحال اہل سنت وجماعت کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر سب کچھ قربان کردے ایمان کے کاملیت کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کی حد تک محبت۔۔اور عظمت ہے۔ دانستہ یا ناً دانستہ قولاً یا فعلاً اشارۃً یا کنایتہً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذرہ برابر توہین یا ان کو کسی صورت سے تکلیف پہنچانے کی نیت سے کوئی کام کرنا ایمان کے دائرے سے خارج ہونا ہے اور اسطرح گمراہی کے رستے پر چلنے کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے اہل سنت کا حج اس وقت تک مکمل ہوتا ہی نہیں جب تک کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ انور کی زیارت کی نیت سے مسجد نبوی میں حاضر نہ ہولں اسی نماز اور عقائد کے ضمن میں حضرت شیخ نے فرمایا کہ اسلام دراصل حضور کی غلامی کا نام ہے۔ خدا کے منکر دنیا میں بہت کم ہیں اور خدا کا نام بھی لیتے ہیں اصل بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی ہے۔ فرمایا۔ ہندوستان میں جب سے انگریز داخل ہوئے اسلام میں نئے نئے فتنے اٹھائے گئے بدعقیدوں کے مختلف فرقے انگریزوں کے بعد ہی پیدا ہوئے کسی نے وہابیت کی شکل اختیار کرلی کسی نے قادیانیت کا روپ دھار لیا کوئی پرویزی بن بیٹھا۔ کوئی تبلیغ کے نام پر گمراہ کرنے لگا کسی نے خالص اسلام کا لیبل لگا کر مسلمانوں میں تفرقہ ڈالا۔ ورنہ اس سے پہلے عالمگیر کے دور تک خالص اہلسنت وجماعت کا غلبہ تھا اور انھیں کی حکومت تھی اور انھیں کا قانون عالمگیری کی شکل میں نافذ تھا۔

۱۴۰۰ سو سال سے مسلمانوں کا عقیدہ چلا آرہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کا سایہ نہیں تھا۔ اب اتنے دنوں کے بعد بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ حضور کے جسم کا سایہ تھا۔

میرا نواں سوال تھا۔

حضرت علمائے اہلسنت جمعیت علمائے پاکستان کے پلیٹ فارم سے عوام اہل سنت کے ساتھ پاکستان میں نظام مصطفٰے کے عملی قیام کی تحریک چلا رہے ہیں اور اسوقت علامہ شاہ احمد نورانی کی قیادت میں سواد اعظم بڑے زور و شور سے آگے بڑھ رہا ہے۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں:؟

فرمایا میں اس تحریک سے مطمئن ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ پاکستان اسلام کا صحیح معنوں میں گہوارہ بن جائے اسوقت پاکستان کے تمام علماء اور مشائخ کو چاہیئے کہ وہ

اس تحریک میں عملی طور پر شامل ہو جائیں۔

فرمایا کہ مولانا نورانی نے بڑا کام کیا ہے بالخصوص قادیانیوں کے سلسلے میں زبردست جہاد کیا ہے۔ میں ان کو اور ان کے ساتھ تمام علمائے اہلسنت کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مسلمانان پاکستان کو مولانا نورانی اور علمائے اہلسنت کی قیادت میں جمع ہونے اور ان کے اتباع میں کام کرنے اور تحریک نظام مصطفےٰ کو کامیاب بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

اسی ضمن میں حضرت شیخ نے فرمایا کہ بعض کم فہم لوگ بے دینوں کے چکر میں پھنس کر سیاست کو مذہب سے الگ کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے سیاست مذہب اور دین کا جز ہے۔

میرا آخری سوال تھا۔ حضرت آپ کی کیا رائے ہے اگر وقتی طور پر چند بنیادی باتوں پر ظلم کو ختم کرنے کے لئے بدعقیدہ اور بے دین لوگوں سے اتحاد کر لیا جائے۔؟

فرمایا کہ اتحاد میں اگر مسلمانوں کا عام مفاد ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو جواز نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر عامۃ المسلمین کا مفاد وابستہ نہ ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور عظمت میں کوئی بات خلاف سرزد ہونے کی امید ہو تو اتحاد بالکل ناجائز اور حرام ہے۔

وقت کافی ہو چکا تھا حضرت کے چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ میں نے گفتگو ختم کرتے ہوئے آخری بات یہ بھی پوچھ ڈالی کہ حضرت کے خلفا مجاز کن کن ملکوں میں ہیں اور کتنے ہیں۔ فرمایا ترکیہ، مغرب، شام، ہندوستان اور پاکستان میں متعدد افراد ہیں جو درس و تبلیغ ... کر رہے ہیں۔ میں نے گفتگو ختم ہی کی تھی کہ حضرت کے پاس شام کے ایک بزرگ عبداللہ ابن ابراہیم قادری اور ایک نعت خوان محمد خیر بن علی حنبل دمشقی تشریف لائے۔ حضرت شیخ کی قدمبوسی کے بعد ادب سے بیٹھ گئے۔ حضرت نے خیریت دریافت فرمائی اور دمشق کے لوگوں کے متعلق پوچھا یہ حضرات عربی میں گفتگو فرما رہے تھے۔ محمد خیر بن علی حنبل دمشقی نے عربی میں ذوق شوق سے ایک نعت سنائی حاضرین پر ایک وجد کا عالم طاری ہو گیا حضرت شیخ رونے لگے ایک عجیب پرکیف سماں تھا اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسا ذوق عطا فرمائے۔ محفل برخاست ہوئی حضرت شیخ خود بڑی مشکلوں سے اٹھے اور ساتھ پلنگ بچھا ہوا تھا اس پر لیٹ گئے حضرت علامہ نورانی اسی کمرے میں قالین پر ایک طرف لیٹ گئے ان کے پاس ہی حضرت مولانا عبدالستار خاں نیازی بھی آرام فرمانے لگے اور میں سب کو سلام کر کے رخصت ہوا۔

جنگ آزادی کا عظیم سپاہی

دلاور جنگ

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی

(محمد اللہ یار اشرفی)
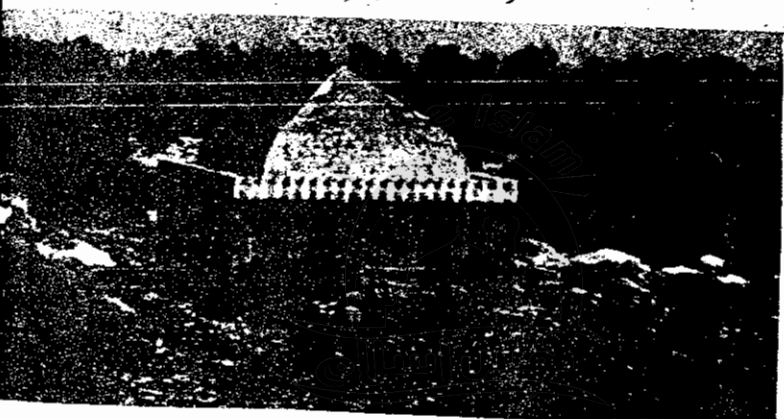
شاہجہاں پور کے قریب موضع گنج میں جنگ آزادی کے ایک عظیم سپاہی دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کا مزار پر انوار ہے جہاں ہر سال عرس ہوتا ہے جنکا تذکرہ جمیل ماضی کا سینہ چیر کر آج بھی بہادری، شناوری، دلیری و جواںمردی اور اپنے اقتدار و عظمت کا سکہ چلا رہا ہے۔ اقتدار و عظمت اور حریت کے لاکھوں قصے دنیا نے پڑھے ہیں۔ عزت و شہرت کے بیشمار ستارے اس طرح آسمان ہستی پر ضوبار ہوئے کہ فضا جگمگا اٹھی۔ لیکن دست قدرت نے تاریخ کا ورق پلٹا تو ستارے جھلملا اٹھے۔ بالآخر وہ دنیا کی نگاہوں سے چھپ گئے اور اس طرح کہ دنیا کے حافظہ میں سے ان کی یاد تک مٹ گئی۔ ہزاروں شداد، فرعون اور قارون اس اسٹیج کے پردہ پر ابھرے جن کی دولت اور حکومت کی عظمت اور ہیبت سے کائنات کا دل کانپ اٹھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تصویروں کے نقش دنیا کی نگاہوں سے اس طرح اوجھل ہو گئے

کہ اب تاریخ میں صرف انکی عبرت انگیز داستانیں باقی رہی ہیں۔ کہیں کہیں انکی حکومتوں کے کھنڈر بھی ملتے ہیں۔ جو خود انہی کے ظلم و کبر پر ماتم کناں ہیں۔ دنیا کا ہر نقش دھوکہ ہے اور دھوکہ کبھی باقی نہیں رہتا۔ بقائے دوام کی دولت تو صرف ذات واحد ہی کے لئے ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ ہاں زندہ جاوید رہنے کی سعادت اور اس بقائے دوام کا پرتو ان سعید روحوں کو بھی ملتا ہے جنکی ہستی کی موج خدائے واجب الوجود کے اتھاہ سمندر میں فنا ہو جاتی ہے۔ موج سمندر میں مل جائے تو سمندر ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ خاصانِ خدا شہدائے عظام اور اولیائے کرام دریائے ہستی کی آبدار و تابناک موجیں ہیں جو حی القیوم کے دائم الوجود سمندر میں مل گئی ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گی۔ ان شہدائے عظام اور اولیاء اللہ کی حیات کو ابدی وجود کے حلہ زرنگار سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان حدیث قدسی کے ذریعہ کیا۔ یہ ہی نہیں بلکہ خدائے برتر کا کلام

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیا

عند ربھم یرزقون۔

اس پر گواہ ہے۔ اور

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل

احیاءٌ ولکن لا تشعرون۔

اس پر شاہد ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو ملک و ملت، دین و مذہب کی سرفرازی و سربلندی اور اسکی پائندگی و تابندگی قدر و منزلت، عزت، عظمت، شان و شوکت کے لئے اپنے گرم گرم لہو سے آہنی حصار کھینچے ہیں۔ جو اپنے کو مٹا کر قوم کو حیاتِ جاوداں بخشنے میں خود بظاہر فنا ہو کر قوم کو دوام و بقا عطا کرتے ہیں۔ خود مٹی میں مل کر قوم کو چاند تاروں سے بھی زیادہ بلندی اور تابانی عطا کرتے ہیں۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی بھی اسی کارزارِ آزادی کے ان مخلص اور بے لوث قائدین میں سے ایک ہیں جو اپنی خداداد قابلیت اور لافانی استقامت و ہمت کی بدولت ہر طلبگار حریت کے دل کی دھڑکن ہیں۔ جب یہ نبرد آزما پیکر شجاعت اٹھا تو ہر طرف گھمبیر تاریکیاں چھا چکی تھیں اور بپھری ہوئی طاغوتی و شیطانی طاقتیں اپنی تمام تر درندگی و سفاکی کے ساتھ سر ابھارے ہوئے تھیں۔ جور و استبداد کے تاریک و مہیب بادل چہار گونہ عالم پہ چھائے ہوئے تھے۔ قہر و غضب کے تند و تیز، ہلاکت آفریں، جان لیوا طوفان برپا تھے جھلسا دینے والے سموم آتشیں بگولے چلنے لگے تھے۔ سفاہت و ذلالت، انسانیت کا خون بہانے

لگی تھی ۔شرافت و آدمیت کا احترام ختم ہو رہا تھا۔موت کے دہشت انگیز سائے متحرک رہے تھے اور بے حیائی و بے غیرتی کا عروج تھا شرافت کا نام سیاست کے لئے استعمال ہونے لگا تھا بے ضمیری اور بے راہ روی کی راہ عام تھی ۔اور قوموں کی دبی لٹی ، گھسی پسی آرزوئیں کراہنے لگیں ہر طرف ظلم و ستم کے کالے کالے ڈراؤنے دھوئیں منڈلانے لگے تھے ۔شیر دل سلطان ٹیپو کی آہنی دھار ٹوٹ چکی تھی اور بہادر سراج الدولہ غداروں اور سازشیوں کے مکر و فریب کا شکار ہو چکے تھے ۔دہلی کی عظیم مغلیہ سلطنت لال قلعہ کے آہنی پنجرے میں محصور آخری ہچکیاں لے رہی تھی اور سلاطین اودھ کے دم اکھڑ چکے تھے ۔ان کے اٹھتے ہی شمع حریت کے پروانوں نے کروٹیں بدلیں ۔قوم کے غیرت مند و خود دار بانکے جیالے سپاہیوں کے سرفروشانہ نعروں سے ظلم و استبداد کی بنیادیں تھرا اٹھیں ۔اللہ کے شیروں کی بے باک گرج نے وطن عزیز کے ذرہ ذرہ میں ایک بار پھر آزادی کی تڑپ پیدا کر دی ۔ان میں سب سے پہلے جو "خونی میدان" میں آئے وہ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ہی تھے ۔جن کی پیہم شجاعانہ یلغار نے فرنگیوں کے دانت کھٹے کر دیے اس کے باوجود انھیں اقرار کرنا پڑا کہ

> "مولوی ایک بڑا ہی تجربہ کار شخص تھا ۔اس کے ساتھ کوئی فخر کے ساتھ یہ سچا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ میں نے کالن کیمبل کمانڈر انچیف ہند کو دوبارہ میدان میں شکست دی ۔مولوی احمد اللہ شاہ سچا محب وطن تھا اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو خراب نہ کیا ۔اس نے بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں ان بدیسیوں کے ساتھ جنگ کی جنھوں نے اس کا وطن چھین لیا تھا ۔ہر ملک کے بہادر لوگوں کو مولوی احمد اللہ شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے "

(واجد علی شاہ اور ان کا عہد ۔رسالہ مصنف دسمبر ۱۹۴۳ء ریلیس کا اعتراف مقالہ انتظام اللہ شہابی)

اس کے ساتھ ہی ایک اور بڑے انگریز جنرل ٹامس کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

> "اگر وطن کے محب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے جو غلطی سے برباد ہو گئی ہو سازشیں کرے اور لڑائیاں کرے تو یقیناً مولوی اپنے ملک کا محب

صادق تھا۔ اس نے کبھی اپنی تلوار کو سازشی ...
خون آلود نہیں کیا وہ بہادرانہ معرکہ آرائی ...
اجنبیوں کے ساتھ جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا ...
ساری قومیں اس مولوی سے پیار کریں گی کہ وہ ...
کا جو شجاعت و صداقت کے تقاضوں میں ...

(واجد علی شاہ اور ان کا عہد ص ۳۸۸-۸۹ غدر کے چند علماء ص ...)

یہ وہ ناقابل تردید شہادتیں ہیں جو اپنوں کی نہیں بیگانوں ...
انکی ہیں جو یقیناً دشمن قوم کے افراد تھے جن سے کسی خیر کی توقع ...
دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی جنگ حریت اور کار ...
مگر یہ پیکر شجاعت اور دلیری و شناوری کا خوگر عزم و ہمت ...
جس نے ہر مورچہ ہر میدان میں فرنگیوں کی تربیت یافتہ ماہر افواج ...
جسے میدان جنگ میں بدیسیوں کی دہکتی شعلہ بار گولیاں بھی زیر بار ...
نعرۂ حریت بلند کرتا رہا جو قدم قدم پر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ...
بھی شرمندہ ہو کر رہ جاتی۔ وہ مولوی جسے اپنوں اور پرائیوں کی ...
جنکی تلوار اکناف عالم میں لہرائی جن کا ضمیر کبھی منافقت و ریاکاری ...
اندیشی کی ناپاک غلاظت سے آلودہ نہیں ہوا جو کسی امیر نواب ...
سر کو خم نہیں کیا اور انکی وہ درخشاں و روشن پرنور دمکتی ہوئی ...
کسی کے آگے نہ جھک سکی جنھوں نے تمام طاغوتی و باطل قوتوں کو ...
سازشی تاریک سینوں کے چیتھڑے اڑا دیئے جنکے بے پناہ سیل ...
بند نہ باندھا جاسکا۔ وہ جنگ آزادی کے دوسرے مخلص جانبازوں کی ...
کے نوک قلم کا شکار ہو گیا اور تذکرہ نگاروں، سوانح نویسوں کی ...
ستارے کو بحر ظلمات کی اتھاہ تاریکیوں میں۔۔۔ دھکیل دیا بلاحظہ ہو

"ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں علماء کا جس ...
کارنامہ ہے اور جذبہ وطنیت کا مظاہرہ ہے اس کی ...
کسی دوسری جگہ نہیں ملتی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ...
اور انقلاب و ابتلا کے خلاف سب سے پہلے ...

آواز مخالفت اٹھی انھیں علماء میں سب سے پہلا فرد
جو سربکف میدان عمل میں آیا وہ دلاور جنگ مولوی احمد
اللہ شاہ مدراسی تھا ان کے ہمنوا کثیر القدر علماء اٹھے جو
ایک طرف درس و تدریس، تصنیف و تالیف میں لگے
ہوئے تھے تو دوسری طرف سیاست ملکی میں حصہ لے رہے
تھے مگر افسوس کے ان بزرگوں کے سیاسی حالات
سے تذکرہ نویسوں نے چشم پوشی کی "

(غدر کے چند علماء ص ۳)

لیکن اس سلسلے میں جو چیز قطعیت کے ساتھ نظر انداز کی گئی ہے وہ ہے مجاہدین کا ذکر مولوی ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ میں انہیں "لچا اور شہدا" قرار دیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے سرسید احمد نے اور دوسرے لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات یا تو ان مجاہدین کے وجود سے ناواقف تھے یا اگر واقف تھے تو نہ صرف یہ کہ انھیں اہمیت نہ دیتے تھے بلکہ ان کے جذبہ کردار و عمل کا استخفاف کرتے رہتے تھے! ان کے انداز میں اتنی بیدردی اور پرعنا داجنبیت ہے کہ اسے دیکھ .... دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ملت اسلامیہ وملت بیضاء کے بیٹوں کو سب سے زیادہ نقصان منافقین ہی سے ہوا ہے۔ لیکن ان نام نہاد مورخین نے اور ان کے رفقائے ولی لغمت یعنی انگریزوں نے دستاویزی ثبوت کو سامنے رکھ کر جو حالات لکھے ہیں جو واقعات قلمبند کئے ہیں جن کیفیات کا جائزہ لیا اور تجربہ کیا ہے انھیں پیش نظر رکھیں تو ان کے مخالفانہ، معاندانہ، غیر مہذب اور ناشائستہ الفاظ لب و لہجہ کے باوجود بین السطور سے ان مجاہدین کا روشن، بلند اور سراسر قابل رشک کردار صاف جھلکتا ہے۔

"جیسے تیرہ و تار رات میں بجلی چمک جاتی ہے جیسے گھنے
بادلوں کی اوٹ سے سورج جھانکتا ہے جیسے مایوسی
کے اندھیرے میں امید کی کرن پھوٹتی ہے۔

(بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد)

کتاب بڑی دلچسپ ہے اور بڑے لرزہ خیز الفاظ و حوادث پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں ایک بڑی کمی بھی ہے۔ مولانا نے سب کچھ لکھا ہے لیکن رفقائے زنداں کے ذکر سے بالکل

گریز ہے۔ حالانکہ اس دور میں چوٹی کے مسلمان ان کے ساتھ ابتلا کی زندگی بڑے استقلال اور وقار کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔ حق بات یہ ہے کہ مولانا پر اتنا اور تحریک وہابیت کا جوش اس قدر نمایاں اور غالب تھا کہ وہ اپنے اور اپنی تحریک کے سوا کسی اور چیز کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص۱۳۶)

فاضل مصنف جناب رئیس احمد جعفری کی مذکورہ بالا رائے مولوی جعفر تھانیسری وغیرہ کی کتاب کے متعلق ہے جو تاریخ عجیب کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ جو سید احمد کی تحریک کے باقیات میں سے تھے جہاں مصنفین و تذکرہ نگاروں نے اتنی جانبداری بلکہ ایک حد تک بد دیانتی سے کام لیا ہو وہاں کسی مخلص سپاہی کے متعلق کیا مواد مل سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں لوگوں (جو کہ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کو تکفیر کے فتوے مہیا کرتے ہیں) کے دوستوں کے حوالہ جات کو مد نظر رکھیں۔ مثلاً۔

"دہلی اور میرٹھ کی خبریں جب لکھنؤ پہنچیں تو وہاں بھی حریت کے شیدائیوں نے آزادی کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ مرزا برجیس قدر کی بادشاہت کا اعلان کرانے اور لوگوں کو آزادی وطن کے لئے جہاد میں شامل ہونے کے لئے تبلیغ کرنے والا بھی ایک عالم ہی تھا اور یہ تھا صوفی احمد اللہ شاہ اس کے متعلق سر تھامس اسٹینس نے لکھا ہے کہ صوفی احمد اللہ شاہ عظیم المرتبت بے باک، جسارت و عزم محکم کا مالک تھا اور ان تمام میں بہترین سپاہی تھا۔"

آگے چل کر پھر لکھا ہے کہ:۔

"جب دہلی کے گلی کوچوں میں جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی اور بازاروں میں لاشوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اگر اس وقت ایک طرف مخدوم شاہ محمد جیسے عالم اپنے مریدوں سمیت جہاد کے خلاف تھے تو دوسری طرف مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا فضل امام خیرآبادی۔ مولانا امام بخش صہبائی، مولوی [illegible] مفتی عنایت احمد کاکوروی

مفتی مظہر کریم دریا آبادی، مولانا احمد اللہ شاہ وغیرہ جیسے
سینکڑوں عالم فاضل ایسے تھے جو جنگ آزادی میں برابر
کے شریک تھے اور جب مغلیہ خاندان کا آخری چراغ بجھ گیا
تاج وتخت چھن گئے اور وطن کے جاں نثاروں کو چن چن
کر گولیوں کا نشانہ بنایا جانے لگا اس میں علما بھی تھے۔
(باغی ہندوستان)

افسوس صد افسوس سر دھننے کا مقام ہے کہ وہ انگریز جسکی اسلام و مسلمان دشمنی آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ اس نے تو کچھ حقائق درج کیئے لیکن مسلمان مورخین نے غفلت ولا پرواہی سے ان کے کارنامے کو پس پشت ڈال دیا۔ اس قسم کی حرکات و سکنات انھیں لوگوں سے سرزد ہو سکتی ہیں جنھیں آخرت کی باز پرس کا خیال جاتا رہا ہو اور اس دنیائے فانی کو عیش و دوام کی جگہ سمجھ لیا ہو۔ یہ حقیقت آج نہیں تو کل میدان حشر میں عریاں و بے نقاب ہو کر رہے گی جبکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عدالت میں لاکھوں فریاد رس مسلمانوں کے ہاتھوں میں ان مورخوں کے دامن ہوں گے اور سب یک زبان ہو کر پوچھیں گے کہ گندم نما جو فروش ساہوکار دل کی تجارت و قومی غداری اور اسلام دشمنی کی تصاویر کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے نوک قلم کا رخ موڑ لیا تھا اور علمائے حق کے مجاہدانہ کارناموں سے چشم پوشی کی تھی۔ کاش! یہ مورخ اپنی وسعت نظر سے کام لیتے اور سوچتے کہ یہ تاریخ ہے کسی سیاسی جماعت کا دفتر نہیں۔ تاریخ اپنی گرفت سے کسی کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اب بھی وہ لوگ جو ٹیل سے پچاس پچاس ہزار روپے بطور نذرانہ یا ملت فروشی کے عوض قبول کرتے رہے اور روپلوں کی تھیلیوں کے سہارے جنگ لڑے ہوں ان پر جہاد کا لیبل لگا کر جنگ آزادی کا ہیرو قرار دیتے ہیں جنکا ماضی تو در کنار حال ہمارے سامنے ہے کہ کبھی سوشلزم میں کبھی باہر، کبھی اقتدار میں کبھی احتقار میں، کبھی کرسی پر اور کبھی کرسی کے نیچے ملت اسلامیہ کی تاریخ کا یہ ایسا دلگداز و عبرت انگیز باب ہے جسے دیکھکر مرد مومن کی گردن شرم و غیرت سے جھک جاتی ہے اور بے پناہ مسلمانوں کی بیچارگی و کس مپرسی پر اسکی آنکھ آٹھ آٹھ آنسو بہاتی ہے اور ان مورخین کی بے اعتنائیوں پر ماتم کناں ہے۔ انشاء اللہ ہم آئندہ کسی مضمون میں واضح کریں گے کہ ان شمع آزادی کے پروانوں کا ذکر نہ کرنے میں کون سا جذبہ کار فرما تھا تاکہ حقائق واضح ہو کر سامنے آسکیں ؎ یہ قصۂ لطیف ابھی ناتمام ہے۔ جو کچھ بیان ہوا ہے وہ آغاز باب تھا۔

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ۱۲۰۴ھ میں چنیاں پٹن (تعلقات مدراس) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نواب سید محمد علیؒ جنہیں سلطان شہید ٹیپو علیہ الرحمتہ کا قرب خاص حاصل تھا۔ پہلی ہی نظر میں اس نو مولود کی آب دار پیشانی کے دمکتے ستارے کو پہچان لیا تھا۔ جسکے عزم و حوصلہ کی آہنی چٹانوں سے حوادثات کی ہزاروں موجیں ٹکرا ٹکرا کر پسپا ہونے والی تھیں۔ آپ کی تربیت پر خاص توجہ دی گئی اور وقت کے ساتھ ساتھ آپ علوم ظاہری و باطنی میں ایک خاص مقام حاصل کر گئے۔ کچھ مدت آپ نے شرق و غرب کی سیاحت کی اور فریضہ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد پیر قربان علی شاہ کے دست حق پرست پر بیعت کی اس کے بعد گوالیار میں عارف کامل حضرت پیر سید محراب شاہ قلندر سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور سر فروشی و جہاد پر بیعت کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نعرۂ حریت کی پر جلال گونج سے ستمرانوں کے دل تھرا اٹھے۔ آگ اور خون کا کھیل شروع ہو گیا۔ بدمستوں کی تصوراتی دنیا کانپنے لگی۔ سارا عالم لرز اٹھا۔ ظلم و جبر کی آندھیاں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ حق و صداقت حریت و آزادی کا پرچم لہراتے ہی باطل جھنجلا اٹھا۔ پہاڑوں کے تاریک غاروں میں منہ چھپائے شیاطین اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ٹوٹ پڑے۔ ظلم و طغیان کی آندھیوں نے ہجوم کیا آہوں کی کراہوں چیخوں سسکیوں سے فلک کی نیلگوں پنہائیوں میں لرزہ پیدا ہو گیا۔ جدال و قتال و مبارزت کا دور شروع ہو گیا ظلم و ستم کی چکی چلتی رہی حق پرستوں، حریت کے متوالوں کے صبر و تحمل کا امتحان ہوتا رہا۔ باطل گروہ ابھرتے رہے۔ حق کے متلاشی حریت کے پروانے ٹکراتے رہے۔ تاریکی ہجوم و یلورش کرتی رہی اور روشنی دفاع کرتی رہی۔ فولادی ہتھیار جھنکتے رہے۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹیں بلند ہوتی رہیں۔ پھر ۱۸۵۷ء کی الم انگیز خونی داستان اپنے عروج پر پہنچ گئی دیگر ملت اسلامیہ کے ضو فشاں ستاروں کی مانند مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی جانتے تھے کہ جہاں بزدلی ہے وہاں شکست ہے جہاں ہمت و جرأت ہے وہاں فتح و نصرت ہے کامیابی و کامرانی ہے وہ مست ہاتھی کی طرح جھوم کر آندھی کی طرح جھلا کر بادل کی طرح گرج کر اپنے وطن و دین کی حفاظت و نگہداشت کے لئے نعرۂ تکبیر و رسالت لگاتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

انگریز ہندوستان میں امنیوں کی گود کھا کر نہ آئے تھے بلکہ عقل و دانش کی عینک انکی آنکھوں پر لگی ہوئی تھی۔ ایک پردیسی اور سات سمندر پار کی قوم کو ہندوستان کے باشندوں پر راج کرنا تھا۔ اس لئے فنکارانہ چابکدستیوں سے کام لیتے ہوئے اس نے بھارت کی مسلم سیاست پر اپنی نگاہیں جمائیں کیونکہ تخت و تاج مسلمانوں سے لیا گیا تھا۔ اس لئے سفید چمڑے

والوں کو مسلم سیاست ہی سے اندیشہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ شمع رسالت کے پروانوں کے جذبۂ حریت کو ناممکن نہیں بنایا جا سکتا۔ محبت مصطفےٰ کا طوفان جوان کے قلوب میں جاگزیں ہے زنجیروں میں نہیں جکڑا جا سکتا۔ نورِ ایمان کی تجلیات کو رسیوں میں نہیں باندھا جا سکتا رات کی تاریکی کو صبح کا اجالا اور آگ کے انگارے کو شاداب پھول نہیں کہا جا سکتا۔ ان حریت کے شیدائیوں کا مقصد ونصب العین یہ تھا کہ رینگتے ہوئے حقیر کیڑے کی طرح حرکت کرنے اور سانس لینے کا کام زندگی نہیں۔ آزادی واختیار سے محروم ہو کر پامال گھاس کی مانند رہنا انسانیت کی موت ہے۔ جو لوگ ہمدردی اور اتفاق ویگانگت کے ساتھ زندگی بسر کرنا نہیں جانتے ان کی قسمت کے نوشتہ پر دائمی ذلت ورسوائی کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ وہ آزاد دنیا میں غلامی کے لئے پیدا ہوتی ہے اور آخری سانس تک غیر کی غلام رہتی ہے۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کی دوربینی نے بھانپ لیا کہ مسلم قوم صرف غلامی مصطفےٰ کے لئے ہے اور اسی میں اسکی توقیر وعظمت ہے۔ ان کا عزم یہ ہے کہ مسلم قوم جیئے غلام بنکر نہیں بلکہ آقا بنکر گیدڑ کی طرح نہیں بلکہ شیر کی طرح .... مسلم قوم کے بازوؤں میں طاقت کا طوفان آستینوں میں بجلیوں کا سیلاب موجود تھا وہ اٹھے۔ مولانا احمد اللہ شاہ نے انکو درس غلامی مصطفےٰ کا ایسا دیا کہ برطانوی سامراج کی دلدوز کراہیں لامحدود وسعتوں میں تحلیل ہو کر رہ گئیں۔ پھر

مولانا احمد اللہ شاہ جنرل بخت کے دست راست بنکر دہلی پہنچے اور فرنگی افواج کی دھجیاں بکھیر دیں۔ شجاعت وشہادت کی بجلیاں کڑکیں جور وستم کی گھٹائیں چھٹ گئیں سب طاغوت کے پرخچے اڑا دیئے اور قدم قدم پر آگ وخون کا ناقابل عبور حصار کھینچ دیا۔ مگر قسمت نے یاوری نہ کی اپنوں اور بیگانوں کی سازشوں نے قدم چومتی کامیابی وکامرانی کی بساط الٹ دی اور آپ آگرہ جا پہنچے۔ پرجوش عوام نے اس مرد مجاہد کو ہاتھوں ہاتھ لیا وہاں آپ کی مقبولیت ومحبوبیت کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک محفل میں کئی کئی ہزار نفر کا شامل ہوتے اور پھر آگرہ بھی اس خونی طوفان کی لپیٹ سے نہ بچ سکا اور طلبگارانِ حریت استبداد واقتدار کے ہیبت ناک پہاڑ سے ٹکرا گئے۔ اس کے ساتھ کانپور، فیض آباد، شاہجہاں پور میں آزادی وحریت کے پرجوش نعرے بلند ہوئے اور قدم قدم پر لاشوں کے انبار لگ گئے اور کچھ ایسے زلزلے لہرائے کہ دشمن یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

"وہ بڑی قابلیت رکھتا تھا۔ وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف

نہیں کھاتا تھا۔ وہ اپنے عزم میں پکا اور ارادہ میں مستقل تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہ تھا۔

اس مولوی نے ۱۸۵۷ء میں چپاتیاں تقسیم کرائی تھیں اور فتنہ انگیزی کے لئے سارے اودھ میں کاغذ دوڑائے تھے۔ اس جرم میں گرفتار ہوا اور اسے پھانسی لگنے کا حکم ہوا مگر پہلے اس سے کہ اسکی تعمیل ہو اودھ میں غدر ہو گیا اور جیل خانے کے فرش سے اٹھ کر سلطنت کے عرش پر پہنچ گیا۔ یہ فخر مولوی کو حاصل ہے کہ اس نے سر کولن کو میدان جنگ میں دو مرتبہ ناکام رکھا۔

(واجد علی شاہ اور ان کا عہد ص ۳۸۷ غدر کے چند علماء ص ۳۰۔۲۹)

لکھنؤ میں مولانا کی جانبازی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ نواب واجد علی شاہ کی حقیقت عضو معطل سے زیادہ نہ تھی۔ لہٰذا حریت پسندوں نے ان کے برجیس قدر کو تخت نشین کیا اور ان کی ماں حضرت محل برجیس قدر کی نگراں مقرر ہوئیں۔ لیکن انقلاب کی اصل روح مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ہی تھے۔ آپ کے ساتھ ہر وقت پروانوں کا جم غفیر رہتا۔ آپ نے سر ہنری لارنس کو شکست دی اور ریذیڈنسی کا محاصرہ کیا اور اسی محاصرہ کے درمیان سر ہنری لارنس مارا گیا۔ مگر بدقسمتی نے یہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ سازشی اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہوئے اور شیعہ سنی فساد اٹھ کھڑا ہوا جس نے بہادروں کے طوفانی جذبات فنا کر دیئے۔ پے درپے ہونے والی شکستوں اور ناکامیوں نے ہر شخص کو دل برداشتہ کر دیا تھا۔ حضرت محل برجیس قدر، ہیرے جواہرات کے انبار لے کر نیپال چلی گئیں اور لکھنؤ پر انگریزوں کا تسلط مکمل ہو گیا۔ مگر وطن عزیز کے اس سر فروش سپاہی نے شکست کی ذلت تسلیم نہیں کی۔ وہ ہر قدم پر جاں نثاری و جانبازی کے مظاہرے کرتا رہا۔ اس کا عزم ناقابل تسخیر تھا اور اس کے ارادے غیر متزلزل تھے۔ مولانا نے مختلف مقامات پر ٹھہر ٹھہر کر مورچے بنائے اور بے جگری سے انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شاہجہاں پور جا پہنچے۔ دہکتی دہکتی گولیوں کا یہ خوفناک کھیل جاری رہا اور یہ مرد مومن موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے رہے حالات کی ناموافقت نے مولانا کو فیروز محمدی کی طرف دھکیل دیا جہاں مولانا نے تاج شہریاری سر پر رکھا اور اپنا سکہ جاری کیا۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ

بالآخر وہ وقت آگیا جس سے کسی کو مفر نہیں۔ مولانا ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ کو ہاتھی پر سوار ہو کر پوریاں جا پہنچے تاکہ غدار اور سازشی راجہ سے چھپے ہوئے انگریزوں کو چھین سکیں۔ مگر جب مولانا وہاں پہنچے تو قلعے کا دروازہ بند تھا راجہ اور اس کے بھائی۔ اور دوسرے مسلح ملازمین دیوار کے ساتھ چھپے کھڑے تھے آپ نے خطرات سے بے پرواہ ہو کر فیل بان کو حکم دیا کہ ہاتھی کو قلعہ کے دروازے سے ٹکرا کر قلعہ کو توڑ ڈالے مگر دروازہ ٹوٹتے ہی مولانا پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی اور پوریاں کے راجہ کے بھائیوں نے آگے بڑھ کر وہ با جبروت سر کاٹ لیا جو خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکا تھا۔ پوریان کے راجہ جگن ناتھ نے وہ عظیم المرتبت سر رومال میں باندھا اور اپنے ولی نعمت شاہجہاں پور کے فرنگی مجسٹریٹ کی خدمت میں پیش کر دیا اگرچہ جگن ناتھ کو پچاس ہزار روپے انعام میں مل گئے مگر اس کے ساتھ ہی وطن عزیز کی بدقسمتی پر سیاہ بختی کی آخری مہر ثبت ہو گئی۔ مولانا کا سر کئی روز تک کوتوالی کے دروازے پر لٹکتا رہا۔ البتہ ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا دیا گیا۔

قارئین حضرات! مولانا کی شہادت کسی ایک فرد ایک خاندان ایک قبیلہ ایک نسل ایک رنگ و روپ کی حیات و زندگی کا سبب نہیں بنی بلکہ ہر محکوم و مظلوم، مجبور و مقہور کیلئے حیات ابدی کا پیغام بنی۔ اور ان کے لہو کی سرخی تمام تر روتی، کراہتی، چیختی، چلاتی اور سسکتی بلکتی انسانیت کے لئے حیات و زندگی، روشنی و تابندگی کا سبب بنی غیر مسلم، اغیار وہابیہ دیابنہ وغیرہ تاریخ پر غبار ڈالنے کی مولانا احمد اللہ شاہ کے مجاہدانہ کارناموں پر دھول جھونکنے کی ہزار ہا ناپاک سعی کریں مگر اس زندہ جاوید ہستی کا نام صفحات تاریخ سے کبھی نہیں مٹ سکتا بالفرض تاریخ کو نذر آتش کر دیا جائے تو انسانی قلوب سے مولانا کی عظمت کو کون چھین سکتا ہے۔ جب تک اس آسمان کے نیچے اور سطح زمین پر انسان کی آبادی ہے اس وقت تک مولانا کا پرچم حریت لہراتا رہے گا ؎

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

ناظرین کی انصاف پسند اعتماد نگاہ پر بھروسہ ہے کہ انھوں نے اس مختصر تحریر کے بعد

اپنے قلب وضمیر کا فیصلہ کر لیا ہو گا کہ علمائے اہلسنت نے ۱۸۵۷ء کی ہوشربا جنگ میں کس قدر نمایاں کردار ادا کیا۔ اس جنگ کے کفن بر دوش رہنما مولانا احمد اللہ مدراسی جنھوں نے سامراجیت کو کچلنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ انگریز کے ظلم و تعدی کا نشانہ دکینہ پرور سازشی گروہ کا شکار ہو کر گولیوں کی بوچھاڑ سے پوریاں میں جام شہادت نوش کیا جنکی قبر انور پر آج بھی رحمتوں کے بھیل برس رہے ہیں اور ان کی سرفروشی اور جاں نثاری آج بھی اہل عشق و محبت اور حریت کے شیدائیوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ آزادی کے اس عظیم ہیرو کو گمنامی کے پردے میں چھپایا جارہا ہے اور لچا و شہداء کیکر نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اے درد دل رکھنے والے غیور شمع رسالت کے پروانو! عدل و انصاف کے گلے پر چھری چلتے دیکھ کر اب بھی اس دور میں آپ کے رگ و پے میں حریت و آزادی کے خون نے جوش نہیں مارا اس میں حرارت پیدا نہیں ہوئی۔ عشق مصطفےٰ کی حدت موجزن نہیں ہوئی۔ محبت مصطفےٰ کی وارفتگی نے نظام مصطفےٰ کی تحریک کا سپاہی نہیں بنایا۔ دل و دماغ کی غیر متحرک دنیا میں تلاطم پیدا نہیں ہوا۔ اگر اقرار ہے تو آؤ اس انگریز ہندو سامراج سے نجات حاصل کریں۔ ان غیر مسلموں سے نبرد آزما ہوں جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر منصب رسالت کی تحقیر و تذلیل میں مصروف ہیں، علم حریت تھامیں ہزاروں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے صرف آقائے دوجہاں کی غلامی حاصل کریں۔ ان غیر مسلموں کے چیتھڑے اڑا دیں جنھوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی ہو۔ مسلمانوں کی لاشوں کو، درختوں سے لٹکوا کر کووں اور چیلوں سے نچوایا ہو۔ مساجد کو گھوڑوں کی لید اور گوبر سے نجس کیا ہو منبر رسول پر بٹھا کر گاندھی سے مسلمانوں کے خلاف آندھی چلوائی ہو۔ ہاں ہاں وہی لوگ جنھوں نے بہادر شاہ ظفر کو ناشتے میں ان کے لڑکوں کا سر دیا ہو۔ وہ لوگ جنھوں نے بدیسی سرکار کی غلامی کو غنیمت سمجھ کر ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ لگوا کر ملت اسلامیہ کے جذبات کو مجروح کیا ہو۔ اسوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخی حقائق کو نہ جھٹلایا جائے داستان حریت کو اگلی نسلوں میں منتقل کیا جائے تاکہ یہ قافلۂ حریت آگے بڑھ کر نظام مصطفےٰ کے نفاذ کے لئے کارگر ثابت ہو۔ کاش میرے احباب ان علمائے حق کی تاریخ پر نظر ثانی کریں اور ان کے اس احسان عظیم کے سامنے اپنی گردنیں جھکا کر تاریخ کا صحیح جائزہ لیں!

مولانا سید کفایت علی کافی

(تابش قصوری)

جنگ آزادی کے شہید مولانا سید کفایت علی کافی مراد آباد کے ایک باعزت خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے۔ علم حدیث و فقہ، اصول، منطق، فلسفہ، عروض و قوافی، صرف و نحو وغیرہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے آپ کا نعتیہ کلام غزل کے پیرائے میں ہے۔

اعلیحضرت مولانا الشاہ احمد رضا خاں قادری بریلوی علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا کافی اور حسن میاں کا کلام اول سے آخر تک شریعت کے دائرہ میں ہے۔ بلکہ فاضل بریلوی حضرت کافی علیہ الرحمۃ کو سلطان نعت کہا کرتے تھے۔

(الملفوظ حصہ دوم، حدائق بخشش حصہ سوم)

مولانا کافی علیہ الرحمۃ حضرت صدر الافاضل فخر الاماثل مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمۃ کے والد ماجد حضرت مولانا معین الدین صاحب نزہتؔ کے ہم سبق بھی رہے جو حضرت داغ دہلوی کے بھی ممدوح تھے۔

(حیات صدر الافاضل)

مولانا کفایت علی کافی نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد مرتب کیا جنرل بخت خان روہیلہ کی فوج میں کمانڈر ہو کر دہلی آئے، بریلی گئے، الہ آباد پر چھائے

مرادآباد میں انگریزوں کو شکست فاش دی اور اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو آپ صدر شریعت بنائے گئے۔

جناب امداد صابری صاحب رقمطراز ہیں:۔

"...... انگریز مرادآباد سے بھاگ کر میرٹھ اور نینی تال چلے گئے نواب مجو خاں حاکم مرادآباد مقرر ہو گئے، عباس علی خاں بن اسعد علی خاں ہندی توپ خانہ کے افسر معین ہوئے اور مولوی کفایت علی صاحب صدر شریعت بنائے گئے انھوں نے عوام میں جہادی روح پھونکی۔ شہر میں ہر جمعہ کو بعد نماز انگریزوں کے خلاف وعظ فرماتے جس کا بے حد اثر ہوتا تھا"

ڈسٹرکٹ گزیٹر مرادآباد میں لکھا ہے

"مسلمانوں نے من حیث القوم ضلع بھر میں برٹش گورنمنٹ سے اپنی مخالفت کو نہایت صاف اور صریح طور پر ظاہر کیا ہے۔ روہیل کھنڈ کے اضلاع کی طرح مرادآباد کے ضلع میں غیرت مذہبی۔ اور انگریزوں کی ہر بات سے نفرت کے جذبات نے مسلمانوں کو عام بغاوت پر مشتعل کیا تھا"

مولانا کفایت علی مرحوم نے نشر و اشاعت کے سلسلے میں کافی کام کیا۔ فتویٰ جہاد کی نقول دوسرے مقامات پر بھجوائیں۔ بلکہ بعض مقامات پر خود بھی تشریف لے گئے آنولہ ضلع بریلی میں خاص اسی مقصد کے لئے ہفتہ عشرہ قیام کیا تھا۔ حکیم سعد اللہ ابن عظیم اللہ کے یہاں ٹھہرے۔

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے شعراء ص ۳۲۱)

۲۶ اپریل ۱۸۵۷ء کو جنرل مونس گورہ فوج سے مرادآباد پر حملہ آور ہوا مجاہدین نے جانیں لڑادیں۔ نواب مجو خاں آخری وقت تک ایک مکان کی چھت پر بندوق چلاتے نظر آئے۔ ان کو سات ہتھیار بند سپاہی گرفتار کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ مگر گرفتار نہ ہو سکے آخر گولی ماردی گئی اور انھوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔

مرادآباد کے سقوط کے ساتھ ہی تمام انقلابی رہنما منتشر ہو گئے جو حکومت کے ہاتھ پڑے وہ دار پر چڑھادیئے گئے یا حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزاوار قرار دیئے گئے

مولانا کفایت علی کافی کو ایک کلال فخرالدین کی مخبری سے انگریزوں نے گرفتار کرلیا

سزائیں شروع ہوئیں۔ جسم پر گرم گرم استری پھیری گئی۔ زخموں پر نمک مرچ چھڑکی گئی اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے انگریزوں نے ہر حربہ استعمال کیا۔ جب اس مرد مجاہد سے دشمن مایوس ہو چکا تو اس نے اپنا آخری تیر ترکش سے نکالا اور بر سر عام چوک مراد آباد میں اس عاشق رسول کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔

جناب محمد ایوب قادری صاحب اپنے ایک مقالے میں تحریر کرتے ہیں کہ،

"مولانا گرفتار ہوئے، پھانسی کا حکم ہوا تو مسرور ہوئے۔ جب قتل گاہ پر مولانا کو لے جایا گیا تو یہ غزل پڑھتے ہوئے خراماں خراماں تشریف لے گئے۔

؎

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا

ہم صفیر و باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا

اطلس و کمخواب کی پوشاک پہ نازاں نہ ہو
اس تن بے جان پر باقی کفن رہ جائے گا

نام شاہان جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہاں
حشر تک نام و نشان پنجتن رہ جائے گا

جو پڑھے گا صاحب لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا

سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک!
نعت حضرت کا زبانوں پر اثر رہ جائے گا

؎

(العلم کراچی جنگ آزادی نمبر شمارہ جون ۱۹۵۷ء)

سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اودھ کا بڑا حصہ ہے۔ کانپور اور لکھنؤ دلی کے بعد مرکز بنے ہوئے تھے۔ مگر اودھ میں جہاں جہاں افواج انگریزی تھیں ان میں انقلاب کی روح پھونکنے میں منشی رسول بخش کاکوروی کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے ایک منظم جماعت سے کام لیا اور کامیاب ہوئے۔ مگر اس کی بہار نہ دیکھ سکے کہ پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ ان کا ذکر قیصر التواریخ اور مشاہیر کاکوروی اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء میں ہے۔ مگر چند سطور سے زیادہ نہیں۔

فوجوں میں بغاوت پھیلانے کے سلسلے میں دو ایک کا نام لیا جاتا ہے۔ کتاب "سیلاب خون" کی روایت سے پتہ چلا کہ تانتیا ٹوپے نے جوگیانہ لباس پہن کر فوجوں میں گشت لگایا مگر اس کتاب کے سوا کہیں اور سے یہ ثبوت نہ مل سکا۔ ایک عرصہ تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ خود فوجوں نے بغاوت کی یا دوسرے لوگ بغاوت کرانے والے تھے۔ چنانچہ تحقیقات کے بعد چند حقیقتیں سامنے آئیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض فوجیوں نے بھی اپنی ہم پیشہ جماعت کو ابھارا مگر منظم طریقے سے صرف دو ہستیاں تاریخ میں نمایاں نظر آتی ہیں ایک امیر المجاہدین مولوی سرفراز علی شاہجہاں پوری اور دوسرے منشی رسول بخش کاکوروی۔ ان کے علاوہ بارکپور میں محمد شفیع دفعدار اور کانپور میں جوالا پرشاد اور شمشاد الدین بھی قابل ذکر ہیں۔

منشی رسول بخش کاکوروی کے مورث اعلیٰ ملا ابوبکر حاجی علوی تھے۔ جن کے صاحب زادے ملک بہاء الدین سلاطین شرقیہ کی طرف سے کاکوری فتح کرنے آئے اور بعد فتح وہیں مقیم ہوگئے۔ منشی صاحب کے والد فیض بخش نواب شجاع الدولہ کی فوج میں صوبیدار تھے بکسر کی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ان کے ساتھی محمد کاظم بھی تھے۔ فیض بخش صاحب کی تصنیف "چشمۂ فیض" مشہور رہی۔ منشی رسول بخش بھی نواب واجد علی شاہ کی فوج میں عہدیدار تھے۔ نواب ان کی تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے۔ نواب کی معزولی پر فوجیں ختم کی گئیں تو یہ وطن چلے آئے اور اپنے معزول ساتھیوں کی ایک جماعت بنا کر فوجوں میں انگریز کے خلاف نفرت پھیلاتے رہے۔ ان کی یہ کوشش تھی کہ انگریز کی حکومت کا تختہ الٹ دیں عظیم اللہ خاں سے بھی ملے تھے انھوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے اودھ کے کل جاگیرداروں اور راجاؤں کو خفیہ طور پر تیار کر کے بغاوت کا انتظام کیا تھا۔ اودھ میں جگہ جگہ جو چھاؤنیاں تھیں ان میں افسروں سے مل کر انھیں اپنا ہم خیال بنالیا تھا اور ان کی ماتحت فوج کے لئے تنخواہ کا بھی انتظام کیا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں مختلف مقامات پر آزادی کی خفیہ تحریک چل رہی تھی۔ اس کے سربراہوں سے منشی صاحب نے تعلق پیدا کر لیا۔ ابھی پورا کام نہیں ہوا تھا اور ۲۱ جون انقلاب کی تاریخ تھی کہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ کو میرٹھ سے کارتوس کے قضیے کا سلسلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جس کا اثر دور و نزدیک ہر جگہ پڑا۔ فوجیں دوسرے روز لکھنؤ میں داخل ہونے والی تھیں۔ لکھنؤ چھاؤنی کی فوجیں بھی تیار تھیں۔ انگریزوں کی ملازمت میں جو ہندوستانی اہلکار تھے بہت سے ان میں ان کے شریک اور معین تھے ان میں ایک پولیس انسپکٹر یا سب انسپکٹر بھی تھا، جو منشی صاحب کا خاص معتمد اور راز دار تھا خدا جانے کیوں اس کے دل میں دفعتاً کھوٹ پیدا ہوئی اور اس نے جا کر انگریزی فوج کے اعلیٰ افسر غالباً کرنل بیلی سے مخبری کر دی۔ نتیجہ میں منشی صاحب، ان کے بڑے صاحب زادے منشی عبد الصمد صاحب اور دیگر شریک کار ۱۸ نفوس کو گرفتار کر کے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے پر پھانسی دیدی گئی اور پورے خاندان کو گرفتار کرنے کا حکم دیدیا گیا۔

منشی صاحب کے باقی دو صاحب زادگان منشی عبد الصمد صاحب اور منشی عبد العزیز صاحب کاکوری میں اپنے مکان میں تھے۔ ان کے پاس رات ہی کو اطلاع پہنچی۔ یہ دونوں صاحب معہ اپنے گھر کی مستورات اور بچوں کے اسی وقت گھر چھوڑ کر روپوش ہونے کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ شاہ تراب علی صاحب سجادہ نشین تکیہ شریف

کا خلیہ کاکوری کو کشف سے اس کی خبر ہو گئی اور حضرت نے اپنے صاحب زادگان شاہ حیدر علی صاحب و شاہ تقی علی صاحب کو جگا کر بھیجا اور منشی رسول بخش صاحب کے خاندان کو بلا کر اپنے زنانہ مکان میں روپوش کر دیا اور کئی ماہ تک یہ خاندان وہاں روپوش رہا۔ اس کے بعد سندیلہ جاکر اپنے ایک عزیز کے ہاں روپوش ہوا۔

بغاوت ... کچھ دنوں ہی کے بعد فرو ہو گئی مگر جاگیرداران و راجگان اودھ برابر لڑ رہے تھے اور کسی طرح اطاعت قبول نہ کرتے تھے۔ ایک روز لکھنؤ کے فوجی اعلیٰ افسر یا چیف کمشنر نے نواب اکرام اللہ خاں صاحب سے (جو منشی رسول بخش کے سالے کے بیٹے تھے اور سرکار انگریزی میں ممتاز عہدے پر فائز تھے اور بعد میں ریاست حیدرآباد میں صوبیدار ہوئے اور نواب یار جنگ کا خطاب پایا۔) باہم مشورہ کیا اور کہا غدر فرو ہو گیا۔ مگر یہ جاگیردار اور راجگان کسی طرح ہتھیار نہیں ڈالتے۔ میں سخت پریشان ہوں۔ تم کوئی تدبیر بتاؤ۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں؟ اس نے اجازت دی۔ تب انھوں نے کہا کہ منشی رسول بخش صاحب نے بغاوت کی تھی۔ ان کو آپ نے گرفتار کرکے پھانسی دیدی۔ ابھی ان کی اولاد میں دو بیٹے موجود ہیں۔ جس شخص کا یہ اثر تھا کہ اس کو پھانسی دینے کے بعد بھی اس کی لگائی ہوئی آگ بجھانا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کے بیٹوں کا بھی کافی اثر ہوگا۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ ان کے خاندان کی معافی کا اعلان کر دیجئے اور جب ان کے بیٹے اپنی جائے پناہ سے واپس باہر آجائیں تو انھیں بلا یئے اور ان کے سپرد یہ کام کیجیے، وہی اس کام کو کر سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ یہ تجویز اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے ایسا ہی کیا چنانچہ عبدالحئی صاحب نے تمام جاگیرداروں کو موافق بنا لیا جس کے صلے میں علاقہ ملنے کا اعلان ہوا۔ مگر قبول نہیں کیا۔ تمام عمر لکھنؤ میں وکالت کرتے رہے۔

منشی رسول بخش کا عالی شان مکان ابھی تک کوٹھی کے نام سے مشہور ہے اور جس محلہ میں وہ واقع ہے۔ "کوٹھی تلہ" کہلاتا ہے۔ منشی صاحب شہید کے پوتے مولوی یونس حسن علوی، ایم۔ اے لکچرر عثمانیہ کالج علامہ عثمانی کالونی کراچی میں مقیم ہیں۔
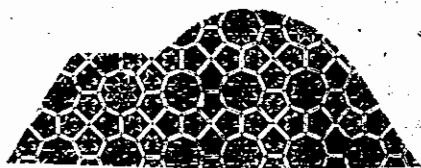
مفتی عنایت احمد کاکوروی

(میاں عبدالرشید

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن حضرات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں مولانا فضل حق خیرآبادی اور سید احمد اللہ شاہ مدراسی کے بعد مفتی عنایت احمد کاکوروی سرفہرست ہیں۔ آپ بریلی میں نواب بہادر خاں کی زیر قیادت جہاد حریت کی تنظیم کے لئے سرگرم عمل رہے ان دنوں روہیل کھنڈ بریلی مجاہدین آزادی کا اہم مرکز تھا اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے جد امجد مولانا رضا علی خاں اس تحریک کے قائدین میں سے تھے۔ مفتی عنایت احمد نے مجاہدین کی تنظیم پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ نواب بہادر خاں کے دست راست کی حیثیت سے مختلف معرکوں میں عملی حصہ بھی لیا۔

مفتی صاحب نے جانبازوں کا ایک خاص دستہ تیار کیا تھا۔ جنگی معرکہ آرائی سے اسلام کے دور اول کے مجاہدین کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس دستہ کے ایک معرکہ کا آنکھوں دیکھا حال ایک انگریز سارجنٹ میجر نے یوں لکھا ہے کہ:۔

"ان لوگوں کی داڑھیاں سفید تھیں۔ انگلی میں چاندی کی انگوٹھی جس کے نگینہ پر "اللہ" کندہ تھا، پہنے ہوئے تھے کمر میں سبز رنگ کا پٹکا اور سر پر سفید پگڑی تھی جس پر سرخ رنگ کے چھینٹے تھے۔ حملہ آور ہونے سے پہلے ان کا

نوجوان سردار جو ایک چوبیس سالہ بے ریش نوجوان تھا
صفوں سے نکل کر آگے آیا اور ہم سے یوں مخاطب ہوا،
کیا تم کافروں میں کوئی ایسا حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کرے
اگر ہے تو سامنے آئے۔ ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا
اس نے دوبارہ چیلنج کیا مگر ادھر سے جواب نہ ملا پھر وہ
تلوار نکال کر ہمارے لشکر پر اکیلا ہی حملہ آور ہوا اور
اس نے چشم زدن میں اٹھارہ سپاہیوں کو زخمی کر دیا آخر
شہادت پائی۔ مگر جب تک جسم میں جان باقی رہی تلوار
کے جوہر دکھاتا رہا۔"

تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد مفتی صاحب گرفتار ہوئے اور کالے پانی کی سزا پائی اسیری کے زمانے میں کئی کتب تصنیف کیں اگرچہ انڈیمان میں کتابیں میسر نہ تھیں مگر اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر یادداشت ہی سے پہلی کتابوں کے حوالے دیئے جو بعد میں درست پائے گئے اسی قید کے دوران تقویم البلدان کا ترجمہ دو برس میں مکمل کیا۔
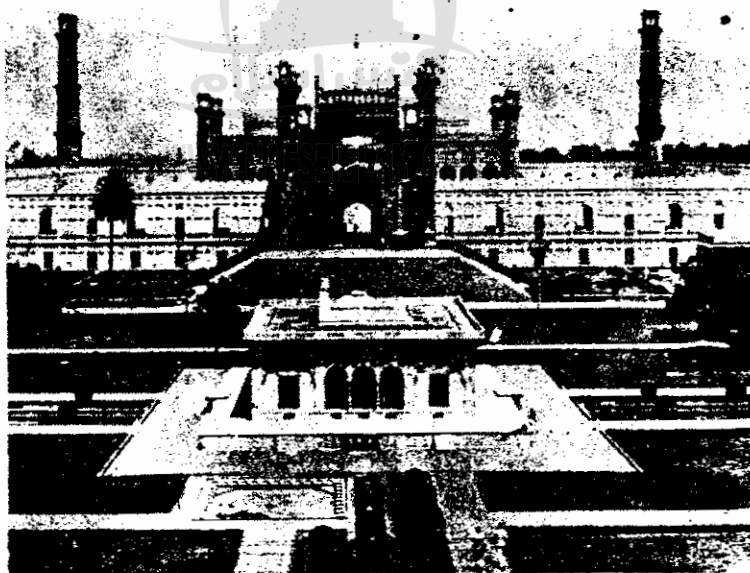
جنگ آزادی کی کہانی

انگریزوں کی زبانی!

(سید مصطفیٰ علی بریلوی)

ہماری جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اپنے جلو میں سرفروشی، دلیری، جانبازی اور جواں مردی کے بے شمار واقعات سمیٹے ہوئے ہے۔ انگریزی استبداد کے خاتمہ کے بعد اس عظیم جدوجہد کی خفیہ داستانیں مسلسل منصۂ شہود پہ آرہی ہیں۔ یہ واقعات آج بھی ہمارے حوصلہ اور عزم کو مہمیز کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت جو شعلہ بھڑکا تھا وہ اگرچہ مکمل طور پہ کچل دیا گیا۔ لیکن خاکستر کی دبی ہوئی چنگاریاں انگریزوں کے خرمن عیش کو جلانے کا سبب بن گئیں۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں ہمارے علماء، صلحاء، فضلاء اور شرفا نے یکساں حصہ لیا انگریزی استعمار کے خلاف یہ بغاوت کلکتہ سے لے کر پشاور تک محیط تھی۔ احمد خاں کھرل، مولوی عنایت علی بریلوی، مولانا عبدالقادر لدھیانوی، وزیر علی خاں بٹیالوی وغیرہم پنجاب میں جنگ آزادی کے ہیرو تھے۔ اس علاقے میں بیس سے تیس ہزار تک فوجی مسلمان، (جن کی اکثریت اودھ اور روہیل کھنڈ یوپی سے تعلق رکھتی تھی) شہید کیے گئے۔ دہلی میں تقریباً تیس ہزار مسلمان پھانسی چڑھے۔ جامع مسجد میں گھوڑے باندھے گئے چونکہ روہیل کھنڈ اور اودھ میں بغاوت کا سب سے زیادہ زور تھا۔ اس لئے یہ علاقے انگریزوں کی ظلم و زیادتی کا خصوصی نشانہ بنے۔

۱۸۵۷ء ہماری ملی تاریخ میں ایک ایسا اہم سال ہے جسکی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ اس سال مسلمانان ہند نے سات سمندر پار کے سامراجیوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔ بعض مقامات پر ہندوؤں نے بھی اس جد وجہد میں ہمارا ساتھ دیا۔ جب یہ جنگ "ہار" میں تبدیل ہوئی تو ہندوؤں نے انگریزوں سے ہاتھ ملالیا اور حکومت وقت کے مظالم کا صرف مسلمان نشانہ بن گئے۔ ہماری پہلی جنگ آزادی کے ہیرو بلاشبہ انگریزی فوجی اور سول افسران سے کسی طرح قابلیت اور حب الوطنی میں کم نہیں تھے۔ جنرل بخت خاں۔ جنرل محمود خاں، بیگم حضرت محل، مولانا احمد اللہ شاہ، سید لیاقت علی، مولانا فضل حق، خان بہادر خاں، نانا راؤ، نانتیا ٹوپی، شہزادہ فیروز شاہ، جھانسی کی رانی ــــــــ محمد علی خاں عرف جیمی گرین وغیرہ مجاہدین کے لیڈر تھے اور اپنی اپنی جگہ بڑی خوبیوں کے لوگ تھے۔ ان مشہور ومعروف لیڈروں کے علاوہ بے شمار لوگوں نے جوانمردی اور دلیری کے محیر العقول کارنامے انجام دیئے کہ آج بھی حیرت ہوتی ہے۔ انگریزی دور میں خواجہ حسن نظامی اور ان کے بعد مفتی انتظام اللہ شہابی نے افسانوی طرز پر جو کچھ لکھ دیا اس کے علاوہ بہت کم لٹریچر عوام وخواص کے سامنے آسکا۔ مولوی محمد میاں نے علماء کا شاندار ماضی جلد چہارم میں ان واقعات کو لکھا۔ ساورکر نے جو بعد کو مہاسبھائی بن گیا ایک معرکہ کی کتاب لکھی۔ سندر لعل کی کتاب بھی اس بارے میں خاصی روشنی ڈالتی ہے۔

ملک آزاد ہونے کے بعد تو ۱۸۵۷ء کے واقعات پر بے پناہ کام ہوا۔ لیکن اب بھی بہت کچھ باقی ہے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے جو مظالم روا رکھے تھے ان کی داستان مکمل طور پر شاید کبھی پیش نہ ہوسکے۔ کیونکہ انگریزوں نے اصل واقعات کو ہمیشہ کے لئے دفن کردیا۔ لیکن خون ناحق ببانگ دہل بولتا ہے۔ اسی طرح تاریخی واقعات چھپائے نہیں چھپ سکتے۔ اجتماعی انفرادی بہادری کے معاملے میں مجاہدین نے بڑی جرأت مردانہ کا ثبوت دیا۔ اس بات کا انگریزوں نے برابر اعتراف کیا۔ تفصیلات بہت طویل ہیں۔ اس صحبت میں ہم خود انگریزوں کی زبان سے جد وجہد آزادی کی مختصر تفصیل پیش کرتے ہیں۔

اودھ میں بغاوت کی کیفیت

مالیسن کا بیان ہے کہ:

"سارے اودھ نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھالئے تھے۔ نہ صرف باضابطہ فوج ہی بلکہ

تخت سے اترے ہوئے نواب کی فوج کے ساٹھ ہزار آدمی، زمینداراوران کے سپاہی دوسو پچاس قلعے جن میں بہت سوں پر بھاری توپیں لگی ہوئی تھیں سب کے سب ہمارے خلاف کھڑے ہوگئے تھے۔

بیگم حضرت محل (والدہ برجیس قدر والی لکھنؤ)

رسل کی نظر میں:-

بیگم میں بڑی طاقت اور قابلیت دکھائی دیتی ہے۔ بیگم نے ہمارے ساتھ لگاتار جنگ کرتے رہنے کا اعلان کر دیا ہے ان رانیوں اور بیگموں کی ہمت اور طاقت کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ زنان خانے کے اندر رہ کر بھی یہ کافی زیادہ عملی اور دماغی طاقت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں۔

اینس لکھتا ہے:-

کم از کم اودھ کے باشندوں کی جنگ کو ہمیں جنگ آزادی ماننا پڑے گا۔

مجاہدین آزادی اور انگریز خواتین

انگریزوں نے مسلمانوں کو طرح طرح سے بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ لیکن سچائی زبان پر آ ہی جاتی ہے۔ کانپور، اودھ اور روہیل کھنڈ فتح کرنے والی افواج کے ساتھ لندن ٹائمز کا نمائندہ ولیم فوربس محل متعین تھا۔ اس نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ مسلمانوں نے خواتین کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اصل الفاظ یہ ہیں:-

"بہت سی انگریز خواتین وحشیانہ طور پر قتل کی گئیں لیکن ان کو بے عزت نہیں کیا گیا"

محل نے ایک باغی مجاہد محمد علی خان روہیلہ عرف جیمی گرین سے قتل گاہ جانے سے قبل انٹرویو کے دوران جب اس موضوع پر سوال کیا تو اس نے جواب دیا:-

"آپ اجنبی ہیں ورنہ ایسا سوال نہ پوچھتے جو شخص یہاں کے رسم و رواج اور ذات برادری کے سخت قواعد سے واقف ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ یہ سب جھوٹی کہانیاں ہیں ـــــ"

جسٹس میکارتھی کا بیان

"لوگوں کے غصے کی آگ کو اس طرح کی افواہیں اڑا اڑا کر بھڑکایا گیا کہ عام طور پر عورتوں کی بے

عزتی کی گئی اور بے رحمی کے ساتھ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گئے، خوش قسمتی سے یہ افواہیں جھوٹی تھیں... معمولی معنی میں کسی عورت کے ساتھ زیادتی نہیں کی گئی۔"

مظالم

بریگیڈیئر جنرل نیل نے ۲۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو حکم دیا کہ، "میجر برونس انچارج مہترپولس قیدیوں کو قتل کرنے سے قبل ان سے مقتل کی ایک مربع فٹ سطح چٹوالے۔"

چارلس بال نے لکھا ہے:-

"مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں سمیت اور بے شمار بوڑھے مرد اور عورتیں جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکتی تھیں جلا کر خاک کر دیئے گئے۔"

"ہم نے ایک بڑے گاؤں کو آگ لگا دی جس میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ ہم نے انھیں گھیر لیا اور جب وہ آگ کی لپٹوں میں سے نکل کر بھاگنے لگے تو انھیں گولیوں سے اڑا دیا۔ بوڑھے آدمیوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بے بس عورتوں سے جن کی گود میں دودھ پیتے بچے تھے ہم نے اس طرح بدلہ لیا جس طرح بڑے بڑے مجرموں سے لیا جاتا ہے۔"

مشہور مصنف کے، ای سے ایک انگریز افسر نے بیان کیا۔

"آپ یہ جان کر مطمئن ہوں گے کہ میں نے بیس گاؤں کو زمین سے ملا کر برابر کر دیا۔"

مجاہدین کی جرأت مندی

کانپور شہر میں مجاہدین پر جو مظالم ہوئے ان کا حال چارلس بال نے اس طرح لکھا ہے:

"جنرل ہیولاک نے سر ہوڈ ہیلر کی موت کا زبردست انتقام لینا شروع کیا۔ ہندوستانیوں کے گروہ پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ موت کے وقت کچھ انقلابیوں نے جس طرح دلی سکون اور اپنے برتاؤ میں شرافت دکھائی وہ ان ہی لوگوں کے شایانِ شان تھا جو کسی اصول کے مطابق شہید ہوتے ہیں۔"

لوٹ مار

لارڈ الفنسٹن نے سر جان لارنس کو لکھا:

"محاصرہ کے ختم ہونے کے بعد سے ہماری فوج نے جو مظالم کئے ہیں انھیں سن کر دل پھٹنے لگتا ہے۔ بغیر دوست دشمن کی تمیز کئے یہ لوگ سب سے ایک سا بدلہ لے رہے ہیں۔ لوٹ

میں تو حقیقتاً ہم نادر شاہ سے بھی بڑھ گئے"۔

عینی شہادت

نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ اپنی کتاب "تاریخ روہیل کھنڈ" (انجمن ترقی اردو کے کتب میں محفوظ ہے) لکھتے ہیں:

" فوج غربی نے ۔۔۔ مئی ۱۸۵۸ء کو داخل ہو کر حکم غارت گری اور جرنیلی نافذ کیا اضلاع روہیل کھنڈ میں باغیوں نے ایسی سخت سزائیں پائیں کہ اب ساکنانِ روہیل کھنڈ کا بغاوت کرنا تو ایک طرف کبھی بغاوت کا نام تک زبان پر نہ لائیں گے"۔

ملک محمد شفیع اپنی کتاب ۱۸۵۷ء میں لکھتے ہیں۔

" جو مظالم دہلی میں گزرے ان مظالم کا شمہ ہیں جو اودھ اور روہیل کھنڈ میں ان ستم گاروں کے ہاتھوں سے انسانوں پر بیتے"۔

" حقیقت یہ ہے کہ روہیل کھنڈ کے ان جانبازوں نے انگریزی استبداد کے مقابلے میں ایسی مثال قائم کی کہ سارے ہنگامے میں اسکی مثال نہیں ملتی"۔

غداری

الہ آباد میں مولوی لیاقت علی کی قیادت میں بڑی زبردست بغاوت ہوئی۔ قلعہ الہ آباد کی جنگ کا حال بیان کرتے ہوئے پنڈت سندر لال نے لکھا ہے:

"سکھ پلٹن اسوقت قلعہ کے اندر تھی۔ اگر قلعہ کے سکھ اسوقت انقلابیوں کا ساتھ دے جاتے تو آدھ گھنٹے کے اندر الہ آباد کا قلعہ اور اس کے اندر کا تمام سامان انقلابیوں کے ہاتھ آجاتا۔ لیکن ٹھیک اس نازک وقت میں سکھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور انگریزی جھنڈا الہ آباد کے قلعہ پر لہراتا رہا"۔

چارلس بال رقم طراز ہے:

"دشمن نے ہر ایک ایک فٹ زمین کے لئے لڑائی لڑی تھی اور بڑے استقلال کے ساتھ یکے بعد دیگرے ہر مقام پر قبضہ کر لیا تھا۔

مسٹر لیکی لکھتے ہیں۔ اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جاسکتی ہے تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بغاوت تھی ۔ دہلی آگرہ، بریلی، مراد آباد، میرٹھ۔ کانپور جنگ کے خصوصی مراکز تھے۔ پنجاب کی سرزمین سکھوں اور زمیندار طبقے کی غداری کی وجہ سے انگریزوں کے واسطے زرخیز

ثابت ہوئی۔ لیکن انگریزوں کو یہاں بھی سخت آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اسوقت پنجاب میں انگریزی فوجوں میں پوربیوں (اودھ اور روہیل کھنڈ) والوں کی کثرت تھی۔ چونکہ یوپی بغاوت کا خاص مرکز تھا اس لئے قدرتاً پنجاب میں متعین سپاہ بھی متاثر ہوئی۔ انگریزوں نے جواباً اپنی سپاہ کو تباہ کرنے کا کامیاب منصوبہ بنایا اور تقریباً بیس ہزار جوان بڑی بڑی بے دردی کے ساتھ مختلف طریقوں سے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس دور میں پنجاب نے کئی مقامی ہیرو پیدا کئے جن میں احمد خاں کھرل اور صوبہ دار میجر وزیر خاں پٹیالوی کا بڑا مرتبہ ہے۔ صوبہ سرحد میں بھی پوری پلٹن نے بغاوت کی۔ یہ لوگ سوات کے علاقے میں پہنچے تاکہ مقامی سرداروں کے ساتھ ——— جنگ کریں۔ لیکن مقامی غداریوں کے نتیجے میں یہ منصوبہ بھی ناکام رہا جسکی تفصیل ہم ابھی پیش کریں گے۔ دہلی میں جنگ آزادی کی اٹھان بیحد شاندار تھی۔ لیکن مرزا فضل، بیگم زینت محل، حکیم احسن اللہ کی ناعاقبت اندیشیوں نے سب کرے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ لکھنؤ اور بریلی سب سے آخر میں انگریزوں کے ہاتھ آئے۔ جوانمردی اور بہادری کی عظیم داستانیں یہاں بھی ہر قدم پر دہرائی گئیں۔ لکھنؤ میں عین جدوجہد آزادی کے زمانے میں مسلمانوں کے دو عظیم فرقوں میں دشمنوں نے رخنہ ڈالا۔ غداری میں خود شاہی خاندان کے افراد ملوث ہو گئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ اور بیگم صاحبہ کے درمیان اختلاف پیدا کر دیا گیا۔ بریلی میں ہندو ٹھاکر اور نواب رام پور غداری کے مرتکب ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں ناکامی آپس کے اختلافات ہتھیاروں کی کمتری اور عدم تنظیم کی وجہ سے ہوئی۔ ذیل میں جنگ آزادی اول سے متعلق چند سربستہ راز اور واقعات انگریزی ریکارڈ کی روشنی میں مختصراً پیش کرتا ہوں۔!

سکھوں کی غداری

۱۸۵۷ء کی قومی جدوجہد میں سکھوں نے عظیم غداری کا ثبوت دیا تھا اس سلسلے میں سر جان لارنس کی حسب ذیل تحریر قابل مطالعہ ہے۔!

"جب میں گذشتہ چار ماہ کے واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی زندہ پا کر خدا کی مہربانی پر محو حیرت ہو جاتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تباہی مقدر ہو چکی تھی کیونکہ اگر سکھ بھی ہمارے خلاف شامل ہو جاتے تو دنیا کی کوئی طاقت ہم کو بچا نہیں سکتی تھی بادی النظر میں اس کوتاہ بینی اور قومی آزادی کے خلاف اتنے زور شور سے کھڑے ہو جانے کی توقع کوئی بھی شخص ان سکھوں سے نہیں کر سکتا تھا۔ جو لوگ موقع پر موجود تھے ان کا بیان ہے کہ یہ سوال کہ سکھ ہمارے

ساتھ ہیں یا نہیں مسلسل ہمارے لئے ہوا میں معلق رہا اور اس بات میں کوئی بھی شک نہیں کہ خالصہ گروہوں میں بعض محبان وطن سپاہیوں کے دماغ میں بغاوت کا خیال آیا مگر وہ بغیر کسی لیڈر کے تھے نیز ان کے دلوں میں مسلمانوں اور پوربیوں (ہندوستانی مسلمانوں) کے خلاف نہ ختم ہونے والی آگ سلگ رہی تھی۔

انگریزوں کے دلوں میں چونکہ مسلمانوں کے خلاف شدید جذبات پائے جاتے تھے اس لئے انھوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصولوں پر کام شروع کر دیا۔ پنجاب کے ایک اعلیٰ انگریز حاکم کو یہ عظیم کام سپرد کیا گیا جس کا اقبال مسٹر کیو براؤن نے اپنی تصنیف میں اس طرح کیا ہے "اس طرح دو طبقات کو ایک دوسرے کے خلاف تنقیح پر آمادہ رکھنا ایک قوم کو دوسری قوم یا عقیدہ رکھنے والوں کے خلاف ابھار کر توازن قائم رکھنا ایسے عظیم مقاصد تھے جو ڈپٹی کمشنر مسٹر الیف کوپر کو سونپے گئے۔

صوبہ سرحد کی بغاوت

مراسلہ لیفٹیننٹ کرنل ایچ، بی ایڈورڈس کمشنر پشاور ڈویژن بنام اے۔ برانڈرتھ سیکرٹری برائے چیف کمشنر پنجاب۔ مورخہ ۱۳ر اگست ۱۸۵۷ء۔

"چیف کمشنر کے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ یوسف زئی قبیلے کا علاقہ وہ واحد ضلع کا حصہ ہے جہاں سپاہیوں کی بغاوت سے لوگوں نے فائدہ اٹھاتے ہوئے بد امنی پھیلادی ہے یہ حصہ آزاد علاقوں سوات، پنجتر، بونیر سے ملحق ہے جو ہندوستان کے جنونی مہاجرین کے مراکز ہیں ۔۔۔ ۲۵ر مئی کو پشاور سے مردان ایک فوج پہنچنے والی تھی تاکہ ۵۵ دیسی انفنٹری کو غیر مسلح کر کے باغی فوج قلعہ سے نکل کر پہاڑوں کی جانب چلی گئی۔ لیفٹیننٹ کرنل نکلسن ڈپٹی کمشنر نے پیچھا کیا چھ سو کے قریب سوات کی طرف نکل گئے۔

سوات کی حالت

سوات میں اس وقت دو عملی کا دور دورہ تھا۔ یعنی اخوند صاحب (بادشاہ) اور مولوی صاحب بیک وقت حکومت چلا رہے تھے۔ اگر یہ دونوں متحد ہو جاتے اور ۵۵ رجمنٹ کو ہاتھ میں لے کر ہمارے خلاف جہاد کا اعلان کر دیتے تو وادئ پشاور میں ایک آگ سی لگ جاتی۔ اور ہماری راہ میں زبردست مشکلات حائل ہو جاتیں۔ لیکن (انگریزوں کی خوش قسمتی) بادشاہ صاحب سید اکبر

کا اسی دوران میں انتقال ہوگیا۔ موجودہ رئیسوں میں اپنی آزادی قائم رکھنے کے واسطے کشمکش ہوئی۔ انھوں نے پہلے سید اکبر شاہ (محب وطن) پسر بادشاہ صاحب کو نکالا اور اس کے بعد ۵۵ انفنٹری کے مجاہدین کو دریائے سندھ کے اس مقام پر پار ہونے پر مجبور کر دیا جہاں ہماری حکومت تھی۔ کچھ سپاہی (مجاہدین) سید مبارک شاہ کی معیت میں پنجتر میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہاں ایک مقام متصل تھانہ کے مقام پر وہابی علماء کے زیر اثر ہندوستانی انتہا پسندوں (مجاہدین) کے مرکزستیانہ کا ایک حصہ تھی۔ یہ مقام دریائے سندھ کے کنارے اور ہزارہ کے بالمقابل واقع ہے ان لوگوں کو مدت سے روپیہ اور آدمیوں کی شکل میں ہندوستان کے شاہزادگان سے مدد ملتی رہی ہے۔

مولوی عنایت علی بریلوی کی بغاوت

ہمارے لئے یہ خبر تعجب خیز تھی کہ مولوی عنایت علی بریلوی نے پندرہ دن بعد سرحد پار کر کے نارنجی کے دشوار گزار مقام پر بغاوت کر دی اور جہاد کا علم بلند کر دیا۔ مولوی کی فوج میں اس کے اپنے ۱۵۰ مریدوں کے علاوہ مندرجہ ذیل گروپ شامل تھے ۵۵ رجمنٹ کے سپاہی ۴۰، نارنجی کے باشندگان ۴۰۰، پنجتر کے گھوڑ سوار ۴۰، شہباز خاں، گھوڑ اسوار ۱۰۔ کل ۶۴۰ آدمی تھے۔

نوٹ:- انگریزوں نے فوری حملہ کا پروگرام بنایا۔ پہلی مرتبہ وہ ناکام رہے۔ غداروں نے نارنجی جانے کے واسطے ایک خفیہ راستہ کا پتہ بتادیا۔ جب مجاہدین نے سامنے کے رخ سے حملہ کیا تو - - - - - - ایک اور انگریز فوج پیچھے کی جانب سے آن دھمکی۔ مجاہدین نے شدید مقابلہ کیا - - - - - - لیکن تدبیر جنگ کی ناکامی کے سبب کچھ پیش نہ گئی۔ مولوی عنایت علی بریلوی لڑتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ انگریزوں نے انھیں شہید کر دیا۔ جان محمد روہیلہ جو دہیل کھنڈ کا ایک مانا ہوا سپاہی تھا۔ ملک ظریف جو مقامی سردار تھا انگریزوں کے ہاتھوں پھانسی پاکر شہید ہوئے۔

انگریزوں کے جذبۂ انتقام کو پھر بھی تسکین نہ ہوئی تو انھوں نے قصبہ نارنجی کو ہاتھیوں کے پیروں تلے روند ڈالا۔

لکھنؤ و بریلی کے معرکے

ولیم فوربس مچل لکھنؤ اور بریلی کے معرکوں میں انگریزوں کی فوج کے ہمراہ تھا اس نے اپنی آنکھوں دیکھے واقعات تحریر کئے ہیں:

سکندر باغ کا مورچہ

جب ہم پلٹن ۹۳ کے جوان سکندر باغ کے سامنے پہنچے تو باغ میں دو منزلہ عمارت کی چھت سے ہم پر آگ برسنی شروع ہوئی (یہ عمارت اب منہدم ہو چکی ہے) چنانچہ سر کاسن کیمل کمانڈر انچیف نے کہا ۹۳ لیٹ جاؤ۔ آج انگلستان کی نگاہ میں تم میں سے ہر ایک کی اتنی ہی قدر ہے جتنا تمہارے وزن کا سونا۔ ہم سب زمین پر لیٹ گئے لہٰذا دشمن کی گولا باری بیکار ہو گئی۔ اب ہم نے دیواروں پر گولہ باری شروع کی اور اگرچہ ہمارے بہت سے سپاہی مارے گئے۔ لیکن ۴۰، ۴۵ منٹ تک مسلسل گولہ باری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوار میں رخنہ پڑ گیا اور چوتھی پنجاب رجمنٹ (جو سکھوں پر مشتمل تھی) کو حملہ کا حکم دیا گیا۔ وفادار سکھوں نے بجے خالصہ کا نعرہ مارا لیکن جب انکے دو افسر داخل ہوتے ہی مارے گئے تو خالصہ رک گیا اس پر کمانڈر انچیف نے کرنل ہیوارٹ سے کہا کہ اپنے لڑکوں کو لاؤ یہ سنتے ہی ہماری ساتویں کمپنی بگل بجنے سے پہلے ہی دیواریں پھاند کر اندر داخل ہو گئی۔

ایک بہادر خاتون

۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء، صحن میں ایک بڑا پیپل کا درخت تھا اس کے نیچے ۵۳، اور ۹۳ رجمنٹوں کے بعض جوان مردہ پڑے تھے۔ کیپٹن ڈاسن نے ایک دیندار سپاہی ویلس سے کہا ذرا بیڑ کی پھنگل پر تو نظر کرو، وہاں کوئی سپاہی تو نہیں ہے؟ چنانچہ اس نے دیکھا اور فوراً رائفل چلائی معاً ایک شخص مردہ ہو کر نیچے آن پڑا۔ چست سرخ بانات کی صدری اور گلابی ریشم کا چست پاجامہ اس کے سینے سے خون کا فوارا ابل رہا تھا کمر میں قدیم وضع کے پستولوں کی جوڑی ایک خالی دوسرا بھرا ہوا۔ تھیلے میں بارود۔ گرتے ہی صدری کے بٹن صدمے سے ٹوٹ گئے تھے تو معلوم ہوا کہ وہ ایک جوان عورت تھی نہایت خوبصورت اور قوی الجثہ۔ وہ اب تک آٹھ آدمیوں کو سلا چکی تھی جب ویلس نے دیکھا کہ وہ عورت ہے تو آبدیدہ ہو کر کہنے لگا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ عورت ہے تو میں کبھی ایسا نہ کرتا۔

شاہ نجف کا مورچہ

شاہ نجف کی دیواروں پر تیر اندازوں کی ایک جماعت ایستادہ تھی اور یہ لوگ اسقدر قادر انداز

تھے کہ ہم میں سے جو شخص ذرا بھی سر اونچا کرتا تھا نشانہ بن جاتا تھا۔ ایک سپاہی کے سر میں تیر لگا جو اسکی پیشانی میں گھس کر ایک فٹ پیچھے نکل گیا۔ دوسرے کے سینے میں لگا اور آر پار ہو کر ۳-۴ گز دور جا پڑا۔ یہ شخص ۶-۷ فٹ فضا میں تڑپا اور مردہ ہو کر گر پڑا۔ دین-دین اور اللہ اکبر کے نعرے پیہم سنائی دے رہے تھے۔ ۱۶ر نومبر کو ہم نے شاہ نجف لے لیا۔

۱۱ر مارچ ۱۸۵۸ء کو بیگم کوٹھی پر حملہ کیا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف خندق کھودی ہوئی تھی۔ لیکن ہمیں حکم تھا کہ انھیں ۱۶ر نومبر ۱۸۵۷ء کا مزہ چکھاؤ اور سکندر باغ کی جنگ کو دہراؤ۔ چنانچہ دو ڈھائی گھنٹہ تک ہر کمرہ میں زبردست جنگ ہوئی اور اندرونی صحن میں نو سو دشمن مارے گئے۔ میجر ہڈسن (غالباً وہی شخص جس نے بہادر شاہ کے فرزندوں کا خون پیا تھا) ہمارے ساتھ تھا۔ شمشیر بکف۔ وہ محض انتقام لینے کے لئے شریک تھا۔ میں نے روکا کہ اندر کمرہ میں مت جاؤ مگر اس نے نہ مانا۔ قدم رکھتے ہی سینے میں گولی لگی اور گر پڑا۔ ہم نے بارود کے تھیلوں کو دروازہ میں رکھا۔ آگ دکھائی اور دھواں کر کے دشمنوں کو باہر نکالا۔

دلی اور لکھنؤ کی لوٹ مار نے سکھوں اور انگریز سپاہیوں کو دولت مند بنا دیا ایک شخص نے فتح لکھنؤ کے دو سال کے اندر اپنا ایک لاکھ اسی ہزار پونڈ کا قرضہ ادا کر دیا۔ پرائز ایجنٹس نے بقول لندن ٹائمز مورخہ ۳۱ر مئی ۱۸۵۸ء پونے دو کروڑ کی قیمت کا مال غنیمت جمع کیا۔ دو ہفتہ بعد تقریباً ۴ کروڑ تک پہنچا۔ دشمنوں کی لاشوں سے بیگم کوٹھی کے گرد اگرد جو خندق تھی وہ بالکل پٹ گئی۔

نوٹ:۔ بیگم حضرت محل کوٹھی چونکہ کا جب محاصرہ ہوا تو موجودہ راجہ صاحب محمود آباد کے جدا مجد راجہ نواب علی خاں اور بھٹوا مئو کے جاگیر دار تجمل حسین خاں نے سامنے کے رخ سے انگریز فوج کا مقابلہ کیا۔ یہ لوگ فن جنگ سے کما حقہ آگاہ تھے خوب خوب لڑے۔ دوسری جانب مولوی احمد اللہ شاہ نے زبردست جوابی حملہ کر کے انگریزوں کو مصروف رکھا۔ کوٹھی کے اندر مردوں کے علاوہ حبشی پلٹنی اور مغلانیوں وغیرہ پر مشتمل خواتین نے باقاعدہ مدافعتی جنگ میں حصہ لیا ان جاں فروشوں کی بنا پر بیگم حضرت محل کو عقبی دیوار سے سیڑھیوں کے ذریعے کوٹھی سے نکل جانے کا موقع مل گیا۔

۱۲ر مارچ کو مردمان کیمپ کو متعین کیا گیا کہ مقتول، مجروح، مردہ و نیم مردہ سوختہ و نیم سوختہ سب کو اسی خندق میں ڈال دیں جس کو ہم نے بصد مشکل عبور کیا تھا (کوٹھی بیگم صاحبہ) اور اب ہمارے توپ خانے نے قیصر باغ اور امام باڑہ پر گولہ باری شروع کی۔

۱۶ مارچ کو دونوں مقامات فتح ہوگئے اور اب قتل عام کے بعد ہم نے سپاہ اور عوام کو غارتگری اور لوٹ مار کی اجازت دیدی۔

یورپین سکھ اور گورکھے معہ خدام اور مردمان کیمپ غیر متحاربین، غرض کہ ہر شخص لوٹ مار میں مشغول ہوگیا۔ ۱۸ مارچ کو لکھنؤ پر دوزخ کا عذاب نازل ہوا۔ جو اشیاء قابل عمل نہ تھیں سپاہیوں نے انھیں اکھٹا کر کے آگ لگا دی۔ ایک جگہ ایک جلتے ہوئے ڈھیر میں سے سارجنٹ گراہم نے کاغذوں کا بنڈل نکالا کھول کر دیکھا تو صرف ایک لاکھ کے گورنمنٹ آف انڈیا کے پرامیسری نوٹ تھے۔

بریلی کا مورچہ

۷ اپریل کو سب فوجوں کو حکم دیا گیا کہ جنرل وال پولی اور برگیڈیئر ہوپ کے زیر کمان بریلی کی طرف بڑھیں۔ شاہجہاں پور کے قریب رام گنگا پار کرانے میں ہیرالعل چوبے جی نے مدد کی۔

اس نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر رام گنگا کو عبور کیا اور سر پہ چائے کی کیتلی رکھ کر اس پار انگریزوں یعنی ۹۳ رجمنٹ کو مدد پہنچائی۔ شدید معرکہ ہوا بالخصوص جان دینے اور جان لینے والے غازیوں نے عدیم المثال قربانیوں کا ثبوت دیا۔ اب میجل کی زبانی سنیئے۔

"یہ غازی باستثنائے معدودے چند سب سالخوردہ تھے۔ ان کی داڑھیاں سفید تھیں ـــــ سبز لباس، سبز عمامے، سبز کمربند۔ صرف ڈھال اور تلوار لیکن تلواریں اس قدر تیز کہ بال کے بھی دو کر دیں انھوں نے یعنی ۱۳۳ نے صرف بیس سپاہیوں کو زخمی کیا اس کی وجہ یہ کہ وہ اندھا دھند مرنے کے جوش میں آنکھ بند کر کے ہماری سنگینوں سے ٹکرا گئے۔

ناکامی کے اسباب

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ہماری ناکامی کے خاص اسباب درج ذیل ہیں۔

۱۔ قابل اور بااثر رہنماؤں میں اتحاد و اتفاق نیز مشترک قدم اٹھانے کا فقدان۔

۲۔ سکھ اور ہندو راجاؤں کی مجموعی طور پر غداری۔

۳۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں کی عمومی طور پر جدوجہد آزادی سے بے تعلقی۔

۴۔ سکھوں اور گورکھوں کی انگریز پرستی۔

۵۔ جدوجہد آزادی کے لیڈروں میں ضرورت سے زیادہ خاندانی غرور کی موجودگی۔

۶۔ بندوق کے مقابلے میں تلوار کا کیا مقابلہ۔

تاریخ کا تدریجی عمل بہر صورت جاری رہتا ہے اور وہ قومیں جنکی سطوت و صولت سے حریفانوں کے رنگ اڑ جاتے ہیں۔ جنکے جلال و جبروت سے پہاڑوں کے دل لرزتے ہیں، جنکے دبدبۂ و طنطنہ سے بپھری موجیں پرسکون ہو جاتی ہیں۔ جب خود فروشی و خود فراموشی کا شکار ہو جاتی ہیں جب شمشیر و سناں کے بجائے طاؤس و رباب کی خوگر ہو جاتی ہیں۔ جب تلواروں کی بجائے پائل کی جھنکار طرب انگیز ہو جاتی ہے۔ جب رندی و مے پرستی کو شعار بنا لیا جاتا ہے جب گداز باہیں زندگی بن جاتی ہیں۔ جب گھنی زلفوں کی چھاؤں لازمۂ حیات بن جاتی ہے۔

تو پھر قدرت ان قوموں سے بڑا شدید انتقام لیتی ہے، انکی قاہرانہ قوت فنا کر دی جاتی ہے۔ آقا غلام بنا دیئے جاتے ہیں۔ محلات کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دیویاں باندیاں اور رانیاں داسیاں بنا دی جاتی ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں جب صدیوں کے حکمرانوں نے عیش و طرب رندی و مستی کو اپنا شعار بنا لیا تو پھر وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی

ع ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

نتیجۃً اندرونی خلفشار بڑھ گیا۔ بیرونی حملے شروع ہو گئے۔ ملکی دولت باہر نکلنے لگی اور پورا ملک سیاسی و اقتصادی بحران کا شکار ہو گیا۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد سکھوں جاٹوں

مرہٹوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا اور پھر برصغیر کی شاداب سرزمین آگ و خون سے لبریز ہو گئی ؎

سنتا تا نہیں کوئی میری کہانی
اگرچہ ہیں واں قصہ خواں اچھے اچھے
(ظفر)

یہ حالات تھے جب سراج الدین بہادر شاہ ظفر ۱۸۳۷ء میں سریر آرائے سلطنت ہوئے اور ۱۸۶۲ء میں اپنی پیشینگوئی کے مطابق ؎

نہ دبایا زیرِ زمیں انھیں، نہ دیا کسی نے کفن انھیں
نہ ہوا نصیب کفن انھیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے

دیارِ غیر میں غربت و بیچارگی کی حالت میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے
؎ کتنا ہی مختصر ہے فسانہ بہار کا

مگر بہادر شاہ نے کبھی بہار کا منہ نہیں دیکھا۔ انکی زندگی سراپا درد تھی ایام شاہزادگی سے لیکر تخت نشین ہونے تک اور پھر قید و بند سے لے کر آخر دم تک غالباً کوئی ایسا دور نہیں آیا جسے نشاط انگیز کہا جا سکے۔ یوں تو بادشاہ تھے۔ القاب و خطابات کی فہرست بھی بڑی طویل ہے۔ مگر وہ بادشاہ ہونے کے باوجود وظیفہ خوار تھے۔ وہ حکمران تھے مگر مایوس و مقہور، وہ فرمانروا تھے مگر محجوب و مقہور۔ جیسا کہ وہ خود ہی کہہ گئے ؎

نہ نکلا فلک ایک ارمان اپنا
رہی دل ہی میں آرزو سو طرح کی!

اور آلِ تیمور فرمانروائی جو کابل و قندھار سے لے کر برما و راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی۔ لال قلعہ میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر بھی بہادر شاہ بادشاہ تھے اور محل میں ولی عہدی کی جنگ جاری تھی، کاہل سست، بودے شاہزادے بادشاہی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں کوئی خوبی نہیں تھی کہ وہ کوئی کام نہیں جانتے تھے اور بدیسی حملہ آور درندے ایک ایسے موقع کی تاک میں تھے جب انھیں ــــ بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں۔ بہادر شاہ ظفر تھے ظل اللہ تھے۔ مگر کچھ بھی نہ تھے۔ وہ فن سپہ گری کے ماہر تھے مگر سپاہ کی قیادت کبھی نہیں کی وہ بہترین نشانہ باز تھے مگر قلعہ کے اندر تک، وہ اعلیٰ درجے کے تیرانداز تھے مگر اس کا مظاہرہ کبھی نہیں ہوا وہ نہایت عمدہ شمشیر زن تھے مگر اکھاڑے تک، وہ بانکے شہسوار تھے مگر میدان حرب و ضرب کے

باہر۔ وہ بڑے سیر چشم تھے اور انتہائی باحوصلہ بھی۔ محل کا ہر فرد دشمنی پر تلا ہوا تھا وزراء تک انگریزوں کے ایجنٹ تھے مگر بہادر شاہ یہی کہتے رہے ۔

کیا کب رقم ہے کوئی شکوہ میں نے

کوئی شکوہ میں نے کیا کب رقم ہے

رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں۔ خاندان کے نوجوان بیٹوں کے بیٹے تخت اور صاحب تخت کے خلاف اعلانیہ اور خفیہ سرگرم کار تھے۔ لیکن وہ انھیں نوازتا تھا، مالا مال کرتا تھا، القاب و خطابات دیتا تھا، جائیداد اور جاگیر دیتا تھا۔ حوصلہ افزائی کرتا تھا کہ ان کے دل صاف ہوں لیکن یہ اپنے رنگ پر استقلال کے ساتھ قائم تھے۔ (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد)

بہادر شاہ ظفر کو سرکار کمپنی ایک لاکھ روپیہ ماہوار دیتی تھی بادشاہ اس ایک لاکھ روپے میں سے اپنی اولاد کو اپنے نوکروں کو مشاہرہ دیتا تھا۔ (حوالہ مذکور)

حقیقت یہ ہے کہ اگر عہد بہادر شاہ سے مجاہدین تحریک حریت کی قربانیاں اور مٹھی بھر پرجوش جاں فروش لوگوں کے ایثار خارج کر دیئے جائیں تو اس دور میں نذر و نیاز، ہندو مسلم تہواروں کی رنگا رنگی یا پھر محلاتی سازش کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ یہ مجاہدین تحریک حریت کی بے لوث قربانیاں ہی ہیں جنھوں نے بہادر شاہ کو حیات ابدی بخشیں ۔ وہ آپ تو مقتول و مصلوب ہو کر سرفراز ہو ہی گئے مگر آنے والی نسلوں کے لئے بھی فتح و کامرانی کے دروازے کھولدیئے۔

مرحوم علامہ فضل حق علیہ الرحمۃ نے جو صرف عینی شاہد ہی نہیں بلکہ اس تحریک کے روح رواں بھی تھے۔ الثورۃ الہندیہ میں نہایت تفصیل سے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"ان سب نے ایک ایسے شخص کو (بہادر شاہ) اپنا سردار اور پیشوا بنا لیا جو اس سے پہلے ان کا امیر و حاکم تھا جسکے پاس ارکان دولت اور وزیر بھی تھے۔ لیکن وہ خود ضعیف و غمزدہ اور ناتجربہ کار تھا۔ عمر کی فانی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اور سچ پوچھیئے تو امیر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی شریک حیات (زینت محل) اور وزیر (حکیم احسن اللہ خاں) جو حقیقت میں نصاریٰ کا کارپرداز اور انکی محبت میں غالی تھا۔ صحیح معنوں میں حاکم و والی اور نصاریٰ کے دشمنوں کا شدید ترین مخالف تھا۔ یہی اس امیر و حاکم کے اہل خاندان کا حال تھا۔ اس میں بعض مغل شاہزادہ مقرب اور راز دار بھی تھے۔ یہ سب کے سب جو جی چاہتا تھا کرتے تھے۔ اپنی آرا پر عمل پیرا ہوتے تھے لیکن اسکی اطاعت کا دم بھرتے تھے اور وہ ایسا ضعیف دم اور ناتجربہ کار تھا کہ جانتا ہی نہ تھا۔ اس سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں کوئی بھی کام اپنی رائے

سے نہ کر سکتا تھا نہ کسی کو نفع وضرر پہنچانے کی طاقت رکھتا تھا۔ (الثورۃ الہندیہ) اور پھر حالات بدل گئے۔ انگریزوں کے ناروا سلوک اور جابرانہ اقدام اور غیر شریفانہ برتاؤ کی وجہ سے فوج میں تحریک حریت نے کروٹ لی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کی سرسبز وشاداب سرزمین کو تند وتیز بگولوں نے نگل لیا، آگ وخون کا دریا امنڈ پڑا اور تمام نشیب وفراز کالی گوری لاشوں سے پٹ گئے۔ آگرہ، بجنور، بنارس، بریلی، میرٹھ، گوالیار، علی گڑھ اور دوسرے شہروں، چھاؤنیوں سے شعلے لپکے اور دہلی کی طرف بڑھتے چلے گئے جہاں خاندان مغلیہ کا آخری فرماں روا فرنگیوں کے زیر اثر زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ رقمطراز ہیں:

"ہندوستان کا برسرپیکار باغی لشکر مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا بعض گروہ کا کوئی جنرل ہی نہ تھا۔ بعض کو کوئی جائے پناہ بھی میسر نہ تھی۔ بعض کی طاقت فقر وفاقہ نے سلب کرکے ہاتھ پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا۔ کچھ تھوڑا سا مال غنیمت ہاتھ لگنے سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ کچھ ترساں ولرزاں قلب کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے . . . . . .

. . . صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

پھر کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"شہر ودیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء جہاد اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کا فتویٰ لے کر جدال وقتال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس ناتجربہ کار سردار نے اپنے بعض ناعاقبت اندیش خائن اور بزدل اولاد کو امیر لشکر بنا دیا۔ یہ لوگ دیانتدار عقلمندوں سے متنفر تھے۔ انھیں نہ تو میدانِ کارزار ہی سے کبھی واسطہ پڑا تھا اور نہ ہی کبھی شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا موقع ہوا تھا۔ انھوں نے بازاری لوگوں کو ہم جلیس بنا لیا۔ اس طرح ناآزمودہ کار لوگ آرام طلبی واسراف بیجا اور فسق وفجور میں مبتلا ہوگئے۔"

ظاہر ہے کہ جب حالات ایسے ہوں تو پورا برصغیر بھی چند ہزار منظم اور سلاح جنگ سے آراستہ گوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور بادشاہ خود قطعاً اس قابل نہیں تھے کہ انھیں منظم کریں اور اس پرجوش عوامی تحریک یا حریت پسند لشکر کی قیادت کرسکیں اور معتمدین وہ لوگ تھے جنکی اکثریت ایجنٹی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جو حالات کا قدرتی نتیجہ تھا۔ بہادر شاہ کے حامیوں سے اکثر نے ان کا ساتھ نہ دیا شکست ہوگئی انگریز فاتحانہ شان سے دلی میں داخل ہوئے اور پھر انھوں

نے انسانیت سوز مظالم کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ (بہادر شاہ اور ان کا عہد) اسکی مزید تفصیل الثورۃ ہندیہ میں ملاحظہ ہو۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں :۔

"نصاریٰ جب لڑتے لڑتے تھک گئے اور پست ہو گئے تو غربی ہندوؤں سے مدد و معاونت کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے تھوڑی سی مدت میں لشکر و سامان حرب سے بے پناہ مدد کی اور پھر جنگ اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ انگریزوں نے پہاڑی پر بے شمار لشکر اور اسلحے جمع کر لئے انکی فوج میں گورے بھی تھے اور ذلیل تر ہندو اجیر بھی اور بد بخت و بدکیش مسلمان بھی۔ جو ایمان کے بعد نصاریٰ کی محبت میں مرتد ہو کر اپنے دین کو چند سکوں کے عوض بیچ چکے تھے اور تمام ہندوان کے ساتھی ہو چکے تھے...... ادھر جماعت مجاہدین اور لشکریوں کے ایک بہادر گروہ ـــ (جنرل بخت خاں روہیلہ اور شاہزادہ فیروز شاہ) نے ان کے حملوں کو روکنا اور ان کے مقاصد میں حائل ہونا اپنے لئے اہم ترین فرض قرار دیا۔ دن رات پیدل اور سوار داد شجاعت دیتے لگے چار مہینے تک متواتر جنگ ہوتی رہی...... بدقسمتی سے ایک شب پہاڑی کے محاذی کمین گاہ پر ایک عیش پرست بزدل اور کسلمند جماعت مقرر کر دی گئی وہ اپنے ہتھیار اتار کر آرام سے سو گئی۔ دشمن نے موقع غنیمت جان کر شب خون مارا اور ہتھیاروں پر قبضہ کر کے اسے قیامت تک کے لئے سلا دیا۔"

اور پھر باجبروت سلاطین کا پایۂ تخت دہلی موت کی آغوش میں جا سویا۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپک آسمانوں تک جا پہنچیں۔ بارود کے مسموم دھوؤں سے دم گھٹ گئے۔ گھر گھر لاشوں سے بھر گیا عصمت و عفت کی دھجیاں بکھر گئیں اور شیطانی قہقہوں سے زمین تھرا اٹھی

ع ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

اور یہ موت بڑی اندوہناک بلا تمیز ایک ایک مسلمان قتل ہو رہا تھا۔ اور وہ بھی مسلمان ہی تھے جو انکی نشاندہی کر رہے تھے۔

اور خود بادشاہ سلامت ناکارہ خوشامدیوں اور پردہ نشین عورتوں کی ایک فوج ظفر موج کے ساتھ مقبرہ ہمایوں میں جا اترے ان پر قطعاً کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ کیونکہ آگرہ میں بغاوت کی خبر سب سے پہلے انھوں نے ہی انگریزوں کو بھیجی تھی۔ اور پھر فرنگیوں کے ایجنٹ معتمدین پر انھیں بھروسہ بھی تھا۔ وزیروں مشیروں نے یہ یقین دلایا تھا کہ آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ حسب سابق آپ ہی بادشاہ رہیں گے۔ چنانچہ جب جیالا جنرل بخت خاں آگ و خون کا سمندر پار کر کے مقبرہ ہمایوں میں پہنچا اور انھیں تمام نشیب و فراز سمجھایا تو ڈکا سا

جواب ملا اور جنرل بخت خاں انگریزوں کے ہاتھ آنے سے پہلے کسی اور منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ چنانچہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

"تقدیر الٰہی نے انھیں وہیں برقرار رکھا تھا۔ انھیں اپنے جھوٹے اور مکار وزیر کی کذب بیانی پر اعتماد تھا وہ اسی مقبرہ میں بڑے خوش اور مگن تھے۔ مخدوم بنے ہوئے، دن گذار رہے تھے۔ اس فریب خوردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسرت کشیدہ دل تپیدہ بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ پابہ زنجیر شہر پہنچایا گیا راستہ میں بیٹوں پوتوں کو کسی سردار نے (مسٹر ہڈسن نے) بندوق کا نشانہ بنا دیا۔ دھڑ وہیں پھینک دیا سروں کو خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے تحفۃً پیش کیا گیا۔ (الثورۃ الہندیہ)

۲۷ر جنوری ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ ظفر فوجی کمیشن کے سامنے پیش کئے گئے پورے اکتیس روز تک ہندوستان کا بادشاہ جسکے آباؤ اجداد کے جبروت سے کائنات تھراتی تھی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوتا رہا اور وہی حکیم احسن اللہ خاں، جو کبھی وزیر تھا اور اس کے آستانے پر جبہ فرسائی کو باعث فخر سمجھتا تھا بادشاہ کے خلاف گواہی دے رہا تھا اور ایک عالم میر جعفر اور میر صادق کے ہم جنس پر لعنت بھیج رہا تھا۔

بہر صورت بہادر شاہ ظفر یکطرفہ فوجی عدالت کے سامنے اپنی صداقت ثابت نہ کر سکے۔ چنانچہ ۷ر اکتوبر ۱۸۵۸ء کو جمعہ کے دن انھیں ان کے اہل وعیال سمیت کلکتہ بھیج دیا گیا جنھیں وہاں سے بھی رنگون جلا وطن کر دیا گیا۔ ساتھ صرف زینت محل اور شاہزادہ جوان بخت تھے باقی بیگمات ولوحقین و وظیفہ خوار کلکتہ ہی سے جدا ہو گئے۔

اور پھر ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء کو نواسی سال کی عمر میں ہندوستان کا یہ آخری تاجدار قید فرنگ اور قید حیات دونوں سے آزاد ہوگیا۔

انھیں افسانۂ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

(ظفر)

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں لاہور کا کردار

(محمد دین کلیم قادری)
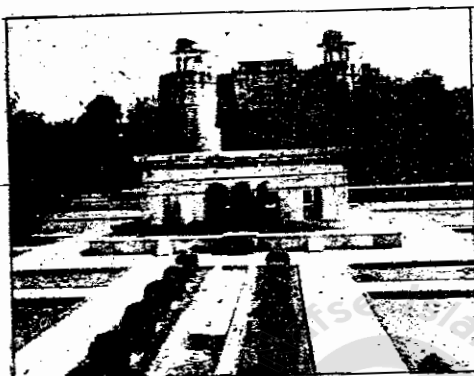
یوں تو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے اصلی کردار دہلی کے اردگرد شہر تھے۔ جن میں دہلی میرٹھ۔ لکھنؤ۔ کانپور۔ علی گڑھ۔ آگرہ۔ الہ آباد۔ شاہجہاں پور۔ میانس۔ فیض آباد اور بریلی بہت مشہور ہیں۔ اور انھوں نے اس تحریک کے احیاء کے لئے زبردست کام کیا لبعد ازاں پنجاب بھی اس میں شامل ہوا۔ اور ان شہروں میں جنگ آزادی کی حمایت میں مظاہرے ہوئے۔ انبالہ۔ لدھیانہ۔ جالندھر۔ فیروز پور۔ لاہور۔ سیالکوٹ۔ جہلم ملتان۔ ہوشیار پور۔ ساہیوال وغیرہ۔ پنجاب کی صورتحال یہ تھی کہ انگریزوں نے ۱۸۴۹ء میں دربار لاہور پر قبضہ کیا۔ انھوں نے اسوقت حفاظتی اقدامات اسطرح ادا کئے کہ سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا۔ وہ سکھ جن کو انگریزوں نے ان لڑائیوں میں زبردست شکست فاش دی تھی۔ وہ قطعی طور پر بھول گئے کہ انگریز نے ہم سے بادشاہی چھینی ہے۔ ہمارے راجہ کو جلا وطن کر دیا اور کروڑہا روپیہ اور قیمتی سامان جو قلعہ لاہور میں تھا زبردستی چھین لیا۔ اب ذرا ان کے کردار کی ایک معمولی جھلک ملاحظہ فرمائیں۔

سکھوں کا کردار

وہی سکھ جن سے انگریزی حکومت نے ان کو پے در پے شکست دے کر ۱۸۴۹ء میں پنجاب زبردستی چھین لیا تھا۔ وہی شہنشاہ دہلی کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینے کے

لئے تیار ہو گئے۔ حالانکہ ان کو قبل ازیں بے شمار شکستیں دی گئی تھیں جنکی تفصیل اسطرح ہے :-

۱:- جنگ مدکی (۱۸ دسمبر ۱۸۴۵ء) سکھوں اور انگریزوں کے درمیان ستلج کے پار ہوئی۔ مدکی فیروز پور شہر سے ۲۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ راجہ لال سنگھ خالصہ فوج کا سردار تھا اس میں سکھوں نے بے شمار جانی نقصان پر شکست کھائی۔

۲- جنگ فیروزشہر (۲۱-۲۲ دسمبر ۱۸۴۵ء) یہ قصبہ فیروز پور سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ سکھوں کا کمانڈر راجہ تیجا سنگھ تھا یہاں پہ بھی خالصہ فوج کو شکست فاش ہوئی۔

۳- جنگ بدووال (۲۱ جنوری ۱۸۴۶ء) لدھیانہ کے قریب اس جگہ جنگ ہوئی ۲۷ جنوری ۱۸۴۶ء کو گلاب سنگھ لاہور آیا اور اسکو خالصہ دربار کا وزیر بنا دیا گیا۔

۴- جنگ علی وال (۲۸ جنوری ۱۸۴۶ء) یہاں دست بدست لڑائی ہوئی بے شمار سکھ دریا میں ڈوب مرے اور سیکڑوں انگریزی توپخانہ کی زد میں آئے اور ان کو زبردست شکست ہوئی۔

۵- جنگ سبراؤں (۱۰ فروری ۱۸۴۶ء) اس جنگ میں راجہ تیجا سنگھ فوج کا کمانڈر تھا۔ جو انگریزی فوج کے زبردست حملے سے بھاگ کھڑا ہوا مگر شام سنگھ آٹاری والا یہاں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ آٹھ ہزار سکھ سپاہی قتل ہوئے اور خالصہ فوج زبردست شکست سے دوچار ہوئی۔

۶- انگریزی افواج کا لاہور میں ورود (۲۰ فروری ۱۸۴۶ء) ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے لاہور کو کنٹرول کرنے کے لئے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن تشکیل دیا۔

۷- جنگ چیلیانوالی (۱۳ جنوری ۱۸۴۸ء) اس جنگ میں لارڈ گف کمانڈر انچیف تھا جس میں سکھوں کو زبردست شکست ہوئی یہ جگہ دریائے جہلم کے پل سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔

۸- جنگ گجرات (۱۲ فروری ۱۸۴۸ء) لارڈ گف نے گجرات کے مقام پر سکھوں کو آخری شکست دے کر ان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ سکھ فوج ۶۲۰۰۰ تھی اور انگریزی سپاہ ۲۵۰۰۰۔ اس لڑائی میں شیر سنگھ۔ اس کا باپ اور امیر دوست محمد خان والئ کابل کا لڑکا اکرم خاں بمعہ دو ہزار افغانوں کے بھی شامل تھا۔

۹- مہاراجہ دلیپ سنگھ (خالصہ حکومت) کا لاہور سے مکمل اخراج (۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء)

سکھوں کی حکومت کا مکمل طور پر قلع قمع کر دیا گیا۔ یہ ایک اعلان کے ذریعے ہوا جو لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہندوستان نے فیروز پور کیمپ سے جاری کیا اور اسطرح لاہور پر انگریزوں کا مکمل طور پر تسلط ہو گیا۔

ڈاکٹر لاگن نے شاہی قلعہ لاہور کے خزانے سے جو خزانہ حاصل کیا۔ اسکی تفصیل اسطرح ہے۔

۱۔ ہیرے جواہرات اور اشرفیاں پچاس تھیلوں میں مہر بند کئے گئے جن کی قیمت ایک کروڑ پونڈ اسٹرلنگ تھی۔ (۲) کوہ نور (۳) رنجیت سنگھ کا سونے کا تخت و ہودہ (۴) شاہ شجاع الملک سے چھینا ہوا چاندی کا ہودہ (۵) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر بزرگان کے تبرکات (۶) شاہ شجاع الملک سے چھینی ہوئی ایران جرنیل رستم کی تلوار (۷) کشمیری شالوں اور دیگر ریشمی ملبوسات کے بے شمار بنڈل۔

اس ڈپٹی لاگن نے دیوان عام میں اپنا دفتر قائم کیا تھا۔ اور رہائش کے لئے جہانگیری خواب گاہ کا انتخاب کیا گیا۔ سکھوں کا خزانہ موتی مسجد میں تھا۔ جو سب حاصل کر کے بحکم سرکار ضبط کر لیا گیا۔ پنجاب کو فتح کرنے کی خوشی میں کوہ نور ملکہ وکٹوریہ کو تحفہ میں دیا گیا۔

مگر اس کے باوجود سکھوں نے مسلمانوں کے خلاف نمایاں کردار ادا کیا جو ان کی متعصبانہ اور گندی ذہنیت کا آئینہ دار تھا۔

پنجاب کے شہروں کی کیفیت

بیشتر اس کے کہ لاہور کے واقعات کی تفصیل بیان کی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے دیگر شہروں کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔ جس سے معلوم ہو سکے کہ دھلی سے لے کر دریائے بیاس تک بیشمار سکھ ریاستوں میں انگریز سے تعاون کیا گیا۔ ان غدارانہ اقدامات کی بنا پر سکھ ریاستیں وجود میں آئیں یا برقرار رہیں۔

• ۔ سیالکوٹ :۔ اس شہر میں کافی ہنگامہ ہوا۔ جولائی ۱۸۵۷ء میں دیسی فوج نے بغاوت کر کے بے انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔ مصنف فرینڈ آف انڈیا لکھتا ہے۔ کہ سیالکوٹ کے سپاہی نئے کارتوسوں کے استعمال سے کتراتے تھے۔ پھر اس مشتعل ہجوم نے گورداس پور کا رخ کیا۔ جب انھوں نے دریائے راوی عبور کیا تو ان کو جنرل نکلسن کی فوج نے تباہ و برباد کر دیا۔

ساھیوال :- پنجاب کے کھرل قبیلے کے سردار احمد خاں نے بھی انگریزی حکومت کو نیست نابود کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور انگریزوں سے زبردست جنگ کی۔ آخر اس جنگ میں یہ اور اس کے دو بیٹے مراد اور سارنگ بھی شہید ہوئے۔ مگر انھوں نے انگریزی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انگریز فوج کے افسر بارکلے کو قتل کر دیا۔

• جہلم :- باغی فوجوں نے انگریزی فوج سے جنگ کی۔ جس میں بے شمار دیسی سپاہی مارے گئے۔

• ملتان :- یہاں ۱۵ جون کو ہی دیسی فوج سے ہتھیار رکھوا لئے گئے تھے۔ ان ایام میں لاہور اور ملتان کے درمیان خبر رسانی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

• فیروز پور :- فیروز پور چھاؤنی میں بھی آلات جنگ اور اسلحہ بہت تھا۔ ایک سپاہی نے چربی والا کارتوس استعمال کیا تو سب نے اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ضلعی انتظامیہ نے حفاظتی اقدامات کے تحت میگزین تو بچا لیا لیکن چھاؤنی میں بہت سی عمارات کو نذر آتش کر دیا گیا۔

• انبالہ :- مسٹر عتیق صدیقی فرینڈز آف انڈیا کے حوالے سے لکھتا ہے کہ گورکھا پلٹن نمبر ۱۶ مقیم انبالہ نے بروقت عمل درآمد کارتوس سے انکار کر دیا۔ مزید براں خزانے میں جتنا روپیہ تھا وہ دیسی گارڈ کی بجائے گورہ گارڈ کی نگرانی میں دے دیا گیا۔

• ھوشیارپور :- یہاں آتش زنی کی بہت وارداتیں ہوئیں اس کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دی گئی مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ڈپٹی کمشنر نے پولس کی نفری بڑھادی۔ انگریز بچوں اور عورتوں کو دھرم سالہ بھیج دیا گیا۔

• جالندھر :- دہلی سے توپیں منگوا کر ڈپٹی کمشنر نے یہاں کنٹرول کر لیا۔ باغی جو قلعہ پر قابض تھے۔ ان سے قلعہ خالی کرایا گیا اور ڈپٹی کمشنر نے قلعہ کے گردونواح سے تین تین سو گز تک کے مکانات مسمار کرا دیئے۔

• لدھیانہ :- ڈپٹی کمشنر نے رؤسا کے تعاون سے خزانہ محفوظ کر لیا ایک مولوی صاحب نے کچھ لوگ اکھٹے کئے جن کو سبز جھنڈے تلے لے کر دہلی کی طرف روانہ ہو گیا خان بہادر مولوی ذکاءاللہ لکھتا ہے۔ کہ منشی رجب علی ارسطو جاہ کا لاہور میں کثرت سے آنا جانا تھا اور سرکار انگریزی کے جو ایجنٹ اس مخبری کے لئے کہ دشمن کیا حرکتیں کرتا ہے دہلی میں رہتے تھے۔ ان سب کے سردار منشی رجب علی تھے۔ ہڈسن کو یہی مجاہدین کی خبریں

پہنچانے کا ذمہ دار تھا۔

• ۔ روپڑ :۔ یہاں جن کمپنیوں نے بغاوت کی تھی ان کو توڑ دیا گیا۔ سپاہیوں کو تنخواہ بھی نہ دی گئی۔ دیسی افسر جو باغیوں کے ساتھ تھے ان کے لئے موت کی سزا تجویز ہوئی۔

• ۔ امرتسر :۔ مسٹر فریڈرک کوپر یہاں کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ یہاں پر چھاؤنی سے جو لوگ بغاوت کر کے امرتسر کی طرف گئے اس نے ان سب کا صفایا کر دیا۔ یہ انتہائی جابر قسم کا جلاد تھا۔ اس نے یہاں چار نئی قسم کی حوالاتیں قائم کیں جس پر ذرا سی بھی شبہ ہوتا اسکو حوالات میں ڈال دیا جاتا۔ بلکہ جس ہندوستانی پلٹن نے بغاوت کی اسکو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا

• ۔ گورداس پور :۔ میں بھی ڈپٹی کمشنر نے حفاظتی اقدامات اختیار کیے اور خزانہ امرتسر بھیج دیا۔ دو آدمیوں نے باغیانہ سرگرمیاں شروع کیں تو ان کو سخت سزا دی گئی۔

• ۔ راولپنڈی :۔ دو رجمنٹوں کے ۲۶ آدمی ہتھیار لے کر فرار ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثر کو تعاقب کر کے قتل کر دیا گیا۔ اور جو گرفتار ہوئے ان کو پھانسی دی گئی سات آٹھ آدمیوں کا ایک جتھہ دس بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے پہاڑوں میں جا چھپا۔ مگر ان کا بھی کھوج لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

• ۔ جھنگ :۔ جہلم سے جو فوج کے سپاہی بھاگے تھے۔ اس کا ایک صوبیدار اور آٹھ سپاہی کشتی میں بیٹھ کر نکلے۔ تو ان کو گرفتار کر کے جھنگ لایا گیا۔ جہاں انھیں پھانسی کی سزا دی گئی۔

لاہور

جھانسی۔ میرٹھ۔ لکھنو۔ اور دھلی کے ہنگاموں کی خبر جب یہاں پہنچی تو لوگوں میں بے پناہ اضطراب پیدا ہوا۔ طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ چنانچہ حفاظتی اقدامات کے لئے شہر میں بھرتی کا حکم دے دیا گیا۔ سول اسٹیشن اور انارکلی میں انگریز رہتے تھے انھوں نے حکومت سے رضا کاروں کا ایک دستہ تیار کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور حکومت نے اس تحریک کو دبانے کے لئے یہ اقدامات کئے۔

ا :۔ یہاں دیسی فوج کے گیارہ سپاہیوں کو توپ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ تاکہ لوگوں

پر اکسا رہے تھے۔یہ ۳۵ پیادہ فوج کے سپاہی تھے۔۳؍جون کو پنجاب کے چیف کمشنر کے سیکریٹری کی جانب سے حکومت ہند کے محکمہ خارجہ کو جو اطلاع دی گئی تھی اس میں یہ بھی درج تھا کہ ایسا کیا جائے۔

۳:۔ دریائے راوی کے گھاٹوں کی نگرانی شروع کر دی گئی۔

۴:۔ ملنگوں، بیراگیوں، اور فقیروں کو گرفتار کر لیا گیا۔

۵:۔ حکم دیدیا گیا کہ قلعہ میں اسقدر خوراک اسٹور کر لی جائے جو چار ہزار آدمیوں کے لئے چھ ماہ تک کافی ہو۔ اور اس کے سب دروازے بند کئے گئے۔آمدورفت کے لئے صرف ایک دروازے سے اجازت تھی۔

۶:۔ تمام فوجی سپاہیوں کی رخصتیں منسوخ کر دی گئیں اور ان کو حکم دیا گیا کہ وہ کیپٹن ٹریولرز کی کمان میں جمع ہو جائیں۔

۷:۔ انارکلی میں مقیم یورپین باشندوں کی حفاظت کے لئے ۱۳۰ رضاکاروں کا ایک دستہ بھرتی کیا گیا۔ جو یہاں پہرہ دیتے تھے۔سبحان خاں پولیس بٹالین بھی ان کی نگہداشت کرتی تھی۔

۸:۔ خطرے کے سگنل تعین کئے گئے۔ تاکہ خطرے کے وقت یورپین بچوں۔عورتوں وغیرہ کو محفوظ مقام پر منتقل کیا جاسکے۔

۹:۔ لاہور کی سڑکوں پر گھوڑ سوار فوج تعینات کی گئی۔

۱۰:۔ تمام اسلحہ خانوں اور خزانوں پر دیسی فوج کی بجائے گورہ فوج تعینات کی گئی۔

۱۱:۔ لاہور میں مقیم ہندوستانی فوجوں سے ہتھیار چھین لئے گئے اور ان کو بے دست دیا کر دیا گیا۔

چونکہ ہندوستان میں غدر کے متعلق متواتر اطلاعات اور افواہیں لاہور پہنچ رہی تھیں اس لئے حکام نے اس کا مناسب انتظام کر لیا اسوقت لاہور میں کمشنر مسٹر رابرٹ ڈپٹی کمشنر مسٹر ایجرٹن۔اسسٹنٹ کمشنر مسٹر ایبٹ اور لیفٹننٹ گلوور تھے جنھوں نے نہایت مستعدی سے اس علاقے کو شورش سے محفوظ رکھا۔یہ سب انتظامات بریگیڈیر کاربیٹ کے ماتحت سرانجام پارہے تھے۔کچھ دنوں کے بعد مزید مضبوطی کے لئے بریگیڈیر نیول چیمبرلین بھی لاہور آگیا۔

۱۲؍مئی ۱۸۵۷ء کو قلعہ لاہور میں بغاوت کا خطرہ تھا۔چونکہ یہ شہر کا ایک حصہ تھا اس لئے یہاں صبح پانچ بجے گورا فوج متعین کر دی گئی اور دیسی فوج سے قلعہ کا چارج

لے لیا گیا۔ اور شاہی مسجد کو بھی گورا فوج کا مسکن بنا دیا۔ شاہی مسجد تو مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کے بعد واگزار کر دی گئی۔ مگر گورا فوج شاہی قلعہ میں ۱۹۲۴ء تک مقیم رہی۔

۱۲؍ مئی کو فیصلہ کر لیا گیا کہ میاں میر کی دیسی فوج سے ہتھیار رکھوا لئے جائیں اس کا علم چند بڑے افسروں کے سوا کسی کو نہ تھا۔ اسی رات انگریزوں نے ناچ کا بندوبست کر رکھا تھا۔ یہ تقریب بھی جاری رہی تا کہ کسی کو شک نہ ہو اور راتوں رات گورا پلٹن کو پریڈ کے میدان میں پہنچا یا گیا۔ توپیں جا بجا نصب کر دی گئیں اور پھر دیسی افواج سے ہتھیار رکھوا لئے گئے۔ یہ کام انتہائی چالاکی اور ہوشیاری سے کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر لاہور کی ایک رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شہر میں ہندوستانیوں کو خطرناک سمجھا جاتا تھا اس لئے ان کو واپس بھیجا گیا۔ اس رپورٹ کے مطابق ہری کے پتن سے ۳؍ دسمبر ۱۸۵۷ء تک دو ہزار پانچ سو چھبیس ہندوستانیوں کو واپس بھیجا جا چکا تھا۔

۲۳؍ مئی کو مقامی اخبارات پر سنسر قائم کر دیا گیا۔ ۲۹؍ جون کو ہندوستان کی آبادی غیر مسلح کر دی گئی۔ ۹؍ جون کو ۳۵ نیٹو انفنٹری کے دو سپاہیوں کو انارکلی میں توپ سے اڑا دیا گیا۔

دہلی سے بہت سے اشتہارات لاہور بھیجے گئے جن میں لکھا تھا کہ انگریزوں کے خلاف اپنے مذہب کو بچانے کے لئے کارروائی کی جائے کیونکہ یہ حکومت مذہب بگاڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ محاصل بڑھا دیئے ہیں۔ لوگوں کو بلا وجہ قتل کیا جا رہا ہے ان کی جائیدادیں چھینی جا رہی ہیں۔ ۱۰؍ جولائی کو ۲۶ نیٹو انفنٹری نے میاں میر میں بغاوت کر دی اور لاہور کی جیلوں کو مضبوط کر دیا گیا تا کہ کوئی دیسی پلٹن جیلوں پر حملہ کر کے قیدیوں کو اپنے ساتھ نہ ملا لے۔

۲۴؍ جولائی کو گندھک اور دیگر آتشیں مصالحہ پر پابندی لگا دی گئی۔

۳۰؍ جولائی کو ۲۶؍ پیادہ فوج نے میاں میر چھاؤنی میں بغاوت کر دی۔ اور چھاؤنی چھوڑ کر چلی گئی۔ ان لوگوں نے اپنے کمانڈر میجر بنسر، کوارٹر ماسٹر سارجنٹ کے علاوہ دو دیسی افسروں کو بھی قتل کر دیا۔ جو لائین کا معائنہ کرنے آئے تھے۔ جب باغی یہاں سے بھاگے تو امرتسر کے ڈپٹی کمشنر مسٹر کوپر نے ان سب کو قتل کرا دیا۔

۲۳؍ اگست کو گھریلو ہندوستانی ملازموں کی فہرستیں بننی شروع ہوئیں۔

۲۸ ستمبر کو لندن کی وزارت خارجہ نے فریڈرک کوپر ڈپٹی کمشنر ا فسر کی ایک خاص مہم کا اعلان ان الفاظ میں کیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ میجر سپنسر کے قتل میں باغیوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔

کوپر انتہائی سخت دل آدمی تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ بد قسمت سپاہیوں میں ایک سپاہی شدید زخمی تھا اور وہ پھانسی دینے کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ مسٹر منٹگمری لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے مشورہ پر اسکی پھانسی کی سزا ملتوی کر دی گئی تاکہ وہ وعدہ معاف گواہ بن سکے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "زخمی سپاہیوں سے جس قدر واقعات معلوم ہو سکیں قلمبند کر لئے جائیں تاکہ وہ لاہور پہنچ کر باغیوں کو لاہور میں ان کے عبرت ناک انجام کی اطلاع دے سکے۔ کیونکہ لوگ ہماری باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔ نیز جتنے لوگ گرفتار ہو سکیں ان کو گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیج دیں کیونکہ لاہور سے باہر تم کافی خونریزی کر چکے ہو اور یہاں فوجیوں کے سامنے ایسی نمائش کی بہت ضرورت ہے۔" چنانچہ اس حکم کے تحت تمام زخمی اور اکتالیس باغیوں کو دیہاتوں سے تلاش کر کے لاہور بھیج دیا گیا۔ جہاں ان کو فوج کے سامنے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ کوپر لکھتا ہے کہ پلٹن نمبر ۲۶ تمام کی تمام تباہ کر دی گئی۔

سر جان لارنس ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۳ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا پنجاب میں انتظامیہ بورڈ کا رکن تھا۔ پھر یہ شخص ۱۸۵۳ء میں چیف کمشنر پنجاب مقرر ہوا۔ اور ۱۸۵۸ء میں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب رہا اور لاہور ہی میں مقیم رہا۔ لارنس اپنے ایک ملٹری افسر مسٹر کوپر کو لاہور سے خط لکھتا ہے۔

"ڈیئر کوپر!

ہندوستانی... پیادوں کی پلٹن نمبر ۲۶ پر جو فتح آپ نے حاصل کی ہے اس کامیابی پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں آپ اور آپ کی پولیس نے نہایت جرأت مندی اور دلیری سے باغیوں کی سرکوبی کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ باغیوں کی سزا یابی دوسروں کے لئے باعث عبرت ہوگی۔" (لاہور ۲ اگست ۱۸۵۷ء)

میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ لاہور کے کسی مجاہد کا نام معلوم کر سکوں جس نے ۱۸۵۷ء میں آزادی ہند کے سلسلہ میں کام کیا ہو۔ مگر نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ایسا نہ ہو سکا البتہ وفاداریوں اور جاں نثاریوں کی داستانیں ملیں۔ میاں محمد شفیع نے اپنی تالیف ۱۸۵۷ء

میں "انگریز کے خادم" کے زیر عنوان لاہور سے متعلق دو شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اسطرح ہے۔

مولوی سید رجب علی شاہ

یہ مولوی یا منشی انگریزوں کا ارسطو جاہ۔ جسے ضمیر ارسطو کی ہوا بھی نہ لگی تھی جگراؤں ضلع لدھیانہ کا رہنے والا۔ دہلی کالج کا ذہین طالب علم ملک و ملت کے درد سے بالکل بیگانہ تھا۔ حالات یوں ہیں کہ کالج سے نمٹ کر انبالہ کے پولیٹیکل ایجنٹ کے یہاں کسی اچھی آسامی پر لگ گیا پھر ریڈروی مل گئی اور وہاں سے اینس صاحب کے ماتحت ۱۸۳۹ء میں لدھیانے پہنچا۔ بعد میں لارنس صاحب کے ساتھ لاہور آیا۔ چلتا ہوا صاحب قلم اللسان تھا۔ خوب رسوخ پایا ہربرٹ ایڈورڈ نے اس کے بارے میں رائے لکھی کہ رازداری میں یہ شخص بہت قابل اعتبار ہے۔ لاہور کے گاؤکشی کے بلوے ۱۸۴۶ء میں بہادری اور تدبر کے بہت ثبوت دیئے ہیں۔ افغانستان کی جنگ میں پنجاب سے گزرنے کے لئے مولوی نے سکھوں سے اجازت دلوائی۔ غدر میں دفتر کا کوارٹر ماسٹر جنرل دہلی کا انچارج تھا۔ اور محکمہ خفیہ میں بہترین خدمات سرانجام دیں جو ہڈسن کے ماتحت تھا۔ ان خدمات کے صلے میں انگریز نے اسے خوب نوازا اور دو ہزار چھ سو چھیانوے روپے سالانہ کی جاگیر کے ساتھ خان بہادر اور ارسطو جاہ کا خطاب دیا۔ وائسرائے کا میر منشی بھی رہا۔ بڑا کام یہ کیا کہ دہلی کے بڑے قوم فروش الٰہی بخش وغیرہ کو اپنے ساتھ ملالیا اور ایسے کام کرائے کہ رہتی دنیا تک دونوں کی پیشانی پر کلنک کے ٹیکے ثبت رہیں گے۔ عہدے پنشن۔ خطاب عزتیں اور بلندیاں حاصل کرنے کے لئے ملک و ملت کا باغی ہو گئے۔ ان سمجھ دار لکھے پڑھے تجربہ کاروں نے سارا زور اس بات پر لگایا کہ کس طرح ملک ایک اجنبی قوم کے ہاتھ میں غلام بن جائے۔ ساری لیاقت اور ساری عقل اس بات میں صرف کردی۔"

علی رضا خاں قزلباش

اس نے غدر میں دہلی کے قریب ایک رسالہ بھرتی کیا اور جائداد بیچ کر خرچ بھرا۔ اس میں اس کے چاروں بھتیجے عبداللہ خاں، محمد حسن خاں، محمد زمان خاں، غلام حسین خاں اور شیر محمد خاں بھی تھے۔ اس فوج نے نکلسن کی نمایاں خدمات انجام دیں اور بہت شجاعت دکھائی محمد رضا

خاں اس کا بھائی بے حد دلیر تھا۔ مالوے اور شمس آباد میں دو مرتبہ زخمی ہوا اور دو گھوڑے مرے۔ سخت معرکوں میں بے محابہ گھس جاتا تھا۔ اس لئے آرڈر آف میرٹ حاصل کیا مراد بہادری کا خطاب دو سو روپے پنشن ملی۔ علی رضا خاں کو بڑا ئچ اور اودھ میں تعلقداری ملی۔ خان بہادری کا خطاب پایا اور تمام بھائیوں کو خان بہادری کے خطاب ملے ۱۸۶۴ء میں علی رضا خاں کو نوابی کی عزت بخشی گئی۔ اس کے بڑے بیٹے نوازش علی خاں کو مختلف اعزاز بخشے گئے اور باپ کے بعد نوابی کا خطاب ملا دوسرے بیٹے ناصر علی خاں کو بعد میں اسسٹنٹ کمشنر بنایا گیا۔

نوازش علی خاں نے خدمت خلق میں بڑی عزت پائی اور لاہور کا سب سے بڑا آدمی ہوا۔ بلکہ پنجاب کے چوٹی کے رئیسوں میں شمار ہونے لگا۔ سی۔ آئی۔ اے کا خطاب بھی پایا۔ بعد میں چھوٹا بھائی ناصر علی خاں نواب ہوا اور عزت سے کارگزاریاں دکھا کر ۱۸۹۶ء میں مرا۔ فتح علی خاں نے اسکی جگہ لی جو بھتیجا تھا۔ یہ نواب بھی اطاعت و فرماں برداری سے انگریز کے نزدیک سربلند رہا۔

انگریزوں پر جو مصائب کابل کی پہلی جنگ میں گزرے تھے ان میں علی رضا خاں نے اس سچی وفاداری اور غم خواری کا ثبوت دیا تھا کہ لندن تک کے انگریز شکر گزار ہوئے یہ سب کچھ تھا۔ انسانیت و ہمدردی اور خدمت خلق کا جذبہ رکھتے تھے۔ لیکن اس وقت تو ملک کی آزادی کا ذکر ہے۔ اگر وہ ہندوستانی ہو گئے تھے تو ہندوستان کو بجائے اجنبی طاقت کے ہاتھ بیچنے کے خود مختاری کی راہ پر ڈالنے میں جاں نثاری کرتے پھر ہم کیا سارا ملک ان کی قصہ خوانی کرتا۔ جیسے مولوی امداد اللہ شہید۔ بخت خاں۔ بہادر خاں اور دیگر رہنماؤں کی ہو رہی ہے۔"

مرزا غلام مرتضیٰ قادیانی

کتاب "مرزائیت کا سیاسی محاسبہ" میں جانباز مرزا لکھتے ہیں۔

"۱۸۵۷ء کے وسط میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ قریب تھا کہ انگریزی راج اس بھٹی میں جل کر راکھ ہو جاتا۔ اندرون ملک کے بعض عناصر نے اس جلتی ہوئی آگ کو اپنے خون سے ٹھنڈا کرنے میں انگریز قوم کا ساتھ دیا۔ ان میں پنجاب کا سکھ اور ضلع گورداس پور قصبہ قادیان کا ایک رئیس مرزا غلام مرتضیٰ خاص طور پر قابل ذکر ہیں چنانچہ

میرزا غلام مرتضیٰ کا بیٹا میرزا غلام احمد خود اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ "میں ایک ایسے خاندان میں سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔ میرا والد میرزا غلام مرتضیٰ، گورنمنٹ کی نظر میں ایک وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا۔ جن کو گورنمنٹ کے دربار میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ "رئیس پنجاب" میں ہے اور انھوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکار انگریزی کی مدد کی تھی یعنی پچاس سوار گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانۂ غدر کے وقت سرکار انگریزی کی امداد میں دیئے تھے۔ ان خدمات کی وجہ سے چٹھیات خوشنودیٔ حکام ان کو ملی تھیں۔ پھر میرے والد کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی میرزا غلام قادر خدمات سرکاری میں مصروف رہا جب تر موں کے پتن پر مفسدوں کا سرکار انگریز سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکار انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک تھا۔

اس مضمون کی تیاری میں ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ تاریخ لاہور مصنفہ رائے بہادر کنہیا لال ۱۸۸۴ء۔ لاہور۔

۲۔ ہسٹری آف پنجاب مصنفہ شمس العلما سید محمد لطیف۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۸۹ء

۳۔ گزیٹئرڈسٹرکٹ لاہور مرتبہ بی سی والکر۔ آئی۔ سی۔ ایس ۱۸۹۳ء۔ لاہور۔

۴۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ مصنفہ شیخ حسام الدین۔ لاہور ۱۹۴۷ء۔

۵۔ لاہور پاسٹ اینڈ پریذیڈنٹ مصنفہ ڈاکٹر محمد باقر ایم اے پی ایچ ڈی۔ لاہور ۱۹۵۲ء

۶۔ ہسٹری آف لاہور مصنفہ شمس العلما سید محمد لطیف۔ بار دوم ۱۹۵۶ء۔

۷۔ ۱۸۵۷ء۔ مصنفہ میاں محمد شفیع پی سی ایس بار دوم لاہور ۱۹۵۷ء

۸۔ نقوش لاہور نمبر۔ لاہور ۱۹۶۲ء

۹۔ گل خنداں۔ آزادی ۱۸۵۷ء نمبر۔ لاہور۔ جولائی ۱۹۶۲ء

۱۰۔ اٹھارہ سو ستاون (اخبار اور دستاویزیں) عتیق صدیقی دہلی ۱۹۶۶ء

۱۱۔ ۱۸۵۷ء مصنفہ غلام رسول مہر۔ لاہور ۱۹۷۱ء

۱۲۔ اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد مصنفہ غلام رسول مہر۔ لاہور ۱۹۷۱ء

۱۳۔ پنجاب کی سیاسی تحریکیں مصنفہ عبداللہ ملک۔ لاہور ۱۹۷۱ء

جنگ آزادی میں سندھ کا حصہ

از:- پروفیسر رحمت فرخ آبادی
تلخیص :- احمد میاں برکاتی

پس منظر

برصغیر ہند و پاک میں انگریزوں نے سندھ کے علاقے میں کلہوڑوں کے دور میں قدم رکھا۔ جب سے انگریزوں کے سندھ سے بڑے گہرے اور تجارتی تعلقات تھے۔ اسی دوران ۱۸۰۹ء میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے یہ بھی طے پایا تھا کہ دونوں ملکوں (سندھ اور برطانیہ) کے درمیان کبھی بھی جذبہ عناد پیدا نہ ہوگا۔ ۱۸۲۰ء تک انگریزوں کی پالیسی یہ رہی کہ تالپور امیروں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں اور ۱۸۲۰ء میں اسی معاہدہ عدم مداخلت کی پھر تجدید ہوئی۔ ۱۸۲۸ء میں ڈاکٹر الیگزینڈر برنس، پرنس علی مراد کے علاج کے لئے بمبئی سے آیا۔ برنس قابل ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جاسوس بھی تھا اس نے سندھ کی طبی و سیاسی حالت کے نقشے بنا کر خفیہ طور پر انگریزوں کو بھیجے اور انھیں لکھا کہ "یہاں کے عوام" تالپور سرداروں سے اتنے عاجز ہیں کہ وہ اس مصیبت سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں [1]

۱۸۳۲ء اور پھر ۱۸۳۴ء میں انگریزوں نے تالپور حکمرانوں سے اور معاہدے کئے جن کی رو سے انھیں سندھ پر بالادستی حاصل ہونے لگی ۱۸۳۸ء میں انگریز سندھ پر

بالادستی حاصل کر چکا تھا۔ اور بالآخر اگست ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے تمام معاہدے توڑ کر سندھ پر قبضہ کرلیا۔ سندھ کے باشندے اس طرح اپنی آزادی کی دولت کو گنوا کر سیاسی مفلس بن گئے۔ لیکن عوام میں جذبۂ آزادی باقی رہا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ جذبہ سندھ کے خاص امیر طبقہ کی وجہ سے پنپ نہ سکا۔ کیونکہ اس طبقہ نے اپنی جاگیریں بچانے کے لئے انگریزوں کا انکی ہر مشکل میں ساتھ دیا۔

" تسخیر سندھ کے بعد حیدر آباد کے شاہی محلات کو جس بے جگری سے لوٹا گیا۔ اسکی مثال چنگیزی کارناموں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شاہی بیگمات کے جواہرات کا لوٹا جانا تو ایک لازمی امر تھا۔ لیکن محض کپڑوں کے لئے ان بیگمات کو جنھیں رات کے ستاروں نے بھی بے نقاب نہ دیکھا برہنہ کر دینا انسانی ذلت کی انتہا ہے۔ حیدر آباد کی طرف سے نپیئر کو نو لاکھ روپے ملے"[۲]

۱۸۴۷ء میں سندھ کا بمبئی کے ساتھ الحاق کر دیا گیا۔ مسٹر پرنگل سندھ کا پہلا انگریز کمشنر تھا۔ ۱۸۴۹ء میں ملتان پر انگریزوں کا قبضہ ہوا ۱۸۵۰ء میں پرنگل استعفاء دے کر واپس انگلستان چلا گیا ۱۸۵۲ء میں بارٹل فریئر سندھ کا دوسرا کمشنر مقرر ہوا۔ اسی سال عربی رسم الخط میں سندھی زبان کے حروف لکھے گئے۔ جگہ جگہ مدارس و مکتب کھولے گئے تمام علوم کی تعلیم سندھی میں دی جانے لگی۔ اس سے قبل یہاں کی دفتری زبان فارسی تھی اب اسکی جگہ سندھی کر دی گئی۔

تالپور میروں کے زمانے میں سندھ کی حفاظت کے لئے چاروں طرف قلعے تھے یعنی بکھر کوٹ ڈیجی۔ امام گڑھ۔ شکارپور۔ کند کوٹ۔ فتح یاسین اور لاڑکانہ شمالی سندھ کے قلعے تھے۔ سیوہن، خدا آباد اور رانی کوٹ کے قلعے کوہستان کے بچاؤ کے لئے تھے۔ حیدر آباد اور سکرنڈ کے قلعے جنوب کی حفاظت کے لئے تھے۔ عمر کوٹ۔ اسلام گڑھ، فتح کوٹ اور نئوں کوٹ کے قلعے تھر پارکر کی حفاظت کے لئے تھے۔ منوڑا ڈیلٹا کی حفاظت کے لئے تھا۔ حیدر آباد۔ عمر کوٹ۔ کوٹ ڈیجی۔ لاڑکانہ۔ فتح گڑھ اور اسلام گڑھ کے قلعوں میں توپیں تھیں۔ انگریزوں نے ان قلعوں کی اہمیت کو محسوس کر کے سب سے پہلے بکھر امام گڑھ اور منوڑے پر قبضہ کیا۔ تالپوری لشکر بارہ ہزار سوار اور ۱۹ ہزار پیادہ پر مشتمل تھا۔ اس میں سندھی، بلوچی اور روہیلہ افغان شامل تھے۔ سر چارلس نیپئر کی کامیابی کی وجہ صرف یہ تھی کہ میانی اور دوبے کی جنگ میں غداروں نے تالپوروں کا اسلحہ اور بارود

خراب کر دیا۔ تالپوروں کی طاقت جودھ پور، بہاول پور اور قلات اور ملتان کے مقابلے میں مضبوط تھی۔ علاوہ ازیں سندھ کے ہندو امراء درپردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔

سندھ پر انگریزوں کی حکومت

۱۸۵۱ء میں انگریزوں نے میر علی مراد خاں کے معاہدہ کو جو انھوں نے میر رستم خاں سے کیا تھا۔ کالعدم قرار دیدیا اور سکھر ضلع کا ایک بڑا حصہ اور نواب شاہ چھین لیا۔ صرف موجودہ ریگستانی ٹکڑا باقی رہ گیا۔ اس حصہ کی سالانہ آمدنی ڈھائی لاکھ روپے تھی بعد میں ریاست کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل رہ گیا۔

حیدرآباد کے تالپور سرداروں کو انگریزوں نے پہلے پونا اور کلکتہ میں رکھا جن میں سے کافی نے بحالت نظربندی وفات پائی۔

۱۸۵۴ء میں جاگیرداروں کو پرانے جاگیرداری نظام عطا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں کوٹری اور حیدرآباد کے درمیان ریلوے لائن بنی ۱۸۷۴ء میں ملتان تک ریلوے لائن کی تعمیر مکمل ہوگئی۔

۱۸۵۳ء میں سندھ کے معزول تالپور سردار جو کلکتہ، ہزاری باغ، پونا، لاہور وغیرہ میں نظربند تھے آزاد کردیئے گئے اور ان کے گزارے کے لئے وظائف زمینیں اور عطیات مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۴ء میں سندھ کے جاگیروں کے تمام معاملات کو احسن طریقہ پر طے کیا گیا۔ اوائل ۱۸۵۶ء میں سر بارٹل فریر اٹھارہ ماہ کی رخصت پر تبدیلی آب و ہوا کے لئے انگلینڈ چلا گیا۔

سر بارٹل فریر کی غیر موجودگی میں شمالی مغربی سرحدی سندھ ضلع کے حاکم اعلیٰ جنرل جیکب قائم مقام کمشنر مقرر ہوئے ان کے مشیر و مددگار گبس (GIBBS) اور شا اسٹوارٹ (SHAW STUART) تھے۔ ۱۸۵۶ء میں میکڈانلڈ نے سندھ کے اکثر شہروں اور علاقوں کا سروے کیا اور پیمائش کے مطابق برج اور مینار تعمیر کرائے۔ اوائل ۱۸۵۷ء میں ایران کے شہر بوشہر کے نواح میں بغاوت ہوئی۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جنرل جان جیکب اور سر لوئیس بیلی گئے اس طرح سندھ کے قائم مقام کمشنر مسٹر ایلس مقرر ہوئے۔ اسی اثناء میں سر بارٹل فریر جو رخصت پر انگلستان گیا تھا مارچ ۱۸۵۷ء میں انگلینڈ سے واپس ہوا اور بمبئی سے ہوتا ہوا ۱۸ مئی ۱۸۵۷ء کو کراچی واپس پہنچا۔ [۳]

اس کا خیال تو یہ تھا کہ سندھ میں سیاسی بدنظمی بے چینی یا بغاوت کے آثار قطعاً نہیں ہیں چنانچہ اس نے سندھ کی بہترین فوج (1ST FUSILIERS) کو ملتان بھیج دیا تھا جہاں اس قسم کے آثار نظر آرہے تھے اس بات کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ کراچی آنے کے بعد سب سے پہلے اسے جو اطلاع ملی وہ اسی سے متعلق تھی یہ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے منیجر کا خط تھا۔ جو اس کے نائب گبس نے اسے دیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ :-

"ہم یہاں امید و بیم کی کیفیت میں ہیں۔ دھلی میں ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کر دی ہے تمام عیسائی مارے گئے ہیں اور دیگر مقامات پر فوج کی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ یہاں پر بھی کافی خطرہ محسوس کیا جاتا ہے۔ اسوقت تمام افواج پریڈ کے لئے میدان میاں میر میں نکل آئی ہیں۔ فوج کے کمانڈروں کا خیال ہے کہ کسی طرح ان سے ہتھیار رکھوا لئے جائیں۔ یہاں صرف سات سو انگریز اور ناکافی توپ خانہ ہے۔ اسوقت دس بج رہے ہیں۔ تمام دیسی افواج کو مسلح کیا جا چکا ہے اور انھیں یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ وہ سر جان لارنس لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سے ملیں۔ امرتسر میں ہمیں زیادہ خطرہ ہے کیونکہ وہاں انگریز فوج بالکل نہیں ہے ؎"

اس کے بعد ہی سر بارٹل فریر نے جنرل جان جیکب کو ۱۸ رمئی ۱۸۵۷ء کو ایک خط لکھا جس میں اس نے وضاحت کی کہ :-

"مجھے یہاں آنے کے بعد جو خبریں ملی ہیں وہ بہت پریشان کن ہیں۔ یہی حال لاہور سے آنے والی خبروں کا ہے۔ یہ خبر تمہارے اور اوٹرام کے مشورہ کیلئے ارسال کر رہا ہوں ؎"

اسی طرح ۱۹ رمئی ۱۸۵۷ء کو سر بارٹل فریر نے اوٹرم کو بھی ایک خط لکھا کہ "اس خط سے منسلک میں مسٹر میکلوڈ فنانشل کمشنر پنجاب کا ارسال کر رہا ہوں جس سے تم کو پتہ چلے گا کہ حالات کتنی نازک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ میں نے جیکب ڈی برنٹن کا خط بھی تمہیں ارسال کیا ہے جس میں کافی تفصیل سے اس بات تک کی وضاحت کی گئی ہے، میں سندھ کے حالات کا بنظر غائر جائزہ لے رہا ہوں اور ہر خطرہ سے نمٹنے کے لئے پوری طرح آمادہ ہوں۔ تمہیں یہ تو پتہ ہے ہی کہ یہاں ہماری طاقت کس قدر محدود ہے۔ خلیج فارس کے علاقے کے تم جس قدر سپاہی بھیجو گے وہ یہاں کے شمال مغربی علاقے میں بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔ برائے مہربانی یہ لکھو کہ تم کتنے فوجی جوان یہاں بھیج سکتے ہو ؎"

ان دونوں خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سر بارٹل فریر ان واقعات سے

جو برصغیر میں انقلاب ۱۸۵۷ء کی صورت میں جگہ جگہ رونما ہو چکے تھے کس درجہ پریشان تھا۔

سندھ کے حصہ لینے کی وجوہات

۱- ۱۸۴۳ء میں تالپور حکومت کے خاتمہ اور سندھ پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد یہاں کے سیاسی ماحول ہندوؤں کی وفاداری اور انتظام سلطنت میں تبدیلی کی وجہ سے اہل سندھ یکایک ذہنی طور پر مفلوج ہو گئے تھے۔ انھیں نہ تو اپنے سیاسی مستقبل کا اندازہ تھا اور نہ ہی ان کے سامنے ایسے امور تھے جن کی مدد سے وہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کر سکتے ۔ چنانچہ جب دہلی اور برصغیر کے اطراف میں ابنائے وطن نے انگریزوں کے خلاف انقلاب عظیم کا آغاز کیا تو انھوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ انکی غلامی کے دن پھرنے والے ہیں۔ اس انقلاب میں اچانک حصہ لیا جبکہ ان کے سامنے اس کے ابتدائی مقاصد بھی واضح نہ تھے۔

۲- انگریزوں کے سندھ پر قبضہ کے بعد یہاں کے با اثر برسر اقتدار اور اس حریت پسند طبقہ کو جس کا تعلق سندھ کے شمالی مغربی سرحدی علاقے سے تھا سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ انگریزوں نے فوجی نقطہ نگاہ سے پنجاب اور افغانستان کے حملے کا ہوا دکھا کر سب سے پہلے اس علاقہ پر قبضہ کیا اور تسخیر سندھ کے بعد احتیاطی تدابیر کے طور پر جیکب آباد اور شکار پور میں اہم فوجی چھاؤنیاں قائم کیں ان کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ اس علاقے کے حریت پسند عوام کی تمام تر کوششوں کو بے کار بنایا جاسکے تاکہ وہ انگریزوں کے خلاف قدم نہ اٹھا سکیں۔ لیکن اس کے برعکس انقلاب عظیم کے دور میں اس کے اثرات اسی علاقے میں زیادہ رہے اور اسی علاقے کے غیور افراد نے انگریزی جبر و تشدد کا زیادہ مقابلہ کیا۔

۳- انگریزی اقتدار سے قبل سندھ میں خان گڑھ (جیکب آباد) شکار پور، کراچی اور حیدرآباد بہت بڑی تجارتی منڈیاں تھیں۔ انگریزوں کے قبضہ کے بعد شکار پور اور جیکب آباد کی حیثیت کم ہونا شروع ہو گئی اور یہاں کی تجارت و معیشت پر انگریزوں کے زیر سایہ ہندوؤں کی تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ اس علاقے کے غیور اور حریت پسند مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے زیادہ جذبات پیدا ہوئے۔ یہی وجہ

تھی کہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں سندھ کے شمالی مغربی علاقے کے باشندوں نے زیادہ حصہ لیا۔
۴ - سندھ پر قبضہ پانے کے بعد انگریزوں نے یہاں کی ہندو اقلیت کی بے جا سرپرستی کی اور اس سلسلے میں انھوں نے مسلم اکثریت اور اس کے حقوق و واجبات کو پس پشت ڈال دیا۔ چنانچہ اس طرح مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہوئی اور مسلمانوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور انقلاب عظیم میں مقدور بھر حصہ لیا۔
۵ - انقلاب عظیم ۱۸۵۷ء سے قبل برصغیر میں جتنی بھی اصلاحی راہ میں تحریکیں اٹھیں ان میں اہل سندھ نے ہمیشہ خاطر خواہ حصہ لیا۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تحریک کا ایک بڑا مرکز پیر جو گوٹھ تھا چنانچہ بعد کے دور میں بھی اس تحریک کے اثرات یہاں کے باشندوں کے دلوں میں تازہ تھے۔ ان ہی اثرات نے ۱۸۵۷ء میں یہاں کام کیا۔
۶ - سندھ میں مقیم فوج میں اکثریت اودھ، بنگال، روہیل کھنڈ اور برصغیر کے دیگر علاقوں کے باشندوں کی تھی ان ہی لوگوں نے زیادہ تر متاثر ہو کر سندھ میں انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔
۷ - برصغیر میں انگریزوں کی پہلی اجنبی حکومت تھی۔ اس سے پیشتر دو ہزار سال میں کتنے بھی گروہ آئے وہ مستقل طور پر یہاں کے باشندے بن چکے تھے۔ بالکل یہی حال سندھ کا تھا۔ اہل فرنگ ان کے لئے اجنبی اور غاصب تھے۔ چنانچہ ان کے خلاف ہر اقدام میں سندھ نے برصغیر کا ساتھ دیا۔ یہی وجہ تھی جس کی بنا پر اہل سندھ نے ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا۔
۸ - جیکب آباد میں جنرل جان جیکب نے گذشتہ دو سالوں سے محرم کے جلوس پر پابندی لگا رکھی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں بھی اس نے اس پابندی کو برقرار رکھا۔ ۱۸۵۷ء میں محرم ستمبر کے مہینے میں تھے چنانچہ اس پابندی نے سندھ کو مجبور کیا کہ وہ ۱۸۵۷ء میں حصہ لیں جن کی وجہ سے ان کا دین و ایمان خطرے میں تھا۔
۹ - سندھ کے عوام کی ۱۸۵۷ء کے انقلاب عظیم میں حصہ لینے کی وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد ٹھٹھہ کے سادات کی جاگیریں بحال کرنے سے انکار کر دیا اور گورنمنٹ کی پالیسی اس سلسلے میں ان الفاظ میں بیان کی گئی کہ مسلمان مذہب کو تقویت دینا گورنمنٹ کی پالیسی میں شامل نہیں ہے۔ اگر یہ امداد جاری رہی تو سلاطین اپنی توجہ کارآمد امور پر مبذول نہیں کریں گے۔ گورنمنٹ سندھ کے اس فیصلہ کے خلاف حکومت ہند کی توجہ مبذول کرائی گئی لیکن گورنمنٹ آف انڈیا نے سادات ٹھٹھہ کے اس مطالبہ کو

نقصان دہ اور مبالغہ آمیز قرار دیا۔ اور ضبطی جاگیرات کا فیصلہ برقرار رکھا۔ [۱۰]

سندھ میں انقلاب کے مرکز

سندھ میں تحریک آزادی کے کئی مرکز تھے۔ ان میں کراچی، حیدرآباد، شکارپور اور جیکب آباد سرفہرست ہیں۔ ان میں حیدرآباد کو اولیت حاصل تھی انقلابیوں کا ارادہ تھا کہ حیدرآباد پر قبضہ کرنے کے بعد خیرپور، روہڑی، بہاولپور اور ملتان پہ قبضہ کیا جائے۔

کن لوگوں نے حصہ لیا

انقلاب عظیم ۱۸۵۷ء میں سندھ میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں کراچی کے دیسی سپاہیوں کی پلٹن میں اکثریت اودھ، لکھنؤ اور دہلی کے باشندوں کی تھی [۱۱] شکارپور میں حیدرآباد کے جاگرانی قبیلے کا سردار دریا خاں انقلاب کی رہنمائی کر رہا تھا [۱۲] اور اس کے ساتھ ہی جیکب آباد کا دل مراد خاں کھوسو تھا جس نے انقلاب کی ابتدا میں شکارپور اور جیکب آباد میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

داستان خونچکاں

۱۸۵۷ء کے انقلاب عظیم میں سندھ میں جو واقعات رونما ہوئے ان کے بارے میں لب تاریخ سندھ کا مصنف لکھتا ہے کہ "۱۸۵۷ء میں ایک عام بغاوت کا بہت بڑا فساد ملک ہندوستان کے اکثر حصوں میں رونما ہوا کہ اسی کی دیکھا دیکھی سندھ کے بڑے شہروں حیدرآباد، کراچی، شکارپور اور جیکب آباد میں بعض عملداروں اور سپاہیوں نے اپنی پلٹن سے نکل کر شورش اور فساد کی طرف توجہ دی لیکن اس وقت کے افسران بالا کی فراست اور اہلیت اور آنریبل گبس صاحب بہادر کی صلاحیت کی بنا پر جو اس زمانے میں جوڈیشنل اسسٹنٹ کمشنر سندھ تھے۔ اس مشکل مہم کو اس طریقے سے حل کیا گیا کہ فسادی بروقت پکڑے گئے اور ان کو ان کے کیے کی بڑی سزا ملی چنانچہ بعض کو توپ سے اڑا دیا گیا اور بعض کو پھانسی دی گئی۔ اس مشکل دور میں جن لوگوں نے اعانت، مدد اور خیر خواہی کی وہ انعام و اکرام کے مستحق قرار پائے۔

مولف کو یاد آتا ہے کہ اس ہنگامے اور فساد کے مشکل وقت میں امام بخش خان جو سندھ کی جتوئی قوم کا سردار تھا اور خان بہادر الف خان ترین افغان کو سرکار کی اعانت اور مدد کی پہلو تہی اور بدخواہی کی تہمت لگائی گئی اول الذکر اپنی سالانہ ہزاروں روپیہ کی جاگیر اور ایک ہزار روپے کے وظیفے سے محروم ہوا اور عملداروں کی نظر التفات سے بھی دور ہوا چنانچہ اس وقت فتح خان جتوئی جو امام بخش خاں کا بیٹا اور میر بخش خاں ترین جو الف خاں ترین کا بیٹا تھا جواب شکار پور میں زمیندار ہیں اور جو موروثی طور پر زمینداری پر اپنے اوقات کار بجالاتے ہیں ۔ اپنے بزرگوں کی یادگار ہیں [۱۴]

درج بالا بیان سے بھی ہمارے سامنے کئی نکات آتے ہیں ۔

(الف) ۱۸۵۷ء کے انقلاب عظیم میں اہل سندھ نے حصہ لیا۔

(ب) ۱۸۵۷ء میں سندھ کے بڑے شہروں میں حیدر آباد۔کراچی۔شکارپور اور جیکب آباد بڑے مرکز تھے۔

(ج) اس میں سپاہیوں کے علاوہ دیگر عملداروں نے بھی حصہ لیا۔

(د) انقلابیوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔

(ہ) جن لوگوں نے انقلابیوں کے برعکس انگریزوں کی مدد کی انھیں انعام واکرام سے نوازا گیا۔

(و) سندھ میں جتوئی اور ترین افغان قبیلے نے انقلاب میں بھرپور حصہ لیا۔سطور ذیل میں ہم ان ہی اہم نکات کی مزید وضاحت کریں گے

حیدر آباد میں کئی دن سے انقلاب کی افواہ گرم تھی ۔لیکن حیدر آباد مجسٹریٹ اپنی اس رپورٹ میں جو اس نے کمشنر سندھ سر بارٹل کو بھیجی لکھتا ہے کہ مجھے اس افواہ کی کوئی بنیاد نظر نہ آئی اور ابتداء میں اُسے ایک بازاری خبر سمجھا لیکن میرا یہ خیال تھا کہ عوام الناس کافی حد تک آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں ایک مقامی وطن دشمن آفیسر نے اپنے کمانڈر کو یہ اطلاع دی کہ باغیوں نے بغاوت کا پروگرام بنایا ہے اور یہ کہ شہر کے افراد ان کا ساتھ دیں گے ۔چنانچہ سب سے پہلے اس نے سرکاری خزانہ اور پے آفس کی حفاظت کا خاطر خواہ بندوبست کیا [۱۵] یہ اطلاع درحقیقت ۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو تو پخانے کے ایک دیسی صوبیدار میجر نے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ بیٹس کا میے کو دی تھی کہ فوج میں خفیہ میٹنگ ہو رہی ہے اور کچھ شر پسند عناصر اس سلسلے میں خفیہ تیاری کر رہے

ہیں بعد میں کاسبے نے یہ اطلاع بریگیڈیر مارلس کو دی [16] چنانچہ اس سلسلہ میں مزید تحقیقات کے بعد توپخانہ انگریز سپاہیوں کے سپرد کر دیا گیا۔ پھر پولیس اور ۱۳ ویں مقامی انفنٹری کے سو منتخب جوانوں کو قلعہ حیدر آباد کے اندر بھیجا گیا اور اس طرح انگریز عورتوں اور بچوں کو وہاں سے بحفاظت نکالا گیا۔ حیدر آباد کے اس واقعہ کی اطلاع کمشنر سر بارٹل فریر کو کراچی میں رات کو ۱۲ بجے دی گئی۔ کمشنر نے اسی وقت کرنل ہٹ کو طلب کیا اور باہمی صلاح مشورے کے بعد توپخانے کے ساتھ نئے بھرتی شدہ جوانوں اور روپیہ پچاس رضاکاروں کو لیفٹیننٹ ہیرس کے ہمراہ حیدر آباد بھیجا گیا [17] لیفٹیننٹ ہیرس کو جسے کراچی بھیجا گیا تھا۔ اس بات کی واضح طور پر ہدایت کر دی گئی کہ وہ انقلابیوں کو گرفتار کرنے کے بعد انہیں قرار واقعی سزا دے ہیرس کے آنے سے قبل ہی ۲۲ ویں رجمنٹ ہتھیار ڈال چکی تھی۔ لیکن اس رجمنٹ کے کچھ سپاہی بھاگ گئے تھے جو بعد میں گرفتار ہوئے اور انھیں گولی مار دی گئی [18] دوسری طرف ۱۳ ویں مقامی انفنٹری نے بھی ہتھیار ڈال دیئے تھے اس لئے انقلاب کے لئے عملی قدم اٹھانے کا کوئی بھی شائبہ باقی نہ رہا۔ البتہ رات کے وقت ان انقلابیوں میں سے کچھ راہ فرار اختیار کر گئے ہیرس نے اس سلسلے میں شک و شبہ کی بناء پر اپنی تحقیقات جاری رکھیں اور ۱۳ ویں مقامی انفنٹری نے ایک حوالدار اور کئی سپاہیوں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا۔ جو انقلابی بھاگ گئے تھے وہ بھی گرفتار ہوئے ان میں سے حوالدار کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پیش آیا۔ باقی دیگر سپاہیوں کو عمر قید کی سزا ہوئی [19] اس سلسلے میں سر بارٹل فریر کی وہ رپورٹ کافی اہمیت رکھتی ہے۔ جو اس نے پنجاب کے گورنر سر جان لارنس کو بھیجی۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ حیدر آباد میں بہت کم مشکلات کا سامنا کرنا پڑا حیدر آباد کے بارے میں وہ مزید رقمطراز ہے کہ گل انداز توپخانے کے صوبیدار میجر نے اطلاع دی کہ اس کی کمپنی کے سپاہی بغاوت کا ارادہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ بریگیڈیر نے انہیں نہتا کرنے کا ارادہ کیا اور کامیاب رہا اور ان سے اسلحہ لے کر قلعہ میں بحفاظت جمع کرا دیا جو انقلابی پکڑے گئے انہیں حکام بالا کے سپرد کر دیا گیا اور انھیں جو سزا دی گئی وہ اتنی عبرتناک ہے کہ اسکی وجہ سے اب مقامی رجمنٹوں کے اور سپاہیوں کو مزید جرأت نہ ہوگی اور اس کے اثرات شکارپور میں بھی مرتب ہوں گے۔ جہاں اسی قسم کی ایک سازش ابھی حال ہی میں پکڑی گئی ہے [20]

حیدر آباد کے بعد سندھ میں انقلاب عظیم کا دوسرا مرکز کراچی تھا۔ اس سلسلہ

میں سیٹھ ناؤنمل ہوتچند لکھتا ہے کہ۔

"اسی عرصہ میں کراچی کے دیسی پیادہ سپاہیوں کی پلٹن تھی جس میں اکثریت اودھ، لکھنؤ اور دہلی کے باشندوں کی تھی۔ کچھ لوگوں نے بغاوت کر دی لیکن انگریزی اقتدار کا ستارہ عروج پر تھا۔ سر بارٹل فریئر کی احتیاطی تدابیر کی بنا پر باغیوں کے خفیہ منصوبوں کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ غداروں پر حملہ کر کے ان کو پکڑ لیا گیا اور قرار واقعی سزا دی گئی۔ کئی لوگوں کو پھانسی دی گئی اور کچھ کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ باقی جو قیدی بچے انھیں عمر قید کی سزا دی گئی[۲۱]

۱۸۵۷ء میں کراچی کی جو کیفیت تھی اس کے بارے میں ڈاکٹر معین الحق لکھتے ہیں کہ کراچی مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانوں پر مشتمل تھا یہاں تک کہ مکانوں کی چھتیں بھی کچی مٹی کی تھیں۔ ان مکانوں کی کھڑکیاں ناپید تھیں۔ غرض شہر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ شہر کے مشرق کی طرف کچھ فاصلے پر ایک کافی طویل و عریض رقبہ فوجی چھاؤنی کا تھا۔ فریئر اسٹریٹ پر آفیسروں کے بنگلے تھے جو ملٹری بارکوں کے آگے پہلی صف بناتے تھے۔ ان کے پیچھے رجمنٹ کے کوارٹرز تھے۔ یہاں پر برطانوی سپاہیوں کے مکان جنوب کی طرف اور دیسی سپاہیوں کے مکانات شمال کی جانب صدر بازار کی طرف تھے[۲۲]

کراچی میں انقلاب عظیم کی اطلاع ایک حوالدار نے ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء بروز اتوار دن کے گیارہ بجے ایک کمانڈنٹ آفیسر میجر میکلگریگر کو دی کہ ۲۱ ویں بمبئی انفنٹری رجمنٹ کے سپاہیوں نے آدھی رات کو بغاوت کا ارادہ کیا ہے۔

ان کے نام و حلیہ اور دیگر کوائف سے پولس کپتان میجر مارسٹن نے تمام تھانوں کو مطلع کر دیا اور دیہات کے لوگوں کو ان کے بارے میں چوکس رہنے کی ہدایت کی گئی چنانچہ انقلابیوں کی حرکات و سکنات سے پولیس بہت جلد باخبر ہو گئی ان میں سے نو انقلابیوں کو صوبیدار اللہ یار خاں کی سرکردگی میں گرفتار کر لیا گیا[۲۳] یہ لوگ دراصل لسبیلہ کی طرف گئے تھے اور انہیں "بیلہ" میں گرفتار کیا گیا تھا۔ آٹھ دیگر مفرور سپاہیوں کی ایک اور جماعت کا جو کراچی کے مغرب میں پچاس میل دور تھی۔ پیچھا کیا گیا پہاڑیوں کے درمیان چھپ کر ان لوگوں نے پولیس کا مقابلہ کیا۔ لیکن تمام کے تمام مارے گئے[۲۴] پھر دو تین دن میں بقایا انقلابیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے ایک کو منگھوپیر کے قریب گرفتار کیا[۲۵] جو قیدی گرفتار کئے گئے ان میں سے کئی ایک کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ ایسے سپاہیوں کی تعداد جنھیں پھانسی

دی گئی یا توپ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ اٹھارہ تھی۔ اور تین سپاہی مقابلے میں مارے گئے تھے [26] کچھ دنوں بعد مزید ۴۳۔ افراد کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ ان میں سے چودہ افراد کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ تین افراد فرار ہوتے وقت مارے گئے۔ چار افراد کو گولی مار کر شہید کیا گیا۔ اور بقایا بائیس افراد کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا [27]

حیدر آباد اور کراچی کے بعد انقلاب عظیم کا سندھ میں تیسرا بڑا مرکز شکار پور تھا۔ یہاں اس تحریک کا نمایاں اثر نظر آتا ہے۔ جس کی کئی وجوہات تھیں۔

(الف) شکار پور میں مقامی آرٹلری میں بلوچ اور ہندوستان کے دیگر علاقے کے لوگ اکثریت میں تھے۔

(ب) شکار پور شمال میں پنجاب سے زیادہ قریب تھا جہاں اس کا فی زور تھا دوسری طرف اس کا شمال کے اہم انقلابی علاقوں اور انقلابیوں سے قریبی اور گہرا ربط بھی قائم تھا۔

(ج) شکار پور کے دو سو میل کے علاقے میں ایک بھی انگریز سپاہی نہ تھا۔

(د) بلوچستان میں کیپٹن میری ویدر کے پاس ایک معمولی فوج تھی جو اس مرکز سے کافی دور تھا۔

(ہ) شکار پور میں سندھ ہارس فورسس بنگال کو ملیری رجمنٹ کی بھی حفاظت کر رہی تھی۔ کیونکہ ان کو انقلاب کے خدشات صرف اسی رجمنٹ سے لگ رہے تھے

(و) شکار پور میں انقلابی بے چینی کے آثار جون ۱۸۵۷ء سے پائے جا رہے تھے۔ کیونکہ اسی ماہ میں کیپٹن میری ویدر کو اطلاع ملی تھی کہ دو بلوچ سردار مراد خاں اور دریا خاں فوج میں انقلاب کے جذبات پیدا کر رہے تھے۔

دریا خاں کا تعلق حیدر آباد کے جاکرانی قبیلے سے تھا جس کا وہ سردار تھا وہ انقلابیوں کے ایک سردار کی حیثیت سے حیدر آباد میں بھی سرگرم عمل تھا اور وہاں رہ کر اس نے شکار پور کے انقلابیوں سے بھی تعلق پیدا کیا تھا تا کہ عملی قدم اٹھانے میں آسانی ہو۔

سندھ میں ناکامی کی وجوہات

برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح ۱۸۵۷ء کا انقلاب عظیم سندھ میں بھی ناکام رہا

حالات کے لحاظ سے سندھ میں اس انقلاب عظیم کی ناکامی کی کئی وجوہات سامنے آتی ہیں۔
۱۔ برصغیر کے دیگر حصوں میں۔ انقلابی پہلے سے کسی حد تک تیار تھے۔ لیکن سندھ میں ۵۷ء کے انقلاب عظیم کی ابتدا اچانک ہوئی۔ جو انقلابی تھے وہ اس بات سے ناآشنا تھے کہ انقلاب عظیم کے عظیم مقاصد کو کیونکر اور کس طرح پورا کیا جاسکتا ہے۔
۲۔ سندھ پر انقلاب عظیم ۱۸۵۷ء سے چودہ سال قبل ہی انگریز قابض ہو چکے تھے ۱۸۴۳ء کی جنگوں میں اہل سندھ کو جو نقصان ہوا وہ ناقابل تلافی تھا۔ اس کے اثرات اتنے زبردست تھے کہ اہل سندھ ذہنی طور پر مفلوج ہو چکے تھے۔ اس طرح وہ انقلاب عظیم میں انگریزوں کا مکمل طور پر مقابلہ کرنے کی اپنے میں استطاعت نہ پاتے تھے جس کا نتیجہ برصغیر کے حصوں کی طرح سندھ میں بھی انقلاب عظیم کی ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوا۔
۳۔ سندھ میں کراچی، حیدرآباد، شکارپور اور جیکب آباد کے انقلابیوں میں اتحاد اور ہم آہنگی کا فقدان تھا جکی وجہ سے اہل سندھ کو انقلاب عظیم ۱۸۵۷ء میں ناکامی ہوئی۔
۴۔ انقلابیوں کے پاس نظام جاسوسی کا فقدان تھا۔ اس کے مقابلے میں انگریزوں کے جاسوس اپنے حکام کو ہر وقت انقلابیوں کی سرگرمیوں سے باخبر رکھتے تھے۔ اس طرح سندھ میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب عمل میں آنے سے قبل ہی بعض جگہ ناکام بنا دیا گیا۔
۵۔ انقلاب عظیم ۱۸۵۷ء میں سندھ کا ایک بااثر طبقہ غیر جانبدار رہا۔ چنانچہ انقلابیوں سے جکچھ امیدیں وابستہ کی جاسکتی تھیں وہ بھی پوری نہ ہوسکیں۔ دوسری طرف سندھ کے بااثر طبقہ کے چند افراد نے انگریزی اقتدار کی حمایت کی مثلاً سندھ کے رئیس شیر محمد خاں اور میر شیر نواز خاں انگریزوں کے وفادار رہے جس کا لازمی نتیجہ انقلابیوں کی ناکامی تھا۔
۶۔ سندھ میں انقلابیوں نے اپنے کام کی ابتدا اچانک کی ان کے پاس دیگر وسائل اور دولت کی کمی تھی دوسری طرف عوام الناس بھی اس بارے میں اکثر وبیشتر واقف نہ تھے جس کی بناپر انقلاب عظیم ناکام رہا۔
۷۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد ہندوؤں کو بہت عروج حاصل ہوا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان دوبارہ برسر اقتدار آئیں۔ اسکی بنیادی وجہ یہ تھی کہ فطری طور پر ہندو مسلمانوں کے خلاف رہے۔ اگر مسلمان سندھ میں کامیاب ہو جاتے

تو برصغیر کے مسلمانوں کو انقلاب کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے ایک اہم اور مضبوط مرکز مل جاتا۔ چنانچہ انقلاب عظیم کو ناکام بنانے کے لئے ہندوؤں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔

حرف آخر

برصغیر کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں سندھ میں انقلاب گو بہت ہی محدود پیمانے پر ہوا لیکن۔ اس سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں سندھ بلوچستان، قلات اور قرب و جوار کے دیگر علاقے اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور یہ کہ اس تحریک میں اہل سندھ کا بھی لباساط بھر حصہ ہے۔ اسکی وجہ پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ سب سے پہلے سندھ ہی میں مغربی بازی گروں نے ۱۸۴۳ء میں اپنے قدم محکم طور پر جما لئے تھے اور سندھ اس طرح ۱۸۵۷ء جیسے ہولناک مناظر چودہ سال پہلے ہی بھگت چکا تھا۔

حوالہجات

۱؎ جنگ میانی سے پہلے"۔ از رسول بخش پلیجو۔ ادبی خزانو۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء حیدرآباد
۲؎ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ از رئیس احمد جعفری لاہور ۱۹۵۸ء ص ۶۴۴
۳؎ آزادی جی جدوجہد ۾ سنڌ ص ۲۷
۴؎ S.M. HAQ PAGE - 296
۵؎ لائف آف بارٹل فریر از مارٹینو۔ بحوالہ آزادی جی جدوجہد ۾ سنڌ ص ۲۸-۲۷
۶؎ ایضاً ص ۲۸ ۷؎ ایضاً ص ۳۱
۸؎ ۱۸۵۷ء از غلام رسول مہر ص ۳۴
۹؎ آزادی جی جدوجہد ۾ سندھ ص ۳۳
۱۰؎ مسلمانان کراچی و سندھ کی تعلیم ص ۵۸
۱۱؎ یادگیریوں ص ۲۲۵
۱۲؎ ڈاکٹر ایس۔ ایم حق ص ۳۰۰

۱۳ے آزادی جی جدوجہد اور سندھ ص۳۳
۱۴ے تاریخ سندھ ص ۱۶۸ — ۱۶۷
۱۵ے ڈاکٹر ایس۔ ایم حق ص۲۹۹
۱۶ے آزادی جی جدوجہد ۽ سندھ ص۳۰
۱۷ے بحوالہ الالف مر بارٹل فریر۔ ایضاً صفحہ ایضاً
۱۸ے کنہیالال بحوالہ تاریخ تحریک آزادی (انگریزی) جلد دوم حصہ اول ص۲۹۶
۱۹ے آزادی جی جدوجہد ۽ سندھ ص۳۰
۲۰ے ڈاکٹر ایس۔ ایم حق ص۲۹۹
۲۱ے یادگیریوں ص۲۲۵
۲۲ے ڈاکٹر ایس ایم حق ص۲۹۷
۲۳ے ڈاکٹر ایس۔ ایم حق ص۲۹۸
۲۴ے آزادی جی جدوجہد ۽ سندھ ص۳۲
۲۵ے ڈاکٹر ایس۔ ایم حق ص۲۹۹
۲۶ے ایضاً 〃 〃
۲۷ے تحریک آزادی کی تاریخ جلد دوم حصہ اول (انگریزی) ص۲۹۵
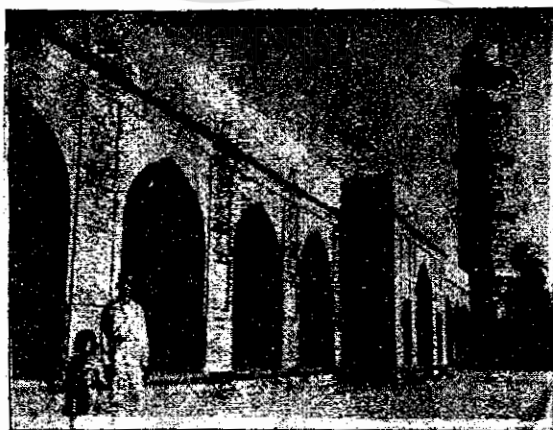
دریائے راوی کے پاس مقبرہ جہانگیر کا ایک منظر

جنرل بخت خان

ہوشیار اور قابل صوبیدار

(از:- شاہ محمد چشتی)

ابتدائی حالات

جنرل بخت خاں روہیلہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد عبداللہ خان مشہور روہیلہ مجاہد حافظ الملک حافظ رحمت خان کے پوتے تھے۔ خان بہادر خان شہید آپ کے چچا تھے۔ روہیلہ خاندان کی شوکت حافظ رحمت خان کی شہادت ۱۷۷۴ء[1] کے بعد ختم ہو چکی تھی اور پورا خاندان مصائب کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ جنرل بخت خان کے دادا غلام قادر خان نے وسائل زندگی کے لئے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ وہاں گذر اوقات کے لئے ملازمت مل گئی۔[2]

آپ کے والد عبداللہ خان نہایت حسین و جمیل جوان تھے اور اسی وجہ سے شاہان اودھ کی ایک لڑکی کی نظر میں پسندیدہ ٹھہرے اور معقول طور پر رشتہ ازدواج استوار ہوگیا۔ اسی خاتون کے بطن سے بخت خان کا تولد ہوا تو گویا شاہان اودھ آپ کے ننہیال ٹھہرے۔ اس رشتہ کی بنا پر شاہان اودھ نے آپ کے والد کو سلطان پور کی جاگیر مرحمت فرمائی۔[3]

ملازمت

سن شعور کو پہنچنے پر سلسلۂ تعلیم شروع کیا گیا ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد فن سپاہ گری پر توجہ مرکوز کر دی۔ غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے، بہت جلد اس فن میں امتیازی مقام حاصل کر لیا اور صغر سنی ہی میں فوج میں ملازمت اختیار کر لی اور انگریزی توپ خانہ میں صوبیداری کے اعلیٰ منصب پر سرفراز ہوئے۔[4] خاندان علمی تھا، علماء و صوفیاء

سے یہ لوگ نہایت قریب تھے اور صحیح سنی العقیدہ کے مالک ہونے کی وجہ سے اسلام کی قدیم رسوم کے دلدادہ تھے۔ بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دینا ان کے عقیدہ کا اہم رکن تھا بخت خان بھی اپنے خاندان میں اسی ماحول میں پروان چڑھے۔

فن سپاہ گری میں اس قدر مشاق تھے کہ انگریز ان کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ جب افغانستان میں جنگ ہوئی تھی تو جنرل سیل کے ہمراہ توپ خانہ کے افسر کی حیثیت سے گئے اور توپ خانہ کی بائری کے افسر اعلیٰ ہونے کی وجہ سے آپ کی بائری پر امتیازی نشان موجود تھا جو پھولوں سے بنایا گیا تھا۔ اس بائری کے متعلق رچنبس لکھتا ہے۔

"بخت خاں توپ خانے کے میدانی بائری کا سب سے بڑا دیسی افسر تھا اور اس بائری کے تمام توپچی دیسی تھے۔ یہ بائری خاصی مشہور تھی"۔[۲]

بخت خاں کے بارے ہومز کی رائے ملاحظہ ہو لکھتا ہے کہ:

"وہ بڑا قابل اور ہوشیار صوبیدار تھا"[۵]

افغانستان سے واپس آنے کے بعد بخت خاں بریلی چلے گئے۔ بریلی ان دنوں گوالیار کی مشہور چھاؤنی تھی۔ اس کے بعد اسلام کا یہ عظیم جرنیل ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہونے پر آبائی اثر کی وجہ سے ملازمت سے الگ ہوگیا:

"جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو بخت خاں نے انگریزوں کی ملازمت سے سبکدوشی اختیار کرلی اور بریلی آکر اپنے خاندان کے ایک سربرآوردہ نواب خان بہادر خاں کی خدمت میں پہنچا"[۶]

تحریک آزادی میں شمولیت

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی مسلمانوں کے لئے غایت درجہ کا ابتلائی دور تھا، مسلمان اگرچہ اس میں بوجوہ کامیاب تو نہ ہوسکے لیکن اپنے بعد کی نسلوں کے لئے قابل تقلید و تعمیل مثالیں چھوڑ گئے۔ تحریک کا اصل مقصد اعلائے کلمۃ اللہ تھا، انگریز مسلمانوں پر طرح طرح سے ظلم ڈھا رہے تھے۔ شعائر اسلام پر ڈاکہ زنی ان کا خاص مشغلہ تھا۔

تحریک آزادی کا آغاز ویسے تو ماہ جنوری ۱۸۵۷ء سے ہوچکا تھا جبکہ انگریزوں کے مظالم سے تنگ آکر لکھنؤ کے مسلمانوں نے جو سلطان عالم کے ساتھی تھے۔ رانی گنج کے مقام پر واقع ایک انگریز کا مکان جلا دیا تھا وجہ یہ تھی کہ وہ انگریز بے گناہ لوگوں کو تنگ کرتا تھا اور وہاں کے باشندوں کی بہو بیٹیوں کو چھیڑتا تھا۔

اس مکان کے ساتھ ہی ایک تار گھر بھی نذر آتش کر دیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انگریزوں نے منگل پانڈے کو گرفتار کر لیا اور اس کے خلاف بغاوت کا مقدمہ دائر کر دیا اور آخر کار اسے ۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو پھانسی دے دی۔ ۵ علاوہ ازیں واجد علی شاہ سے اودھ کی حکومت ۴ فروری ۱۸۵۶ء کو چھین لی گئی ۶ انگریز کا ظلم بڑھتا رہا اور وہ اپنی من مانی پورے زور و شور سے کرتے رہے۔

۹ مئی کو میرٹھ چھاؤنی میں انگریز کرنل نے پچاسی سواروں کو پریڈ پر طلب کر کے چربی کے کارتوس کاٹنے کا حکم دیا۔ ان کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی استعمال کی گئی تھی اور انہیں استعمال سے پہلے دانتوں سے کاٹ کر بندوق میں بھرنا پڑتا تھا۔ قدرتی طور پر مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی مذہبی حمیت کی بنا پر تعمیل حکم سے انکار کر دیا۔ انگریز کرنل نے ان کو دس دس برس قید کا حکم سنایا اور مزید برآں سب کو ہتھکڑیاں طوق اور بیڑیاں پہنا کر فوج سے سامنے گشت کرائی گئی تاکہ ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے۔ اس ظلم کے نتیجے میں ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہنگامہ ہو گیا، سب سے پہلے قید خانہ پر سپاہ نے حملہ کر لیا اور اپنے فوجیوں کو آزاد کرا لیا پھر انگریزی بنگلوں میں آگ لگا دی گئی اور یہ لشکر میرٹھ سے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا پورے ملک میں چپاتیوں کی تقسیم کے ذریعہ ہر شخص سے عہد لیا گیا کہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر انگریزوں کے خلاف کمربستہ ہو جاؤ۔ چنانچہ اس اسکیم سے سارے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ ۷

یہ خبر ملتے ہی علماء نے بھی اپنا فرض مذہبی بجا لانا شروع کیا لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بعض علما اسی وقت بھی انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے، بریلی میں مولانا محمد احسن نانوتوی نے جو کارگزاری کی وہ یہ تھی:

"۲۲ مئی کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے" ۸

اس واقعہ کی شہادت ایک انگریز مورخ سے بھی ملتی ہے۔ لکھتا ہے:

"اور بریلی کالج سے منسلک ایک مولوی (محمد احسن) نے مسجد میں تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے" ۹

نتیجے کے طور پر جب اس تقریر سے سنی عوام میں نفرت پھیلی تو مولانا بریلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور کرتے بھی کیا؟ جان بچانا بھی تو فرض ہے! پروفیسر ایوب قادری، انگریز مورخ کی تحریر کا ترجمہ

کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگادی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف ہوگئے۔ اگر کوتوال شہر شیخ بدرالدین کی فہمائش پر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو ان کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا" [۱۱]

بریلی سے نکال دیئے جانے کے بعد مولانا پھرتے پھراتے نانوتہ (سہارنپور) چلے آئے۔ اور پھر تحریک آزادی کو شروع ہوئے جب تین ماہ گذر چکے تھے تو پھر یہ حضرت ایک جذبے کے تحت تھانہ بھون پہنچ گئے۔ مسٹر اسپنکی نے قاضی عنایت علی رئیس تھانہ بھون کو مع چند ساتھیوں کے کسی وجہ سے پھانسی دے دی تھی جس کی وجہ سے تھانہ بھون، دیوبند اور ہم مسلک نواحی بستیوں میں آگ لگ گئی تھی۔ قاضی عنایت علی نے اپنے بھائی کے انتقام کی غرض سے مجلس مشاورت بلائی جس میں حافظ محمد ضامن، مولوی شیخ محمد تھانوی، مولوی محمد مظہر نانوتوی، مولوی محمد منیر نانوتوی، مولوی رشید احمد گنگوہی، مولوی محمد قاسم نانوتوی جمع تھے کہ مولوی محمد احسن نانوتوی بھی تشریف لے آئے، مولوی شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی اور فرمایا:

"جب قاضی عنایت علی عام جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرین مجلس میں سے بھی اس وقت کسی نے اس کو جہاد سمجھ کر اس میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جب کہ انتقام کا جذبہ کارفرما ہے، اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جا سکتا ہے" [۱۲]

چنانچہ مولانا محمد احسن نے مولانا شیخ محمد تھانوی کی تائید کی لیکن پاس ہی ان کے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر نانوتوی بیٹھے تھے انہوں نے مولانا محمد احسن کو ڈانٹا اور آخر کار فیصلہ جہاد کے حق میں دیا اور مولانا پھر نانوتہ واپس آگئے۔

اس سلسلہ میں زیادہ کہنے کا مقام نہیں ہے، صرف ایک اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ناظرین خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اس جماعت نے تحریک آزادی میں کیا کردار ادا کیا ہوگا؟

دہلی کی طرف روانگی جنرل بخت خاں نے اپنی صلاحیت صرف کرنے کے لئے دہلی کا انتخاب کیا جو ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ اس نے کافی لشکر اور لاکھوں روپیہ ساتھ لے کر دہلی کا رُخ کیا، یکم جولائی کو جنرل صاحب جمنا کے کنارے پہنچ چکے اور بہادر شاہ ظفر کو بھی اطلاع ہو چکی تھی چنانچہ شاہ نے نواب احمد قلی خان کو جنرل صاحب کے استقبال کے لئے بھیجا اور ۱۲ر جولائی کو جنرل اپنی فوج سمیت دہلی میں داخل ہو گیا دہلی جا کر اس نے مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ سے مشورہ کیا اور استفتا پیش کیا۔ چنانچہ بعد نماز جمعہ مولانا فضل حق خیرآبادی

نے ایک جاندار تقریر کی اور استفتا پر علماء نے دستخط لیے جن حضرات نے اس فتوی پر دستخط ثبت کئے ان میں سے چند یہ ہیں ۔

"مفتی صدرالدین آزردہ خاں صدرالصدور دہلی ۔ مولوی عبدالقادر ، قاضی فیض اللہ دہلوی ، مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہ وغیرہ"[1] اس فتوے کا شائع ہونا تھا کہ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی۔"[2] بس پھر کیا تھا انگریزوں کے خلاف حملے جاری ہوگئے حریت پسندوں نے جان کی بازی لگانا شروع کردی ۔ بخت خاں ، جسے تمام افواج کا اعلیٰ افسر مقرر کر دیا گیا تھا اس کارروائی کی قیادت کر رہے تھے ۔ اپنی قیادت کے دوران جنرل بخت خان نے انگریزوں پر کل چھتیس[3] حملے کئے بخت خاں بڑے منظم طور پر لڑ رہا تھا ، لکھا ہے کہ :

" محاصرے کے زمانہ میں باغیوں نے متعدد حملے کئے اور باغیوں کی لیاقت کا اچھا ثبوت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم کسی معمولی دشمن سے مقابلہ نہ کر رہے تھے ان حملوں کی تعداد ۳۶ تھی ان میں سے ہر ایک نہایت ہی منظم اور باقاعدہ اقدام اور حملہ تھا ۔"[4]

بخت خاں کی جاندار قیادت میں فوج کس دلیری سے برسر پیکار تھی ؟ ملاحظہ ہو :

" جنرل صاحب کی قیادت میں عوام نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بے جگری سے اپنے خون کی ہولی کھیلی اور ان کو معلوم ہوگیا کہ مقابلہ کسی معمولی دشمن سے نہیں ہے ۔ فوج باغی نے بڑی سختی اور مضبوطی سے فوج انگریزی پر حملہ جاری رکھا اور کوئی تدبیر یا دقیقہ ان کے وہاں سے نکال دینے میں اور غارت کرنے میں نہیں چھوڑا ۔"[5]

ناکامی جنرل بخت خاں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بظاہر انگریزوں کے خلاف کامیاب نہ ہو سکے جس کی وجہ شاہی خاندان کی چپقلش اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ کی غداری تھی ۔ لیکن جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے ، اس نے کسی قسم کی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی ۔ آخر جب ۲۰ ستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوگیا تو بخت خاں لکھنؤ کی طرف روانہ ہوگئے اور وہاں جا کر بھی اپنی مساعی جاری رکھیں لیکن بدقسمتی سے وہاں کا نظم و نسق بھی بہتر نہ ہونے کی وجہ سے ایسے مقام کی طرف چلے گئے کہ کسی کو کوئی پتہ نہ چل سکا کہ کدھر گئے ۔

حوالہ جات [1] ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی ، از میاں محمد شفیع ص ۳۰۹ ، [2] ہندوستان ، از عشرت رحمانی ص ۳۶۲ ، [3] ایضاً ص ۳۶۲ [4] ڈورروز نامچے ، بحوالہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد ، از غلام رسول مہر ص ۱۰۵ ، [5] ہومز ، بحوالہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد ، از مہر ص ۱۰۶ [6] ماہنامہ

خیال، سن ستاون نمبر ص ۲۷۲ ۔ ۷ ۱۸۵۷ء از مہر ص ۔ ۸ تاریخی شہ پارے، از مرزا علی اظہر برلاس ص ۱۶۰ ۹ سن ستاون نمبر ص ۲۰۱ ، ص ۲۹۲ ۔ ۱۰ مولانا محمد احسن، از ایوب قادری ص ۵ نیز مقدمہ خان بہادر خان ص ۱۴ ۱۱ ایضاً ص ۵۱ ، ۱۲ ایضاً ص ۵ بحوالہ فریڈم سٹرگل ان یو۔ پی۔ ۱۳ ایضاً ص ۵ بہ تصدیق مولوی اشرف علی تھانوی۔) ۱۴ تاریخ ذکاء اللہ بحوالہ باغی ہندوستان، طبع دوم لاہور ص ۱۱ ، ۱۵ ایضاً ص ۔ ۱۶ غدر کا عظیم تذکرہ بحوالہ "غدر" از رئیس جعفری ص ۹۵ ، ایضاً سن ستاون از عشرت رحمانی ص ۳۸۱ ۱۷ رسالہ تاریخ بغاوت ہند بابت اگست بحوالہ ۱۸۵۷ء کے ہیرو ص ۹۲ ۔ (از سیدہ انیس فاطمہ)

لاہور کی شاہی مسجد کے مینار سے ایک منظر
جس میں مینار پاکستان نظر آرہا ہے

شہزادہ فیروزشاہ

جنگِ آزادی کا ایک عظیم ہیرو!

جناب محمد ارشاد احمد مرزا
نے تحریر کیا

مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند نے سات سمندر پار سے آنے والی انگریز قوم کے خلاف اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے ۱۸۵۷ء میں جو بھرپور جہاد کیا وہ کتبِ تاریخ میں "جنگِ آزادی" یا "غدر" کے نام سے مرقوم ہے۔ سونے کی چڑیا ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ کے خلاف اگرچہ ملک میں بسنے والی تمام قوموں نے حصہ لیا لیکن جتنی زیادہ قربانی مسلم قوم نے اس جنگ میں دی۔ اس کا اعتراف اپنوں، بیگانوں سبھی کو ہے۔ لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے مسلمان ہیروز کے تذکار اور کارناموں سے موجودہ نسل کو کما حقہ روشناس نہیں کرایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عہدِ جدید کے مسلمانوں۔ بالخصوص نوجوانوں کو غیر مسلم شخصیات کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کا تو علم ہے۔ لیکن اپنے اسلاف کرام کی دینی خدمات اور ملت کے لئے مجاہدانہ کارناموں سے نا آشنا ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے مورخین اپنے اسلاف کرام کے حالاتِ زندگی اور کارہائے نمایاں سے موجودہ نوجوان نسل کو روشناس کرانے کی سعی فرمائیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے مسلمان مجاہدوں کے صرف اسمائے گرامی لکھنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ مسلمان قوم میں سے جن حضرات نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں جنرل بخت خاں روہیلہ، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں، حضرت محل، نواب بہادر خاں، اور شہزادہ فیروز شاہ کے اسمائے گرامی، بالخصوص نمایاں ہیں جنھوں نے اپنی شجاعت، جذبہ حب الوطنی، بصیرت ایمانی، شرافت، عزت اور بلندی ہمتی کے انمٹ نقوش تاریخ عالم میں ثبت کر دیئے۔ انہی مذکورہ اولوالعزم اور مایۂ ناز شخصیتوں میں سے شاہی خاندان کے ایک شریف النفس اور دلیر ہمت شہزادہ فیروز شاہ کے کارہائے نمایاں کا مختصر سا تذکرہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

شہزادہ فیروز دلی کے شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ناز و نعم کے ماحول میں پرورش پانے اور تربیت حاصل کرنے کے باوجود ان کی نوجوانی کی زندگی دوسرے مغل شہزادوں کے برعکس اللہ تعالےٰ کی عبادت اور خدمت خلق میں گزری۔ وہ ایک عالی قدر شہزادے تھے۔ مگر درویشانہ خصلتوں کے مالک۔ جذبۂ اخلاص ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ اور برصغیر پاک و ہند کے مسلم اکابرین مثلاً حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی و حضرت مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کی طرح اس سفید فام مگر سیاہ دل قوم کو ہندوستان سے باہر نکال دینا چاہتے تھے۔ انگریزوں کے عروج و اقتدار کو ختم کر دینا شہزادہ کی زندگی کا مقصد تھا اور آپ نے اس سلسلے میں بہت ایثار و قربانی کی اور بڑے بڑے طوفانوں سے ٹکر لی۔ بڑی اولوالعزمی کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کیا۔ بعض مقامات پر انگریزوں کو ناک چنے چبوائے اور ان کو شکستیں بھی دیں۔ مگر وائے ناکامی کہ اپنوں کی غداریاں۔۔۔ اور انگریزوں کی مکارانہ سازشیں مجاہدین کو اپنے مقاصد میں کامیاب و کامران ہونے میں حائل ہوئیں۔ یہ سب کیسے اور کیوں ہوا اس بارے میں مختصراً صرف اتنا کہا جاسکتا ہے اور مورخین نے بھی تجزیہ کیا ہے۔ کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مجاہدین کی ناکامی میں تنظیم کا فقدان اور غلط قیادت کے اسباب کارفرما تھے افسوس کہ مغلیہ خاندان کے کاہل شہزادے اور مجبور و ناتواں بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے جنرل بخت خاں روہیلہ اور شہزادہ فیروز شاہ کی مرضی اور مشوروں کے مطابق مجاہدین سے کام نہ لیا ورنہ اس جنگ آزادی کے نتائج مختلف ہوتے۔

جب تحریک آزادی کا آغاز ہوا تو اسوقت شہزادہ فیروزشاہ حج بیت اللہ کے لئے مکہ مکرمہ گئے ہوئے تھے۔ فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد آپ دہلی میں تشریف لائے اور جنگ آزادی کی آگ میں کود پڑے۔ دہلی میں بہادر شاہ ظفر نے خود مختاری کا اعلان کردیا۔ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی اور دوسرے سربرآوردہ علمائے کرام دہلی میں موجود تھے۔ جنرل بخت اپنی فوج کے ہمراہ دہلی میں وارد ہوئے۔ جنرل بخت کے مشورے اور علمائے کرام کے تعاون سے حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ مرتب کیا اور علماء کے دستخطوں سے مزین فرماکر پورے ملک میں اس فتوے کو شائع کرکے تقسیم کردایا جس سے انگریزوں کے خلاف لوگوں کے جذبات بہت زیادہ برانگیختہ ہوگئے۔ جنرل بخت خاں، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں اور شہزادہ فیروزشاہ نے اپنی قیادت میں انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے لیکن غداروں کی سازشوں سے فوج کے اندر افتراق وانتشار پھیل گیا۔ جس سے بالآخر انگریز دہلی پر قابض ہوگئے جنرل بخت خاں، مولانا فیض احمد اور شہزادہ فیروزشاہ دہلی سے لکھنؤ چلے گئے راستے میں شہزادہ نے گوالیار اور آگرہ میں انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ لکھنؤ میں آپ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی سے آملے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی حکومت تھی حضرت محل نے شہزادہ کو خلعت عطا کیا ۵ ہزار روپے دعوت کے دیئے جعفر منزل میں قیام کا بندوبست کیا۔ شہزادہ فیروزشاہ نے یہاں انگریزوں کے خلاف خوب دادِ شجاعت وصول کی اور اپنی تلوار کا لوہا منوالیا۔ آپ کی دلیری اور بلند حوصلگی نیز عالی نسبی نے اپنوں کے دلوں میں شہزادے کے بارے میں بے بنیاد خطرات اور اندیشے پیدا کر دیئے تھے۔ آپ کے بارے میں قیصر التواریخ میں لکھا ہوا ہے۔

"(آپ کے بارے میں) مشہور ہوا۔ ان کا رہنا متصل دیدِ دولت اچھا نہیں۔ یہ صاحب حوصلہ، اولوالعزم ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شاہی تخت پر بیٹھ جائیں۔" (قیصر التواریخ جلد دوم ص۳۱۴) ان باتوں سے دل برداشتہ ہوکر شہزادہ بریلی روانہ ہوگئے اور آپ کے ہمراہ اچھی خاصی فوج تھی۔ یہاں پر آپ نے خان بہادر خاں نواب بریلی کی افواج سے مل کر انگریزوں کے خلاف کامیاب جنگ کی۔ فیروزشاہ شہزادہ کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا۔ اسکی شجاعت و دلیری، ہمت و جرأت، استقامت و عزیمت اور شجاعت کی مثال تاریخ کے اوراق میں مشکل سے ملے گی۔ اسے قدم قدم پر مشکلات کا

سامنا کرنا پڑا، ہر ہر مرحلے پر رفیقان گریز پا کی عنایتوں سے دو چار ہونا پڑا۔ ساتھیوں، اور دوستوں کو جدا ا ور ساتھ چھوڑتے ہوئے دیکھا۔ لیکن شہزادہ کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ وہ کس بلا کا بہادر تھا۔ ایک شریک جنگ گل داد خاں کی زبانی سنیئے۔

"جب بریلی میں انگریزی فوج کے حملہ کی افواہ پھیلی اسوقت بہادر خاں اور فیروز شاہ کے باہم مشورے سے نکٹیا کے پل پر مورچہ لگایا گیا کیونکہ انگریزی فوج کے حملہ کا زور اسی جانب تھا۔ بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ فیروز شاہ نے بہادری اور بے جگری کے وہ مافوق البشر کارنامے انجام دیئے کہ دشمن بھی عش عش پکار اٹھے۔ جس سمت گھوڑے کی باگ موڑ دیتے صفیں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیتے۔ مجاہدین کی فوج شہزادہ کے قدم بقدم رہتی لیکن بہت سے ایسے مواقع آئے جب شہزادہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور جب گرد و غبار چھٹتا تو دیکھا جاتا کہ فیروز گھوڑے کو تھپتھپا کر شاباشی دے رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ہم سب مجاہدین کو بڑی ڈھارس بندھ جاتی اور جان توڑ کر حملہ کی تیاری شروع کر دیتے۔ اس وقت فوج دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک کی کمان فیروز شاہ اور دوسرے کی خان بہادر خان کر رہے تھے بڑی زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ جس وقت مجاہدین اللہ اکبر اور یا علی کے نعرے بلند کرتے تو دشمنوں کے دل دہل جاتے اور ان نعروں کی گونج سے ایسا معلوم ہوتا کہ عرش کے کنگورے ٹوٹ پڑیں گے۔ عین اسوقت میں نے دیکھا کہ خان بہادر خان کا ہاتھی بگڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اور ان کی فوج میں افراتفری پھیل گئی اور ہم نے سمجھا کہ خان شہید ہو گئے۔ لیکن فیروز شاہ نے ابھی تک باگ نہیں موڑی تھی اور یہ کہ وہ تنہا تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ میدان جنگ میں کھڑے ہوئے تھے۔" (العلم جنگ آزادی نمبر ص ۳۷)

خان بہادر خان کی شکست کے شہزادہ قصبہ محمدی پہنچے۔ قصبہ محمدی پر حضرت مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کا قبضہ تھا شہزادہ فیروز شاہ کی حکومت قائم ہو گئی۔ اور ان کا خطبہ اور سکہ جاری ہوا۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ۔ حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ۔

کابینہ مرتب ہوئی۔ وزیر دفاع جنرل بخت خاں، قاضی القضاۃ۔ مولانا سرفراز علی۔ اور اراکین کونسل میں مولانا لیاقت علی۔ ڈاکٹر وزیر خاں۔ مولانا فیض احمد بدایونی اور شہزادہ فیروز شاہ شامل تھے۔ احکام شرع کا نفاذ ہوا۔ ایک مہینہ بھی نہ گزرا کہ سر کالن کیمبل

نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی غداری سے شہادت پا گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ۔ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کی شہادت کے بعد سندیلہ پہنچے۔ کئی جگہ مقابلہ ہوا۔ تھانہ سرکاری کو لوٹ کر اپنا تسلط قائم کیا۔ اور اکثر اضلاع۔ تھانہ جات، بانگر مئو، صفی پور وغیرہ کو لوٹا غارت کیا پھر وہاں سے خیر آباد انگریزی فوج سے ٹکرلی۔ وہاں سے محمود آباد آیا۔ وہاں کے سب افسروں کو جمع کیا اور کہا میں نے تن بہ مرگ دیا ہے جسے مرنا ہو میرا ساتھ دے ورنہ اختیار کھلا ہے کہ چلا جائے۔ اس دن شہزادہ فاقہ سے تھا۔ آخر چار سو سوار رجمنٹ بارہ مع ظریف خان رسالدار اور ڈاکٹر وزیر خان ایک ہزار جنگی سوار کے جمع ہو کر باڑی روانہ ہوئے باڑی سے سیدھا کنار دریائے گنگ پہنچے۔ راستے میں اکثر مقامات پر انگریزوں سے سخت لڑائیاں ہوئیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب دو ڈسکوری آف انڈیا' میں شہزادہ فیروز شاہ کے بے مثل طریقہ جنگ کی تعریف کی ہے اور شہزادہ کو بہت اچھا گوریلا لیڈر تسلیم کیا۔

شہزادہ فیروز شاہ راجپوتانہ روانہ ہوا۔ وہاں سے جے پور۔ بیکانیر۔ دامن کوہسار دکن میں کئی برس سرگرداں رہا۔ وہاں قوم بھیل بھی انگریزوں کے خلاف آپ کے ساتھ شریک مقابلہ ہو گئی۔ انگریزوں نے اس مرد مجاہد کو قابو میں کرنے کے بڑے جتن کئے لیکن ناکام رہے۔ بلکہ شہزادہ کے ہاتھوں انگریزوں کو بہت نقصان پہنچا شہزادہ فیروز شاہ انگریزوں کے ہاتھ نہ آیا بلکہ دریائے اٹک پار کر کے کابل پہنچا اور وہاں سے ملک ایران میں داخل ہوا۔ پھر روس میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کئی سال بڑے سکون سے زندگی بسر کی۔ آخر... حجاز مقدس میں مستقل سکونت اختیار کر کے اپنی زندگی کے دن پورے کئے۔

شہزادہ فیروز شاہ ایک ایسی بے قرار روح تھی جو ملت اسلامیہ کی کامیابی و کامرانی کے لئے مستعد رہتی۔ اللہ تعالٰے عالی نسب و باہمت شہزادہ فیروز کی تربت پر رحمت و انوار کے پھولوں کی بارش تا قیامت برساتا رہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عظیم اللہ

کریمیا کے میدان جنگ میں

ایک نایاب رپورٹ

نمائندہ لندن ٹائمز کی زبانی

(سید مصطفیٰ علی بریلوی)

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں دہلی و لکھنؤ کی طرح کانپور کو بھی مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ نانا راؤ اس علاقے کا ہیرو شمار ہوتا تھا۔ نانا راؤ کی پشت پر ایک اور انقلابی قوت کام کر رہی تھی۔ اس کا نام عظیم اللہ خاں تھا۔ یہ بڑا پرجوش مجاہد تھا۔ اس کو نانا کے مقدمہ کے سلسلے میں انگلستان جانے کا بھی موقع ملا تھا۔ انگریزی مثل مادری زبان کے مثل بولتا تھا۔ حسین وجمیل اس قدر تھا کہ عام آدمی یورپین تصور کرتا تھا۔ دوران قیام انگلستان اس کو ایک انگریزی خاتون سے محبت ہو گئی۔ یہ انگریز عورت جذبۂ قومی سے سرشار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی عشوہ طرازیوں کے سحر میں پھانس کر عظیم اللہ خان کو بیکار بنانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کو اپنے مقصد میں شدید ناکامی ہوئی۔ غلطی سے ان کے خطوط محبت کو نانا راؤ سے وابستہ کیا گیا ہے کیونکہ وہ نانا راؤ کے محل سے برآمد ہوئے تھے۔ جناب ڈاکٹر عبدالغفور بسمل پیلی بھیتوی مرحوم نے ان خطوط محبت کا عرصہ ہوا ترجمہ شائع کیا تھا اور سید الطاف علی بریلوی نے تردیدی نوٹ کے ساتھ رسالہ "العلم جنگ آزادی نمبر" میں ان کو دوبارہ شائع کر کے حیات نو بخشی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔

ایم، بی خاتون کے سیاسی عقائد

اکثر خطوط کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک سیاسی خاتون تھی جو ناناصاحب و عظیم اللہ خاں کو صرف اس غرض سے اپنے فریب محبت میں رکھنا چاہتی تھی کہ کبھی انگریزوں کی مخالفت میں اکٹھے ہونے کی جرأت نہ کریں۔

ع کرتی ہے محبت تو گزرتا ہے گماں اور

اول خط میں لکھتی ہے کہ کس طرح انگریز امید یا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ اس قدر وسیع اور اجنبی ملک پر بغیر کسی تصادم یا بغاوت کے حکومت کر سکتے ہیں۔ تمام باتیں ایسی حالت میں ممکن ہیں۔ میرے خیال میں یہ بات ناممکن سی معلوم ہوتی ہے کہ تم اپنے ہم وطنوں کی درخواست پر ہمیں چھوڑنے پر راضی ہو گئے۔

دوسرے خط میں لکھتی ہے "سیاست سے مجھے اسی قدر محبت ہے جس قدر دوسری خواتین کو لباس سے" لیکن اس نے یہ لکھ کر کہ "میں ایک عورت ہوں۔ مبتلائے محبت عورت خود غرضی میری فطرت میں داخل ہے" اپنے آپ کو تمام شکوک اور نکتہ چینیوں سے محفوظ بنالیا۔ دوسری طرف عظیم اللہ خاں نے جس اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا اس کی داد نہیں دیجاسکتی لکھاہے۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ زبردست کمزوروں کو ستا رہے ہیں۔ اس لئے مجھے کمزوروں کی حمایت میں لڑنا چاہیئے۔ مجھے معلوم ہے کہ تاریکی تمام ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ لیکن پھر بھی طلوعِ سحر کے آثار پائے جاتے ہیں"۔

عظیم اللہ کریمیا کے میدان جنگ میں

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل عظیم اللہ خاں کے جس سفر یورپ کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اسکی تفصیل یوپی گورنمنٹ ریکارڈ جلد اول میں مسٹر رسل نمائندہ لندن ٹائمز کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

میں چند روز کے واسطے قسطنطنیہ گیا تھا۔ وہاں میرا مصری ہوٹل میں قیام رہا یہاں میں نے ایک کھلتے چہرے اور مشرقی لباس میں ملبوس خوبرو ہندوستانی نوجوان کو دیکھا جو میرے واسطے قطعی نئی چیز تھا۔ اس کی انگلیوں میں خوبصورت انگوٹھیاں تھیں اور وہ ہیرے جواہرات سے

مزین لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے فرانسیسی اور انگریزی زبان میں بات چیت کی اور ہوٹل کی میز پر کھانا کھایا۔ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے وہ ایک ہندوستانی شہزادہ تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ایک ناکام مقدمے کی پیروی کرکے واپس جارہا تھا۔ اس نے مسٹر ڈوین سے شناسائی پیدا کرلی تھی جو کریمیا میں جوزف پاکٹن کی آرمی کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے جانے والے تھے۔ میری اس شہزادہ سے ان ہی کی معرفت پہلی ملاقات ایک ہوٹل کی چھت پر ہوئی جہاں ہم نے تمباکو نوشی کا شغل کیا۔ دوران ملاقات اس نے کریمیا جانے کی شدید خواہش کا اظہار کیا اس نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ وہ سیدھا کلکتہ جانے والا ہے لیکن میں اس سے قبل ان روسی دشمنوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جنھوں نے فرانس اور انگریز اتحادیوں کو شکست دی ہے۔ جب اٹھارہ جون کو ہماری شکست کی خبر اسکو مالٹا میں معلوم ہوئی تو اس نے جوش میں آکر قسطنطنیہ اس غرض سے آنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہاں سے موقع واردات جانے کی غرض سے اس نے لندن کی سوسائٹی میں اپنی پذیرائی کی شیخی ماری اور اعلیٰ مرتبت لوگوں کے نام بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کئے اس کے طرز تکلم سے میں خود بھی متاثر ہوا۔ اگرچہ میں اسے ناپسند کرتا تھا۔ لیکن شک وشبہ کے باوصف میں اس کا احترام کرنے پر مجبور ہوگیا۔

میں نے اس کے بارے میں چند ہفتے تک نہ کچھ سنا اور نہ دیکھا تا آنکہ ایک روز ایک شریف آدمی میری قیام گاہ۔ مقام کینتھوٹ ہل مسٹر ڈوین کا مراسلہ لے کر آیا جس میں مجھ کو ہدایت کی گئی تھی کہ میں عظیم اللہ خاں کی میدان جنگ میں خندقوں کے دکھانے میں مدد کردوں۔ جب میں باہر آیا تو فوراً پہچان گیا کہ یہ تو وہی ہندوستانی شہزادہ ہے۔ میں نے اس کے گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھ میں لی اور سیدھا جنرل ہیڈ کوارٹر کی طرف گیا۔ یہ سورج غروب ہونے سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل کا وقت تھا۔ روسی توپ خانہ ابھی ابھی گولہ باری کرچکا تھا۔ یہ روسیوں کا دستور ہے کہ وہ اسی طرح گاہے گاہے گولہ باری کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ہم کو بہت تھوڑا وقت آرام کے واسطے ملتا ہے۔ اس اثنا میں پہاڑی کی جانب سے ایک گولہ آیا جہاں ہمارا دوست کھڑا تھا یہ گولہ اس کے بہت قریب پھٹا۔ میں کچھ دیر کے توقف کے بعد راستہ پا سکا۔ جب گرد وغبار چھٹا تو میں نے وہاں عظیم اللہ خاں کو پایا جو خندقوں میں چلا گیا تھا اور گہری دلچسپی کے ساتھ روسیوں کی فائرنگ دیکھ رہا تھا میں نے اس کو بتایا کہ ایسے موقع پر اسکو کیا کرنا چاہیئے اور آگے جانے سے اپنی معذوری ظاہر کی کیونکہ مجھے ایک لائٹ ڈویژن کے ایک ڈنر میں حصہ لینا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میرے دوست کے یہاں ڈنر میں چلئے۔ اس نے انکسار کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ یہ خیال رکھیں کہ میں اچھا مسلمان ہوں۔ میں نے جواباً کہا کہ تم مسٹری کے ساتھ کھانا کھاتے ہو۔ اس نے کہا

ـــــــــــــ ہاں ٹھیک ہے۔ میں مذاق کر رہا تھا۔ میں کوئی بے وقوف آدمی ہوں جو ایسی احمقانہ باتوں پر یقین کروں (مطلب یہ کہ میں متعصب نہیں ہوں) میں جب رات کو کیمپ واپس آیا تو وہ خیمے میں سو رہا تھا۔ میرے ملازم نے بتایا کہ اس نے میرا سامان بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا۔ صبح کو وہ مجھ سے پہلے اٹھ بیٹھا۔ میز پر میں نے ایک کاغذ کا ٹکڑا پایا جس میں لکھا تھا۔

"عظیم اللہ خاں رسل کا شکریہ ادا کرتا ہے اور اسکی ذاتی توجہات کا صدق دل سے مشکور و ممنون ہے۔"

عظیم اللہ خاں کی شخصیت

یہ شخص جیسا کہ اب ہم سب جانتے ہیں کہ نانا صاحب کا سکریٹری (اتالیق بھی رہ چکا تھا) اور کانپور کے قتل عام کا محرک تھا (یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کانپور میں انگریزوں کا قتل عام نانا راؤ کی ایک ملازمہ عزیزن نامی کی انگریز دشمنی کا نتیجہ تھا اور عظیم اللہ اور نانا کا ہاتھ نہیں تھا) اب یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ عظیم اللہ کیوں جنگ کریمیا اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اس قدر مشتاق تھا۔ ایک یوروپین کے واسطے جنگ میں اس قدر دلچسپی لینا کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن ایک ایشیائی کا اس قدر انہماک معنی خیز بات ہے (رسل صاحب ہمیشہ اس قسم کی لن ترانی گاتے ہیں) عظیم اللہ خاں نے برطانوی افواج کو ایک قسم کی مایوسی کی کیفیت میں دیکھا۔

ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان واپس جاکر وہ نانا کے ہمراہ سیدھا لکھنو گیا اور کچھ عرصہ تک مقیم رہا۔ اس کے بعد یہ دو معزز ساتھی ایک ہندو، دوسرا مسلمان تیرتھ یاترا کے بہانے سے پہاڑی کی طرف گئے۔ نیز انھوں نے انبالہ تک .... گرانڈ ٹرنک روڈ کے چیلہ ملٹری اسٹیشن دیکھے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ان کا پروگرام شملہ جاکر گورکھا رجمنٹ شملہ کو باغی کرنا تھا لیکن یہاں پہنچ کر ان کو معلوم ہوا کہ گورکھا رجمنٹ کا ایک حصہ انبالہ میں مقیم ہے۔ وہ اس پر اثر انداز نہ ہو سکے لہٰذا مایوس ہو کر شملہ کا ارادہ جاڑے کی شدت کی وجہ سے ملتوی کر دیا ان حالات میں نانا راؤ کا طرز عمل سمجھ میں آتا ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد عظیم اللہ خاں اور نانا راؤ دونوں لاپتہ ہو گئے اور آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ کیا انجام ہوا۔ اغلب ہے کہ یوپی کے پہاڑی دامن ترائی کی مرطوب آب و ہوا کا شکار ہو گئے۔
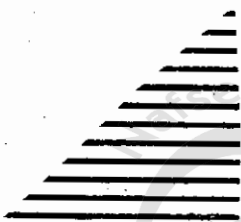
(اسد نظامی)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جہاں علماء و مشائخ، شعرائے اہلسنت نے فرنگی تسلط کے خلاف کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہیں پر سنی ادیب حضرات نے بھی برطانوی استعمار کے خلاف بذریعہ قلم جو بھرپور کردار انجام دیا ہے اسے ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا ؎

بھلا دینا نہیں آساں شہیدوں کے زمانے کو
زمانہ چاہیئے خونی نوشتوں کے مٹانے کو

ذیل میں چند ادیبوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمود الخیر صاحب انصاری القریشی شہید

خطۂ ملتان کے مشہور علمی خاندان قوم انصاری (جو کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالٰی عنہ کی اولاد میں سے ہے۔ اور حضرت محمد بن قاسم کے ہمراہ سرزمین عرب سے ملتان میں قیام پذیر ہوا۔) کی مشہور و معروف علمی شخصیت حضرت علامہ قاضی محمود الخیر شاہ انصاری وہ شخصیت تھی جس نے اپنی خداداد صلاحیت کے پیش نظر لیئے ادبی مخصوص انداز میں برطانوی استعمار کے نام ہندوستانی مسلمانوں کو پیغام بیداری دیا اس اہم موضوع پر دستی یا پریس پر اشتہارات

پمفلٹ اور کتابچے شائع کرنے کا جو اہم فریضہ انجام دیا۔ ان میں سے سر دست مختصر لفظوں میں "برطانوی استعمار کے نام" سے ایک اقتباس ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

برطانوی حکمرانوں کے مذموم ہتھکنڈے

"برادرانِ اسلام جب سے یہ برطانوی سامراج ہم پر مسلط ہونے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ صوبہ بنگال اور دیگر متعدد علاقوں پر بزور دجل و سالوس کے مسلط ہو چکے ہیں۔ ایسا کرنے کا انھیں ہرگز حق نہیں تھا کیونکہ انگریز جہانگیر کے دورِ حکومت میں بطور ایک مہمان کے آئے تھے بطور حاکم نہیں۔

اے برطانوی حکام! تم غاصب ہو ہمارے ملک کے بعض حصوں پر تم نے جو قبضہ کر رکھا ہے وہ سراسر ناجائز ہے۔ بالآخر بالادستی ہمیں حاصل ہوگی اور تمہیں ایک نہ ایک دن اس ہندوستان سے بے نیل و مرام ہو کر واپس لوٹنا ہی پڑے گا۔

منجانب:۔ انجمن مجاہدین اہل سنت وجماعت ملتان شریف"

حضرت مخدوم محمود الخیر شاہ صاحب شہید علیہ الرحمۃ کی جرأت ملاحظہ فرمائیے کہ جو برطانوی سامراج کی پرواہ کئے بغیر باطل کے سامنے ڈٹ گیا۔ باطل کے زعم کو پاش پاش کرنے کا تہیہ کر کے میدانِ عمل میں آگیا۔ جب اسی قسم کے جرأت مندانہ اقدام کی وجہ سے اشتہارات کا سلسلہ شروع ہوا تو انگریزوں نے ایڈورڈ نامی ایک شخص اور دیگر سپاہیوں کو بھیج کر خونی برج ملتان کے قریب ایک مسجد میں آپ کو شہید کرا دیا۔ تاریخ شہادت ۲۲ ماہِ رمضان المبارک ہے۔

حضرت قاضی پیر بخش صاحب جامپوری

قصبہ جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پنجاب کا عظیم ہیرو ہو گزرا ہے جس نے دنیائے سنیت کی بہترین خدمت کی ہے۔ آپ حضرت مولانا فضل امام صاحب خیر آبادی و مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔

آپ میں شعر و شاعری کے ذوق کے ساتھ ادبی ذوق کا جذبہ بھی کافی تھا۔ آپ ضلع ڈیرہ غازی خاں میں برطانویوں کے خلاف بے شمار دستی اشتہارات لکھ کر در و دیوار پر رات کی تاریکی میں چسپاں کرتے تھے۔

چنانچہ آپ کی تحریر کا اقتباس بھی یہاں قارئین حضرات کی دلچسپی کے لئے درج کیا جاتا ہے۔

"میرے ہموطن دوستو!

یہ برطانوی استعمار جو روز بروز اپنا پاؤں پھیلائے جا رہا ہے جو کہ سکھا شاہی سے بھی بدترین ہے۔

سکھ تو گرونانک کے پرستار تھے۔ یہ گورے تثلیث پرست ہیں، جو کہ مسلمانوں کے لئے سم قاتل سے ہرگز کم نہیں لہٰذا اسے اپنے ناپاک منصوبوں میں کامیاب نہ کیا جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے ان عیسائیوں کی حوصلہ شکنی کی جاتے تاکہ یہ لوگ ہم پر مسلط نہ ہو سکیں۔

فقط والسلام مع الاکرام

فقیر پیر بخش قریشی جامپوری ضلع ڈیرہ غازی خان

پنجاب ؁"

جب اسی قسم کے دستی اشتہارات برطانوی حاشیہ برداروں کے توسط سے برطانوی حکام کی نظر سے گزرے تو رات کی تاریکی میں ملتان سے ایک فوجی دستہ بھیجا گیا۔ مولانا پیر بخش صاحب قریشی اپنے گھر میں تشریف فرما تھے۔ برطانوی فوج نے گولیوں کی باڑھ سے آپکو شہید کر دیا۔

جناب امانت علی خاں چشتی نظامی پاکپتن شریف

جناب امانت علی خاں چشتی شہید علیہ الرحمۃ جو کہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب دیپالپوری کی اولاد امجاد میں سے تھے اور حضرت مخدوم وارث زہد الانبیاء خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے خاندان سے بہ سلسلہ چشتیہ منسلک تھے۔ جب برطانوی راج رائج کا چرچا ہوا تو آپ نے بھی منظرِ عام پر آ کر برطانوی تسلط کے خلاف اپنی جد وجہد شروع کر دی۔

آپ بلند پائے کے عظیم ادیب تھے آپکی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ علم و ادب میں آپ کا کس قدر بلند و ارفع مقام تھا کہ جس کو سمجھنے کے لئے۔ چشم عقل خیرگی کی حالت میں ہے ذہن عاجز ہے کہ ایسی بلند ہستیوں کا خدا جانے کیا مقام ہوگا۔

آپ نے برطانوی راج کے خلاف جو تحریریں قوم کے سامنے پیش کیں ان میں سے صرف چند سطور حسب ذیل درج ہیں۔

"برادران اسلام!

کہ ملکِ ما ہند فرنگی تثلیث پرستان روز بروز حاوی می شدہ اند۔ ایں فرنگیان می خواہند کہ بر ملکِ ہندوستان مسلط شدیم و حکم تثلیث پرستی نافذ بکنیم و از قلوب مسلمانان جذبۂ

جہاد را کالعدم قرار دادیم۔ این مذموم منصوبہ است لہٰذا با ایں فرنگیانِ تثلیث پرستان جہاد کردن از حد ضروری است واز میدانِ جہاد فرار شدن وحاشیہ آرائی فرنگیان کردن ہرگز روا نیست۔

خادم درگہہ فریدؒ

فقیر امانت علی چشتی پاکپتن شریف پنجاب

یکم ماہ محرم الحرام ۱۲۷۲ھ" [۳]

جناب میاں فضل کریم صاحب بدایونی شہید

آپ حضرت مولانا فیض احمد صاحب عثمانی بدایونی علیہ الرحمۃ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ آپ حسب الامر حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ برطانوی سامراج کے خلاف میدان علم وعمل میں نبرد آزما ہوئے۔ آپ جید عالم دین ہونے کے علاوہ ایک زبردست ادیب شہیر تھے۔ صاحب رسالہ ذوالقرنین بدایوں نے اس طرح لکھا ہے۔

"حضرت مولانا میاں فضل کریم صاحب بدایونی شہید علیہ الرحمۃ نے ادبی رنگ میں جس طرح برطانوی ادیبوں کا مقابلہ کیا ہے اسکی سرزمین بدایوں میں نظیر نہیں ملتی۔ آپ زبردست ادیب شہیر تھے۔ آپ نے قلم کے ذریعہ سے برطانوی سامراج کا مقابلہ کیا ہے" [۱۴]

آخری عمر میں جب بدایوں پر انگریزوں نے حملہ کیا تو اسوقت آپ شمشیر بکف ہوکر میدانِ رزم گاہ میں صف آرا ہوئے اور اسی میدان میں جام شہادت نوش فرماگئے۔ یہ واقعہ ۷ ار رمضان المبارک کو پیش آیا۔

حضرت مولانا امام بخش صاحب بہاولپوری شہید

آپ مولانا محمد حسین جنجر کے ماموں زاد اور مولانا غلام رسول جنجر بہاولپوری کے عم زاد تھے جب فرمانروایانِ بہاولپور نے انگریزوں کی خوشہ چینی کی اور مجاہدین آزادی کو صفحۂ ہستی سے ختم کرنا چاہا تو آپ تن تنہا ان نوابوں کے خلاف ڈٹ گئے آپ نے چند ایک خطوط لکھے جس میں نوابانِ بہاولپور کی برطانوی حاشیہ آرائی پر اظہار افسوس کیا اور برطانوی سامراج کے خلاف اقدام اٹھانے کو عین اسلام قرار دیا تو بہاولپور کے حکمرانوں نے آپکی عزت کو پسند نہ کیا بلکہ کسی سپاہی کو بھیج کر آپ کو شہید کرادیا [۵]

آپ کی شہادت ۷ ارماہ محرم الحرام ۱۲۶۷ھ کو ہوئی۔
آپ کا مزار شریف حضرت مولانا غلام رسول صاحب جسرؒ کے مزار کے عقب میں بستی ملوک شاہ کے گورستان میں واقع ہے۔

جناب فضل محمود صاحب انصاری شہید ملتان

جناب فضل محمود صاحب انصاری حضرت حافظ محمد جمال اللہ والدین چشتی نظامی ملتانی قدس سرہ العزیز کے مرید و خلیفہ تھے۔

" آپ کو علم وادب سے بے حد شغف تھا آپ کے چند ایک انگریزوں کے خلاف باغیانہ خطوط ہماری نظر سے گزرے ہیں جو فارسی زبان میں ہیں " ؎۱

جب ملتان پر انگریزوں نے حملہ کیا تو آپ حضرت منشی غلام شہید ملتانی کے ہمراہ تھے۔ ملتان کے قلعہ پر جناب فضل محمود صاحب انصاری انگریزوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرما گئے آپ کا مزار شریف موضع ڈومرہ پیران غائب ملتان کے قریب گورستان میں موجود ہے۔ ۷ ارماہ ذوالحجہ ۱۲۶۷ھ آپ کی تاریخ وصال ہے۔

جناب مولانا عبدالعزیز صاحب انصاری ثانی

" آپ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب انصاری اول کے پڑپوتے تھے۔ ملتان کے باشندہ تھے۔ جب انگریزوں نے ملتان پر حملہ کیا تو آپ نے اپنے وعظ کے دوران برطانویوں کے خلاف تقریریں کیں آپ ممتاز ادیب اہل سنت تھے آپ حضرت خواجہ محمد سلیمان صاحب تونسوی علیہ الرحمۃ کے مرید و خلیفہ تھے جیسا کہ آپ کی تحریروں سے آپکی علمی ادبی فنی قابلیت واضح ہے آپ انگریزوں کے ہاتھوں ملتان کے قلعہ پر شہید ہو گئے۔
آپ کی تاریخ شہادت ۷ ارماہ ذوالحجہ ۱۲۶۷ھ ہے " ؎۲

ماخذ

۱۔ جناب مولانا عبدالہادی صاحب۔ قلمی مخطوطہ ص ۹ مملوکہ اسد نظامی۔
۲۔ جناب فضل عثمان صاحب ڈیرہ غازی خاں۔ قلمی مخطوطہ ص ۱۲۱ مملوکہ جناب قاضی فضل رسول جامپوری مرحوم۔

باقی ص ۱۹۱ پر

حکیم سعید اللہ قادری

رحمۃ اللہ علیہ

(محمد صادق قصوری)

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں علماء و مشائخ نے جو کردار ادا کیا وہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے مخفی نہیں ہے۔ مجاہد کبیر مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا کفایت علی کافی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا احمد اللہ وغیرہم کے کارناموں سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے فرنگی راج کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ مگر غداران ملت نے آزادی کے سورج کو طلوع نہ ہونے دیا۔ حکیم سعید اللہ بھی اسی قدسی گروہ کے ممتاز فرد تھے جس نے کمپنی کے تسلط سے وطن عزیز کو آزاد کرنے کی بھرپور جد وجہد کی۔

حکیم سعید اللہ بن مولوی حافظ حکیم عظیم اللہ بن حکیم حبیب اللہ بن حکیم احمد اللہ بن حافظ احسن اللہ، قصبہ آنولہ ضلع بریلی میں ۱۸۲۶ء/ ۱۲۴۲ھ میں متولد ہوئے [۱] آپ کے مورثان اعلیٰ دورِ روہیلہ میں خاص شہرت اور حیثیت کے مالک تھے۔ نواب علی محمد خاں والیٔ روہیلکھنڈ نے حضرت شاہ نور غازی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے مصارف کے واسطے جو نو سو اسی بیگہ اراضی وقف کی تھی اسکی تولیت آپ کے جد اعلیٰ حکیم حبیب اللہ کے سپرد کی جو اس کے دور کے مخصوص اطبا میں سے تھے اور جنھوں نے اس خدمت کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ ۱۷۷۴ء میں جب شجاع الدولہ نے

بعد فتح روہیلکھنڈ، پیلی بھیت، بریلی، آنولہ، منونہ اور بسولی وغیرہ کو تاراج کیا تو اسوقت حکیم صاحب کا خاندان بھی برباد ہوا۔ روہیلکھنڈ میں کمپنی کی حکومت قائم ہونے کے بعد حکیم صاحب کے والد حکیم عظیم اللہ صاحب نے آنولہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہ واقعہ ۱۸۲۸ء کا ہے [1]

طبابت کا پیشہ حکیم صاحب کے خاندان میں موروثی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کے دادا اور والد بڑے فاضل طبیب اور عدیم النظیر دیندار تھے۔ حکیم صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی اسکے بعد بریلی، مراد آباد، رامپور اور دہلی سے استفادہ کیا۔ طب میں اپنے وطن کے فاضل حکیم منا سے بھی فیض حاصل کیا۔ قرآن حکیم کے دس سپارے حفظ تھے۔ علم نجوم میں بھی دسترس بلکہ مہارت تامہ حاصل تھی۔ حکیم سعادت علی خاں رئیس اعظم آنولہ و مدار المہام ریاست رامپور آپکی بڑی عزت کرتے تھے [2]

حکیم صاحب نے حضرت شاہ آل برکات صاحب مارہروی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ قادریہ میں بیعت کی تھی۔ خانوادہ قادریہ مارہرہ سے ہمیشہ تعلقات رہے، فقراء اور درویشوں سے اکثر صحبت رکھتے تھے۔ بچپن میں اپنے وطن کے مجذوب اور صاحب باطن بزرگ اکبر علی شاہ عرف ننیا شاہ کو دیکھا تھا۔ حضرت اچھے میاں مارہروی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ شاہ میرن میاں بریلوی (المتوفی ۱۲۷۰ھ) نزیل آنولہ سے بھی گہرے مراسم تھے۔ خط نسخ میں خوب مہارت تھی۔ فقہ و تصوف وغیرہ پر کئی رسالے لکھے تھے [3]

۱۸۵۷ء میں جب جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو نواب خاں بہادر خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے روہیلکھنڈ میں علم جہاد بلند کیا تو مسلمانانِ آنولہ نے ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جنگ آزادی میں پورا پورا حصہ لیا۔ نواب خاں بہادر خاں بہت مدبر اور جہاں دیدہ شخص تھے۔ انکی کمان میں مجاہدین نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ نواب صاحب نے نواب کلن خاں نبیرہ بخشی سردار خاں کو آنولہ کا حاکم مقرر کیا۔ حکیم سعادت علی خاں ولد حکیم مردان علی خاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ولد حافظ اعظم علی خاں، نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کے مدار المہام، انگریزوں کے دوست، مددگار اور معاون تھے۔ اور آنولہ کے رئیس اعظم تھے۔ انھوں نے ہر چند مجاہدین کو جنگ آزادی میں حصہ لینے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ نواب کلن خاں کے تقرر کے بعد حکیم سعید اللہ نے نامہ و پیام کے فرائض بھی انجام دیئے اور میدان رزم میں بھی داد شجاعت دی۔ ایک جمعیت

کے ساتھ مکر الہ ضلع بدایوں شہزادہ فیروز شاہ کی ہمراہی میں بڑھے اس کے بعد کمپلہ ضلع فرخ آباد پہنچے۔ آخر میں بریلی کے آخری معرکہ میں بھی شریک رہے ۵ه

فتویٰ جہاد کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں مولانا کفایت علی کافی جب مراد آباد سے آنولہ پہنچے تو حکیم سعید اللہ کے ہاں ہی قیام فرمایا۔ کیونکہ دونوں ہم درس رہ چکے تھے اور آپس میں خاص تعلقات بھی تھے۔ حکیم سعید اللہ دوران انقلاب دہلی بھی گئے تھے۔ اور خیال ہے کہ حکیم صاحب کے دستخط اس فتویٰ پر بھی تھے جو مجاہد کبیر مولانا فضل حق خیرآبادی نے جنرل بخت خاں کے ایماء و مشورہ سے مرتب کیا تھا ۶ه

آنولہ میں چند مہینے نواب خان بہادر خاں کی حکومت قائم رہی۔ پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں "یہ نہایت امن و امان کا دور رہا۔ اس زمانے میں اندرون شہر کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ البتہ جب دیہات کے مفسدین نے آنولہ کا رخ کیا تو بڑے سخت معرکے ہوئے۔ بلوائیوں نے شکست کھائی اور بھاگ گئے۔ پہلا معرکہ موضع ارلا ور سولا کے ٹھاکروں سے ہوا۔

حکیم سعادت علی خاں نے بڑی کوشش کی کہ مسلمانان آنولہ۔ نواب خان بہادر خاں کے مقرر کردہ حاکم نواب کلن خاں کا ساتھ چھوڑ دیں مگر اس میں ان کو کامیابی نہ ہوئی لہٰذا وہ خاموش ہو گئے مگر اپنی کوشش برابر جاری رکھی۔ ادھر مجاہدین کا سخت زور تھا، لیکن مجاہدین نے حکیم سعادت علی خاں کے خاندان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ہر جمعہ کو مساجد آنولہ میں جہاد کا وعظ ہوتا تھا۔ فتویٰ جہاد کی نقول جس کو جنرل بخت خاں نے دہلی میں علماء سے تیار کرایا تھا۔ مولانا کفایت علی کافی کے ذریعے آنولہ پہنچیں۔ مولانا کفایت علی کافی حکیم سعید اللہ کے یہاں ایک ہفتہ تک مقیم رہے۔ اس دوران ان کے جہاد پر وعظ بھی ہوئے اور نواب مجو خاں حاکم مراد آباد کا پیغام بھی نواب کلن خاں کو پہنچایا۔ اس کے بعد مولانا کافی نواب خان بہادر خاں کے پاس بریلی تشریف لے گئے۔

نواب کلن خاں نے اتر چھنیڈی اور اس کے نواح میں مسٹر پیتم سنگھ کو اور منونہ اور اس کے نواح میں مصدق علی کو مالیانہ کا ٹھیکہ دیا۔ جب آنولہ میں مجاہدین کا زور ہوا، تو حکیم سعادت علی خاں کو بہت فکر ہوئی۔ اس سے قبل وہ نواب یوسف علی خاں اور انگریز حکام کو یہی اطلاع دیتے تھے کہ آنولہ میں بالکل امن و امان ہے۔

آخر جولائی میں حکیم سعادت علی خاں ریاست رام پور کی فوج کے ساتھ آنولہ آئے فوج

باہر پڑی رہی۔ حکیم صاحب واپس چلے گئے۔ مجاہدین کو ہر وقت حکیم سعادت علی خاں سے اندیشہ تھا۔ آخر جب نواب خان بہادر خاں کو شکست ہوئی۔ بریلی پر انگریزی فوج کا تسلط ہوگیا اور انگریزی حکومت قائم ہوگئی تو آنولہ کا انتظام حکیم سعادت علی خاں کے سپرد ہوا؎

حکیم سعادت علی خاں نے آنولہ کا حاکم مقرر ہونے کے بعد نواب کلن خاں اور ان کے رفقائے کار کو طلب کیا۔ نواب حسن سے کوئی مواخذہ نہ ہوا۔ نواب جان محمد، نواب کلن خاں کو حکیم صاحب نے تین روز اپنے پاس رکھا۔ نواب جان محمد آزاد کر دیئے گئے۔ نواب کلن خاں کو رامپور لے گئے اور چند ماہ بعد رہائی ہوگئی۔ نواب شیخ خیر اللہ کی جائداد ضبط ہوئی اور بیدوں کی سزا پائی۔ حکیم سعید اللہ اور مولوی اسماعیل فرار ہوگئے۔ دونوں نے ککرالہ ضلع بدایوں پر انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ پھر کنپلہ ضلع فرخ آباد میں بھی نواب عبد القدیر خاں کے ہمراہ لڑے۔ جب فرخ آباد، بدایوں، شاہجہاں پور، مراد آباد، بریلی۔ سب جگہوں پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو یہ دونوں ساتھی جنگلوں میں چھپے رہے۔ عام معافی پر حکیم صاحب ظاہر ہوئے کچھ عرصہ سرولی میں سکونت اختیار کی اور پھر آنولہ آگئے۔

اسّی سال کی عمر میں درد مثانہ اور حبس البول کی شکایت ہوگئی اور یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا ۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ میں عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ اور اپنے والد حکیم عظیم اللہ کے ہم پہلو عبد اللہ شاہ کے تکیہ واقع محلہ گھیر الو خاں میں دفن ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون؎

حکیم صاحب بہت بلند اخلاق، پابند شرع اور خدا رسیدہ بزرگ تھے صلہ رحمی کے لئے بہت مشہور تھے۔ طلبا کی بہت مدد فرماتے تھے۔ حکیم صاحب کی بہن "بیگم بوا" عرف "لگا بوا" تھیں۔ مرحومہ کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا ہے۔ وہ بیان کرتی تھیں کہ ہمارے بھائی حکیم سعید اللہ کو موذی فرنگی سے سخت نفرت تھی اور وہ حکیم صاحب کی روپوشی کے واقعات بہت تفصیل سے سنایا کرتی تھیں ۹

حکیم صاحب نے صرف ایک فرزند مولوی میاں رحیم بخش یادگار چھوڑے جو مئی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور فروری ۱۹۲۰ء میں انتقال فرمایا۔ وہ بہت زیرک اور عقلمند تھے۔ میاں رحیم بخش کے ایک صاحب زادے مولوی میاں مشیت اللہ قادری تھے جو ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے اور اکتوبر ۱۹۵۹ء میں دادو (سندھ) پاکستان میں وفات پائی۔ ان کو فارسی ادب پر ید طولیٰ حاصل تھا۔ تاریخ و انساب پر گہری نظر تھی۔ تمام عمر سیاحت و تجارت میں گزار دی اور حالات رجال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ میاں مشیت اللہ قادری

کے چار لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں بڑے صاحبزادے منشی عبدالقیوم بدایوں میں ۱۹۴۳ء میں انتقال کر گئے تھے۔ تین صاحبزادے اور چار لڑکیاں موجود ہیں۔

۱:- پروفیسر محمد ایوب قادری - پروفیسر صاحب آجکل اردو کالج کراچی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ اور ملک کے ممتاز مورخوں میں سے ایک ہیں۔ تاریخ ان کا دلپسند موضوع ہے۔ سینکڑوں کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ ۲:- عنایت اللہ قادری - ۳:- محمد نبعت اللہ قادری - یہ صاحبزادے کتب فروشی کا کاروبار کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱؎ ۱۸۵۷ء کے مجاہد - از غلام رسول مہر مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء ص ۳۱۲ مشاہیر جنگ آزادی از مفتی انتظام اللہ شہابی مطبوعہ کراچی ۱۹۵۷ء ص ۲۸ - جنگ آزادی ۱۸۵۷ء واقعات و شخصیت از پروفیسر محمد ایوب قادری زیر طبع۔

۲؎ ماہنامہ الشجاع کراچی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء نمبر ص ۴۷

۳؎ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از پروفیسر ایوب قادری زیر طبع۔

۴؎ ماہنامہ الشجاع کراچی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء نمبر ص ۴۷

۵؎ ۶؎ ماہنامہ الشجاع کراچی - جنگ آزادی نمبر ص ۴۷ - ۴۸ مولانا محمد احسن نانوتوی از پروفیسر محمد ایوب قادری مطبوعہ کراچی ۱۹۶۰ء ص ۱۲۱

۷؎ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از پروفیسر محمد ایوب قادری (زیر طبع)

۸؎ مولانا محمد احسن نانوتوی - از پروفیسر محمد ایوب قادری مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء ص ۱۲۱ - مشاہیر جنگ آزادی ص ۲۹ - ۱۸۵۷ کے مجاہد مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء ص ۲۱۲

۹؎ ماہنامہ الشجاع کراچی جنگ آزادی نمبر ص ۴۸ -

مولانا رحمت اللہ کیرانوی

جنہوں نے

ہند سے عرب تک

انگریزوں کو

ناکوں چنے چبوا دیئے

(از:- محترمہ پاشا بیگم پیرزادی)

مولانا رحمت اللہ کیرانوی حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیا پانی پتی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت کبیر الاولیا کی اولاد میں چند حضرات ایسے گذرے ہیں جو آپ کی کرامت کا زندہ نمونہ تھے۔ چنانچہ ان ہی میں سراج الفقراء، افضل العلماء، افتخار الفضلا مولوی رحمت اللہ کیرانوی شہرہ آفاق ہوئے ہیں۔

مولانا رحمت اللہ نے مولوی محمد حیات پنجابی، مفتی محمد سعد اللہ مرادآبادی اور مولانا امام بخش صہبائی سے اکتساب علم کیا۔

مولانا کیرانوی نے ان اساتذہ کے علاوہ جن صاحب طریقت علماء اور مشائخ سے استفادہ کیا ان میں حضرت شاہ ابوسعید مجددی، شاہ احمد سعید مجددی، شاہ عبدالرشید مجددی، مولانا رحمت علی، مولانا مخصوص اللہ دہلوی، مولانا شاہ قطب الدین خان، مولانا ناصر الدین محمد، مولانا محمد قاسم داناپوری، مولانا غلام امام شہید امیٹھوی، مولوی کریم اللہ، غلام نصیر الدین فخر جہانی خواجہ محمد نصیر دہلوی، شاہ محمد نصیر دہلوی، مولوی محمد موسیٰ دہلوی اور اسی مکتب فکر کے مشائخ کرام حضرات کی خدمت سے فیض حاصل کیا۔ کیونکہ مولانا کیرانوی خود بھی ایک صاحب طریقت خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے مذہب اور طریقت سے محبت و عقیدت کا جذبہ انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا

کہ دہلی میں برطانوی استعمار بند کمپنی بہادر ملک پر چھا جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ انگریز پادری کھلے عام عیسائیت کی تبلیغ کرتے تھے، غریب ہندوستانی پست اقوام کے افراد جو علم دین و دنیا سے بے بہرہ اور بے خبر تھے عیسائیت قبول کرتے جا رہے تھے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا ناصر الدین محمد اور مولانا محمد قاسم دانا پوری کی مذہبی حمیت نے اس بے دینی کو برداشت نہ کیا اور اسلام کی مدافعت کے لئے میدان عمل میں نکل آئے لیکن اب شہیدی مکتب فکر کا اصرار ہے کہ جہاد حریت اور اسلام کی مدافعت کے سلسلہ میں خدمات انجام دینے والا طبقہ تھانہ بھون، نانوتہ، گنگوہ اور ڈابھیل سے نکلا اور صوفیائے کرام نے مجالس میلاد، فاتحہ خوانی اور عرس منعقد کرنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ صوفیائے کرام کا یہی طبقہ تھا جس نے نہ صرف دین کی حمایت کے لئے مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں، ہندوؤں اور عیسائیوں سے علمی اور عملی جہاد کیا، اور انہوں نے زبان قلم، علم اور عمل سے اسلام کے دشمنوں کو ہر محاذ پر شکست دی اور یہ ان ہی کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج اسلام باقی ہے اور مسلمانوں کے دل اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار ہیں۔ شہیدی مکتب فکر کا کہنا ہے کہ جہاد حریت کے لئے شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب سرگرم عمل تھے حالانکہ یہ دونوں ۱۲۵۸ھ میں ترک وطن کر کے حجاز جا چکے تھے، وہ کہتے ہیں انہوں نے مولوی محمد قاسم نانوتوی اور مولوی رشید احمد گنگوہی کو "سپہ سالار" اور قاضی القضاۃ مقرر کیا تھا اس سلسلے میں مولوی گنگوہی کے سوانح نگار عاشق الٰہی میرٹھی تذکرۃ الرشید جلد اول کے صفحہ ۷۲ میں لکھتے ہیں کہ

> "جب بغاوت" و فساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ نے دوبارہ غلبہ پاکر "باغیوں" کی سرکوبی کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی تہمتوں اور مخبری کے پیشے سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا اور مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں اصل اصول یہی لوگ تھے اور شاملی کی تحصیل اور بستی کی دکانوں پر حملہ کر کے تحصیل کو آگ لگا دی اور سرکار برطانیہ کا خزانہ لوٹ لیا حالانکہ یہ کمبل پوش فاقہ کش نفس کش حضرات اس فساد سے کوسوں دور تھے۔" ۱۲

عاشق الٰہی کے متعلق "شاندار ماضی" جلد چہارم کے صفحہ ۲۷۸ پر مرقوم ہے کہ

> انہوں نے جنگ آزادی کا مشاہدہ کرنے والوں کو بہت
> قریب سے دیکھا تھا اور ان لوگوں سے خود ان ہی کی زبانی حالات
> بھی سنے تھے۔" ۱۲

اسی طرح مولانا نانوتوی کے متعلق ان کے شاگرد رشید مولوی حسین احمد مدنی نقش حیات جلد دوم کے صفحہ ۵۸ پر لکھتے ہیں کہ

> "مولانا نانوتوی تین دن تک ایک جگہ چھپے رہے اور چوتھے دن
> گوشہ تنہائی سے باہر نکل آئے اور جب اصرار کیا گیا تو فرمایا
> آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) غار ثور میں تین دن ہی مخفی رہے
> تھے۔ سنت سے اتنی ہی مدت ثابت ہے۔ یہ مدت ختم
> لہٰذا روپوشی بھی ختم۔ مماثلت کی کیا گستاخانہ جرأت ہے (راقم)
> ایک روز آپ مسجد میں تشریف فرما تھے پولیس پہونچ گئی۔
> آپ اطمینان سے اٹھے جوتیاں سنبھالیں اور باہر نکلنے لگے۔
> کپتان پولیس نے آپ سے پوچھا مولوی کہاں ہے؟ آپ ایک قدم
> آگے بڑھے اور پیچھے مڑکر فرمایا ابھی یہاں تھا۔ کپتان مسجد
> کے اندر چلا گیا اور مولانا چلے آئے۔ ۱۲

"علمائے ہند کا شاندار ماضی" جلد چہارم ص۳۲۳ میں اس روایت کے ابتدائی حصہ کی یوں تشریح کی گئی ہے کہ

> "یہ مولانا کی حاضر جوابی اور ذکاوت تھی کہ فرمایا کہ ابھی یہاں
> تھے اور خود آگے چل دیئے۔ پولیس نئی تھی اس نے مولانا کا نام
> سنا ہوگا اور تصور یہی ہوگا کہ اتنے بڑے مولانا جن کی اتنی شہرت
> ہے بڑے "جبڑے کلّے" کے آدمی ہوں گے وضع قطع بھی ایسی
> ہی شاندار ہوگی یہاں مولانا کی سادگی کا یہ عالم کہ بڑے
> مولانا تو درکنار آپ کی شکل وشباہت اور وضع قطع سے آپ
> کو معمولی ذی علم سمجھنا بھی دشوار تھا۔ سنا گیا ہے سیاہی مائل
> گندمی رنگ چہرہ پر چیچک کے نشان تھے۔ تفصیل سوانح قاسمی
> میں ملاحظہ ہو محمد میاں) بزرگوں سے ایک لطیفہ سنا ہے آپ

کسی مسجد میں تشریف لے گئے۔ آپ کو معلوم ہوا کہ امام صاحب
قرآن شریف صحیح طرح نہیں پڑھتے نماز کا وقت آیا تو آپ نے
فرمایا میں نماز پڑھا دوں؟ نمازیوں نے آپ پر نظر ڈالی اور
کہنے لگے تجھ سے تو ہمارا امام اچھا ہے ہم تیرے پیچھے نماز
کیوں پڑھیں۔ ۱۲

اسی طرح یہ مستند روایت مشہور ہے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی سے پولیس نے سوال کیا تمہاری بندوق کہاں ہے؟ سادہ لوح اور مسکین مولوی نے اپنی جیب سے تسبیح نکال کر پیش کر دی اور کہا۔
"میرے پاس تو یہ ہتھیار ہے۔"

اس صورت میں خدارا کوئی انصاف کرے کہ ان قلم چلانے اور تسبیح پھیرنے والوں کو تلوار تیغ و تفنگ سے وابستہ کر دینا قرین قیاس ہو سکتا ہے؟ جبکہ مجاہدین آزادی کو یہ لوگ باغی اور انگریزوں کو رحمدل اور انصاف پسند کہتے اور سمجھتے رہے۔ بھلا یہ لوگ خود بغاوت اور بے رحمی میں کیوں کر ملوث ہو سکتے تھے یہ سب بعد کے حضرات کی اختراع اور زیادتی ہے جن کے حلیے دیکھ کر لوگ ان کی امامت قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہوں وہ مجاہدین کے گروہ کی قیادت کرنے کے اہل ہو سکتے تھے، یہ ان حضرات کے سوچنے کی بات ہے جو ہرا نگلی کٹے کو شہادت کا درجہ دینے پر تلے ہوتے ہیں اور شہیدی تحریک سے تعلق جوڑنے کی دھن میں ادھر ادھر سے کڑیاں ملاتے رہنا ایک فرض سمجھتے ہیں وہ مولوی جن کے حلیے جن کی بہادری یہ خود بیان کرتے ہیں کیا مردان کار مجاہدین کی صف میں شمار کئے جا سکتے ہیں؟ افسوس یہ ہے کہ یہ اس گروہ کے افراد ہیں جو بہانے کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و محبت اور احترام کو معاذ اللہ بدعت پرستی سمجھتے ہیں حد یہ کہ خدا پرستی تک پہ ان کا اجارہ قائم ہے مگر خود گنگوہی پرستی میں حد سے زیادہ غلو رکھتے ہیں امیر اللہ تسلیم نے ان ہی لوگوں کے لئے کہا تھا۔

برسوں لبیک خواں رہا تسلیم — حج کعبہ کبھی قضا نہ ہوا
پر خدا جانے کربت پرستی میں — کیا مزا تھا کہ پارسا نہ ہوا

اس تمہید سے میرا مقصد یہ ہے کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان مولویوں کے تعلق کی وضاحت ہو جائے کہ مولانا کیرانوی اور ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق تھا۔ مولانا کیرانوی خاندانی عالم اور فاضل تھے اور یہ خود رو ملا تھے جن کے گھر علم چور دروازے سے داخل ہوا اور جن کے گھرانے میں ان کے سوا کوئی عالم نہیں گذرا۔

مولانا کیرانوی کے اساتذہ میں سب ہی نامی گرامی تھے۔ مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی جو شیخ

نظام الدین کے فرزند تھے اور جنہوں نے بڑی تکالیف برداشت کر کے علم حاصل کیا جن کے اساتذہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اخوند شیر محمد علوی مولانا صدرالدین خان آزردہ مولوی حیات محمد پنجابی۔ مولوی محمد نور خان نجیب آبادی، مولوی عبدالرحمن قہستانی، مولانا ظہور اللہ لکھنوی جیسے حضرات شامل تھے ورلکھنو وغیرہ میں مناظروں کے سلسلہ میں شہرت رکھتے تھے۔ مولانا کیرانوی کے دہلوی استاد مولانا امام بخش صہبائی تھے جو تھانیسر کے رہنے والے تھے مولانا عبدالحق نے "مرحوم دہلی کالج" میں فارسی کے تین منتخب اساتذہ میں ان کو شمار کیا ہے۔ یعنی غالب، صہبائی، مومن۔ سرسید نے ان کی علمی فضیلت کا تذکرہ بڑے احترام و عقیدت سے آثارالصنادید میں کیا ہے۔ ابوالکلام آزاد نے ان کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

"والد مرحوم دہلی کے دیوانخانوں کی محفلوں کے جو افسانے سنایا کرتے تھے وہ بجھنے والے چراغ کا آخری اجالا تھے۔ یہ مرحوم دہلی کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی آخری بزم تھی۔ یعنی صدرالدین خان آزردہ کا دیوان خانہ دہلی کے منتخب امراء کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑہ، گرمی، برسات، کوئی موسم ہو لیکن شب کی محفل کی شرکت سے کوئی ناغہ نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے کاملین وقت کا وہاں اجتماع ہوتا تھا اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے صاحب فضل و کمال کو بیک وقت دیکھ لے وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا ان محفلوں کے ایک رکن حضرت امام بخش صہبائی تھے وہ کالج سے گھر آتے اور شام کے وقت مولانا فضل حق خیر آبادی کے یہاں جاتے وہاں سہ پہری فواکہات کھاتے اور شب کے وقت نماز عشاء کے بعد دونوں کا مفتی صاحب کے یہاں جانا معمول تھا یہاں کی محفل برخواست ہوتی تب گھر جا کر سوتے دوسرے دن پھر ان ہی صحبتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔"

مولانا کیرانوی دہلی کے قیام میں ان محفلوں میں شامل ہوتے امام الہند مجاہد اکبر مولانا فضل حق کی صحبت سے استفادہ کرتے۔ مردان کار مجاہد علماء کی صحبتوں میں مولانا کیرانوی کے دل میں بھی وہی

لگن وجذبہ پیدا ہوا۔ مولانا کیرانوی کو ایک ساتھی ڈاکٹر وزیر خان میسر آگیا۔ بہار کے ایک زمیندار افغان محمد نذیر خاں کے فرزند تھے انہوں نے مرشد آباد میں عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر مکمل عبور حاصل کیا۔ ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو وہاں ڈاکٹری کی سند کے علاوہ عبرانی اور لاطینی زبانیں حاصل کیں۔ ہندوستان میں وہ دیکھ چکے تھے کہ کس طرح ہندوستانی اقوام کو عیسائی مذہب کی طرف راغب کیا جارہا ہے اور اس سے جاہل تو جاہل پڑھے لکھے مسلمان بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ وزیر خان مذہبی جذبہ اور سینے میں درد مند دل رکھتے تھے انہوں نے انگلستان کے قیام سے یہ فائدہ اٹھایا کہ توریت اور انجیل کے مختلف نسخے کافی تعداد میں اپنے ساتھ لیتے آتے تاکہ عیسائیوں کی مذہبی کتابوں سے ان کے اختلافات اور تضاد کو پیش کرکے عوام الناس کو عیسائیوں کی آسمانی کتابوں کی تحریف و تنسیخ سے آگاہ کریں یہاں آکر وہ اکبر آباد (آگرہ) میں اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوتے۔ اسی زمانہ میں رئیس المجاہدین حضرت احمد اللہ شاہ مدراسی المعروف ڈنکا شاہ بھی اکبر آباد تشریف لائے اس وقت یہاں وزیر الدین ولد شرف الدین جو حضرت صہبائی کے داماد اور بھانجے تھے کے توسط سے مولانا کیرانوی کی اور ڈاکٹر وزیر خان کی ملاقات کی تجدید ہوئی۔ نواب مرتضٰے شیفتہ، مولانا فیض احمد بدایونی، مولوی سراج الحق بدایونی، مولانا محمد قاسم دانا پوری عاشق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مولانا غلام امام شہید، مولانا فضل حق خیر آبادی سے صحبتیں ہوئیں طے یہ پایا کہ مولانا کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان ردعیسائیت کا محاذ سنبھالیں۔ کیونکہ یہ دونوں اس کے اہل ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک پادری فنڈر نامی جو ۱۸۵۳ء میں ہندوستان آیا تھا اور ایک انگریز افسر کے یہاں مقیم تھا۔ دہلی کی جامعہ مسجد کی سیڑھیوں پہ بیٹھ کر اسلام کے خلاف زہر افشانی کیا کرتا تھا۔ جامع مسجد کی حالت اس وقت سرسید کے "اسباب بغاوت ہند" کے مطابق مولوی اسماعیل اور سید احمد بریلوی کے طفیل میں یہ ہو چکی تھی کہ

"ایک گروہ اس مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ سمجھتا تھا کیونکہ
اس میں تبرکات رکھے ہوئے تھے"۔

ظاہر ہے اس اختلاف سے عیسائیوں کو یہ موقع ملا کہ وہ مسلمانوں کی عبادت گاہ کی حدود میں داخل ہو کر اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی جرأت کر سکیں۔ فنڈر بے حد شاطر اور چالاک شخص تھا۔ یہ عربی اور فارسی کا بھی ماہر تھا اور اردو بھی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ عیسائیوں کی طرف سے کمپنی بہادر کے سب ہی بڑے بڑے عہدہ داروں نے اس کی سرپرستی کی۔ چنانچہ یہ دیکھ کر حضرت مولانا احمد سعید مجددی، مولوی کریم اللہ، خواجہ محمد ناصر، مولانا صہبائی، مولانا فضل حق خیر آبادی

مولانا محمد قاسم داناپوری جیسے مخلص علماء و مشائخ کے مشورے و ہدایت پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان نے اعلان کر دیا کہ وہ فنڈر سے مناظرہ کریں گے۔ کیونکہ اس وقت غیر معروف خاندانوں کے تین شخص جو کسی مسجد کی ملاگیری کرتے کرتے انگریزوں کی نظر میں آ گئے تھے اور جنہوں نے دنیاوی لالچ کے لئے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ فنڈر کے حامی و مددگار تھے جن کے نام پادری عماد الدین، پادری رجب علی اور پادری عبد اللہ تھے۔ یہ تینوں بدبخت بڑی عجیب و غریب تاویلوں کے ساتھ اپنی بے دینی کو بطور سند مثال میں پیش کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں مصروف تھے۔ مولانا کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان نے شہزادہ مرزا فخر الدین بہادر فتح الملک ولیعہد سے ملاقات کی شہزادہ نے دونوں کو اعانت و تعاون کا یقین دلایا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ شہزادہ کا تعاون حاصل کرنے کے بعد رجب / مارچ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء میں ہندوستان کا مشہور مناظرہ ہونا طے پایا۔ ڈاکٹر وزیر خان اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا فیض احمد بدایونی مناظرے کے رکن رکین تھے۔ مولانا کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان کے مدلل اور ٹھوس دلائل کے سامنے فنڈر کی ایک نہ چلی اور تحریف اناجیل کے سلسلے میں اپنی شکست تسلیم کر کے ہندوستان سے بھاگ گیا۔ بعض روایتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مناظرہ ۱۲۷۲ھ میں ہوا تھا مگر قیاس کہتا ہے پہلی تاریخ درست ہے۔ کیونکہ شہزادہ فتح الملک ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء میں اچانک انتقال کر چکے تھے جنہوں نے مناظرہ اکبر آباد کی مکمل روداد فارسی میں اور فنڈر اور ڈاکٹر وزیر خان کا تقریری مناظرہ اردو میں ۱۲۷۰ھ فخر المطابع سے چھپوایا جس کا نام البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف تھا ولی عہد مذکور نے اس کا کل صرفہ خود ادا کیا اور مفت تقسیم کیا گیا اسی کا عربی ترجمہ مولانا کیرانوی کی "اظہار الحق" کے حاشیہ پر ہے جو مطبع محمودیہ قاہرہ (مصر) سے ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء میں شائع کی گئی تھی۔

فنڈر پادری کی شکست سے عیسائی حکام ڈاکٹر وزیر خان اور مولانا کیرانوی کی دشمنی پر آمادہ ہو گئے تھے مولانا تو مکہ معظمہ حج بیت اللہ کے لئے چلے گئے مگر وزیر خان مقابلہ کرتے رہے۔ مولانا جب حج سے واپس آئے تو یہاں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کا آغاز ہو چکا تھا۔ انہوں نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ اندازہ لگایا کہ لوگوں میں جوش و جذبہ حمیت ایمانی تو موجود ہے لیکن معقول قیادت نہ ہونے کے باعث نظم و نسق قائم نہیں۔ انہوں نے عوام کی تنظیم کے لئے یہ سبیل نکالی کہ بادشاہ کی توجہ اس بد انتظامی کی طرف مبذول کرائی جائے۔ اس کام کے لئے وہ حضرت شاہ احمد سعید مجددی کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے اپنے معتمد اور مرید نواب

شبیر علی خان تہا مراد آبادی کا نام تجویز کیا۔ مولانا کیرانوی نے شبیر علی خان کو بادشاہ کے حضور میں بھیجا۔ وہ جواب لائے کہ بادشاہ سلامت صورتِ حال سے پوری طرح باخبر ہیں مگر اپنے دوست نما دشمنوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے ایسے مجبور اور بے بس ہیں کہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ادھر ناگفتہ حالات سے مجبور ہو کر حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلی سے روانگی پر تیار ہو گئے چنانچہ مولانا ۱۲۷۰ھ میں جے پور جودھ پور کے خطرناک اور مہیب ریگستان کو پیدل طے کرتے ہوتے سورت پہونچے۔ اور وہاں سے بادبانی کشتی کے ذریعہ جدہ کے لئے روانہ ہو گئے جدہ پہونچ کر دنیاوی تعلقات و علائق دنیا کو ترک کر کے مکہ معظمہ کی سکونت اختیار کر لی۔ مکہ معظمہ کے محلہ خندریسہ میں بنگال کی ایک مخیر خاتون صولت النساء بیگم کی امداد و اعانت سے مدرسہ صولتیہ تعمیر کرایا۔ علماء اور قراء کی جماعت کے ساتھ خود بھی علوم دین کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ یہاں سے ترکی گئے۔ کیونکہ فنڈر ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۴ء میں قسطنطنیہ جا پہونچا اور وہاں زہر اگلنے لگا اس وقت سلطان روم عبدالعزیز شہید حکمران تھے۔ انہوں نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو استنبول طلب فرمایا۔ وزیر خان بھی ہمراہ تھے۔ فنڈر کو یہاں پھر ناکامی اور شکست نصیب ہوئی اور بھاگنا پڑا۔ مولانا نے ازالۃ الاوہام فارسی میں لکھی جس کا عربی میں اظہار الحق کے نام سے ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب عربی زبان میں مصر اور ترکی زبان میں استنبول ترکی سے کئی مرتبہ چھپی۔ مولانا آخر عمر میں بیحد کمزور اور نحیف ہو گئے تھے۔ انہوں نے کیرانہ سے اپنے بھتیجے محمد سعید کو اپنے پاس بلا لیا تھا آخر ۸۰ سال کی عمر میں یہ مجاہد ۲۲ر رمضان ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۱ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ مکہ معظمہ کی مقدس ارض پاک میں آسودہ خواب ہوئے۔ محمد سعید صاحب کے فرزند مولانا محمد سلیم اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد شمیم آج کل مدرسہ کے منتظم ہیں۔ مگر اب یہ مدرسہ کم اور رباط زیادہ معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی دونوں کا دم غنیمت ہے

غمزہ بیگم

تحریر:۔ خواجہ حسن نظامی
تلخیص:۔ پرویز رشید

گیارہ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کا ذکر ہے شہزادہ مرزا ابو بکر کی لاڈلی بیوی غمزہ بیگم چمن کے چبوترے پر مسہری کے اندر بے خبر پڑی سو رہی تھیں اور روشنی نام کا ایک کالا لڑکا جو پندرہ سولہ برس کی عمر میں ہاتھ میں اکتارہ لیے ہوئے سروں میں بھیرویں گا رہا تھا اور مرزا غالب کا یہ مشہور شعر بار بار دہرا رہا تھا ؎

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی،

گرمی کا موسم صبح کا سہانا وقت، چمن کے درختوں پر چڑیوں کا شور و غل، ہلکی ہلکی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، روشنی کی سریلی اور مستانہ آواز، غمزہ بیگم کی صورت اور ہیئت کو دیکھنا مل جل کر ایک عجیب نظارہ پیدا کر رہا تھا۔ غمزہ بیگم ڈھاکہ کی ململ کا دوپٹہ جو کافوری رنگا ہوا تھا اوڑھے ہوئے تھیں تکیہ کے دونوں طرف چنگیروں میں موتیا، چنبیلی اور گلاب کے پھول بھرے ہوئے تھے۔ غمزہ بیگم کی سانولی سانولی رنگت لمبے لمبے بال، ریشمی تکیہ پر سر رکھے ہوئے اور داہنا ہاتھ چہرے کے نیچے دبا ہوا سو رہی تھیں۔ روشنی خدمت گار ان کے چہرے کی طرف سامنے لکڑی کی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا اکتارہ بجا رہا تھا مگر غمزہ بیگم کو اس گانے بجانے کی کچھ خبر نہ تھی۔ جوانی کی نیند مست ہو رہے

محل کی ایک چھوکری بھاگی ہوئی آئی اور اس نے روشنی کے کان میں کہا کہ میرٹھ میں غدر ہو گیا ہے۔
انگریزوں کی باغی فوج قلعے کے نیچے آگئی ہے اور انگریز قلعہ دار جھروکے میں کھڑا اس سے باتیں کر رہا
ہے۔ روشنی نے یہ باتیں سنیں تو وہ گھبرا گیا۔ روشن نے غمزہ بیگم کو جگانا چاہا کیونکہ غمزہ بیگم روز تیرے
وقت گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ کے اندر پھیرنے جایا کرتی تھیں۔ مگر آج خلاف معمول وہ اب تک بیدار
نہیں ہوئی تھیں ورنہ اندھیرے سے جاگتی تھیں اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے گھوڑے کی سواری سے
فارغ ہو کر محل واپس آجایا کرتی تھیں۔ اس نے روشنی نے چنگیر سے گلاب کا ایک پھول اٹھایا اور غمزہ
بیگم کے رخسار پر آہستہ سے لگایا۔ غمزہ بیگم نے ایک پھریری لی اور رخسار کو ہاتھ سے کھجلا کر پھر سو گئیں
اب کے روشنی نے پھر ناک سے لگایا۔ اس سے غمزہ بیگم کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے مسکرا کر روشنی کو
دیکھا اور شوخی سے کہا۔ کیوں بے شریر! تو بہت ستاتا ہے۔ ٹھہر جا میں اٹھ کر تیری کیسی گت بناتی ہوں۔
روشنی بچپن سے اس گھر میں پلا تھا اور شروع سے غمزہ بیگم کی صورت اور باتوں کا اس کے
دل پر ایک خاص اثر تھا اور غمزہ بیگم بھی روشنی کی آواز، نرگسی اور نشیلی آنکھوں کا اثر اپنے دل میں
پاتی تھیں جب غمزہ بیگم نے یہ بات کہی روشنی پلنگ سے پرے ہٹ گیا اور اس نے پھر غالب کا شعر
گانا شروع کر دیا تو غمزہ بیگم کھڑی ہو کر اٹھ بیٹھیں۔ مستانہ انداز سے انگڑائی لی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور
انگڑائی کی حالت میں مسکرا کر روشنی کی طرف دیکھا۔ روشنی پر اس نگاہ کا اتنا اثر ہوا کہ وہ گاتے گاتے
چپ ہو گیا۔ اکتارا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ غمزہ بیگم نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور شیریں لہجہ میں کہا
"ارے روشنی! کیا تجھے نیند آگئی"۔ روشنی نے یہ بات سنی تو چونک پڑا۔ اور اس نے چوکی کو دونوں
ہاتھوں سے پکڑ کر بے خودی کے عالم میں کہا "ہاں بی بی! میں ذرا سو گیا تھا"۔

غمزہ بیگم مجھے جگا رہا تھا اور خود سو گیا اور یہ عجب خوب ہے کہ میٹھا ہے اور گر رہا
ہے اور سوتا ہے۔ دیکھ اکتارے کو تو دیکھ، ٹوٹا تو نہیں۔ تو روز برتن بھی توڑتا
ہے اور خود بھی گرے پڑتا ہے۔ کیا تو کوئی نشہ پیتا ہے روشنی؟
نہیں بی بی! میں کسی چیز کے پاس بھی نہیں جاتا۔ اس وقت گاتے گاتے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور
مجھے غنودگی ہو گئی۔ اور ہاں بی بی! ابھی چھوکری آئی تھی اور کہتی تھی کہ انگریزوں کی فوج میرٹھ سے باغی
ہو کر آئی ہے اور قلعدار صاحب سے جھروکے کے نیچے باتیں کر رہی ہے۔ آج حضور گھوڑے پر
باہر نہ جائیں۔
غمزہ بیگم:۔ دیوانہ کہیں کا تو تو بڑا ڈرپوک ہے۔ فوج آئی ہو گی تو قلعہ کے باہر ہو گی۔ قلعہ کے اندر
کاہے کا ڈر ہے۔ میں ضرور جاؤں گی۔ جا سائیں سے کہہ دے گھوڑا تیار رکھے۔ میں نماز پڑھ لوں۔

ابھی باہر آتی ہوں۔ یہ حکم سن کر روشنی اصطبل میں گیا اور سائیں کو گھوڑا تیار کرنے کا حکم سنایا یکایک بندوقیں چلنے کی آواز آئی اور تھوڑی دیر میں سنا کہ انگریزوں کے بنگلے میں آگ لگ رہی ہے اور باغی قلعہ کے اندر بھی گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ دوڑا ہوا عزہ بیگم کے پاس گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا ۔۔۔۔۔۔۔ سرکار باہر نہ جایئے باغی قلعہ کے اندر آ رہے ہیں۔

عزہ بیگم نے یہ خبر سن تو کچھ دیر چپ کھڑی ہو کر روشنی کو اس طرح دیکھنے لگیں۔ گویا وہ کسی گہری سوچ میں ہیں اور پھر روشن سے کہا جا! جلدی جا!! اور قلعہ کے دروازے پہ جا کے اور خبر لا۔ سائیں سے کہہ دے کہ میں باہر نہیں جاؤں گی گھوڑا کھول دے اور اس کے بعد باغ میں انار کلی کی ٹہنی دبائے جا کر کھڑی ہو گئیں اور بہت دیر تک اسی خیال میں غلطاں و پیچاں رہیں۔ یکایک روشن بھاگا ہوا آیا اور اس نے کہا کہ بیبی! باغیوں نے قلعہ دار کو بھی مار ڈالا اور فریزیر صاحب کو بھی مار ڈالا اور وہ گھوڑوں پر سوار دیوان عام کے اندر آ گئے ہیں اور دہائی دہائی پکار رہے ہیں۔ بادشاہ سلامت برآمد ہوئے تھے انہوں نے پوچھا تم کیا چاہتے ہو تو انہوں نے کہا۔ آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ انگریز ہمارے دین دھرم کو بگاڑنا چاہتے ہیں اس لئے ہم ان سے لڑیں گے آپ ہمارے سر پر ہاتھ رکھئے اور ان لوگوں نے دیوان عام میں گھوڑے باندھ دیئے اور وہ سب وہیں بستر لگا کے بیٹھ گئے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں شہزادہ کا خواجہ سرا بختو بھاگا ہوا آیا اور اس نے کہا صاحب عالم (شہزادہ) نے خیریت ہنگامی بے نہ فرمایا ہے کہ آج گھوڑے کی سواری نہ کرنا باغی قلعہ کے اندر آ گئے ہیں۔ عزہ بیگم نے بختو سے کہا جا! کہہ دے میں اچھی ہوں اور آج باہر جانے کا ارادہ نہیں ہے اور یہ بھی کہیو کہ کل شام کی بات اتنی جلدی بھول گئے۔ بادشاہ حضرت (مرزا ابو بکر) نے ان کے بادشاہ حضرت کو صاف صاف کہلا بھیجا تھا کہ تمہارا لڑکا (شہزادہ) آئندہ کوئی پیغام سلام میری لڑکی (عزہ بیگم) کو نہ بھیجے ورنہ اچھا نہ ہوگا مگر تم نے پھر پیغام بھیجا۔ کیا تم بادشاہ حضرت کے غصہ کو نہیں جانتے آئندہ خیال رکھنا اور ان پیغام سلاموں کو بند کر دینا۔ میں اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتی۔

۱۲ ستمبر کی ایک رات

غدر گیارہ مئی ۱۸۵۷ء کو شروع ہوا تھا۔ مئی کا پورا مہینہ انگریزوں اور ان کی عورتوں اور بچوں کے لئے مصیبت کا مہینہ تھا جون کے مہینہ میں انگریز پنجاب کے سکھوں اور پنجابی

سرداروں کو جمع کر کے باغی فوجوں سے لڑنے آتے اور دہلی کے شمال میں پہاڑی پر انہوں نے مورچے لگائے اور باغی فوجوں سے رات دن لڑائی ہونی رہی۔ جون، جولائی، اگست اور ستمبر کا بیشتر حصہ اسی کشمکش میں گذرا۔ بارہ ستمبر کی رات کو مرزا خضر سلطان نے مرزا ابوبکر سے کہا بھئی لڑائی کا رخ خراب نظر آتا ہے جب سے بریلی کا جرنیل محمد بخت خاں باغی ہو کر آیا ہے اور بادشاہ حضرت نے اس کو لارڈ گورنر کا خطاب دیا ہے اس وقت سے آکا بھائی (مرزا مغل) کا اثر فوج میں بالکل نہیں رہا۔ سب فوجیں بخت خاں کا کلمہ پڑھتی ہیں۔ کہنے کو تو آکا بھائی کمانڈر انچیف ہیں لیکن فوجوں میں حکم بخت خاں کا چلتا ہے۔ ہم کو تم کو اور بھائی مرزا عبداللہ کو کرنیل جرنیل بنا دیا گیا ہے مگر ہم سب نام کے جرنیل کرنیل ہیں۔ فوج میں ہماری بات کون سنتا ہے۔ انہی باتوں کے سلسلہ میں مرزا خضر سلطان نے مرزا ابوبکر سے یہ بھی کہا کہ غدر سے پہلے آپ نے میرے لڑکے (شہ بالا) کی نسبت جو کچھ کہلا بھیجا تھا۔ میں نے اس کے موافق شہ بالا کو ہدایت کر دی تھی اور اس نے اس کے بعد تمہاری لڑکی غمزہ بیگم کے پاس کوئی پیغام سلام نہیں بھیجا مگر مجھے آپ سے بڑی شکایت ہے کہ آپ نے شہ بالا کی ماں کا خیال کر کے شہ بالا کو غلامی میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مرزا ابوبکر نے جواب دیا۔ ہاں بھائی سچ کہتے ہو۔ میں اپنی غلطی کو مانتا ہوں اور اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز دہلی پر ضرور قبضہ کر لیں گے۔ اور ہم سب میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے اس واسطے مصلحت یہ ہے کہ تمہارے لڑکے کا غمزہ سے نکاح کر دیا جائے۔ تاکہ ہم دونوں اگر پکڑے جائیں یا مارے جائیں تو یہ بچے تو سکھ سے رہیں۔ یہ سن کر مرزا خضر سلطان نے کہا اچھی بات ہے کہ کل صبح خاموشی کے ساتھ نکاح کر دیا جائے تو مناسب ہے۔ کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں شہ بالا اور قاضی کو لے کر آ جاؤں گا۔ آپ لڑکی کی والدہ کو اطلاع دے دیجئے کہ وہ تیاری کر لیں۔

۱۳ ستمبر کی صبح

مرزا ابوبکر کے دیوان خانہ میں سورج نکلنے سے پہلے ابوبکر اور چند قریبی قرابتدار اور قاضی صاحب بیٹھے تھے۔ اور مرزا شہ بالا بھی دولہا بنے سہرا باندھے ہوئے موجود تھے۔ روشنی خدمت گار دوسرے نوکروں کے ساتھ انتظامات کے لئے دوڑا دوڑا پھرتا تھا مگر اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا وہ بہت ہی پریشان اور غمگین معلوم ہوتا تھا غمزہ کی شادی اس کے لئے ایک قیامت تھی مگر کوئی اس کا محرم راز نہ تھا۔ نہ اسے

یہ معلوم تھا کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے اور عمزہ کی شادی ہو جائے گی تو کیا چیز کم ہو جائے گی اور اس کے دل میں یہ خواہش کیوں ہے؟ کہ عمزہ کی شادی کسی سے نہ ہو اور وہ ہمیشہ اپنے ماں باپ کے گھر بیاہ رہے۔ اور میں اسے صبح کے وقت اکتارہ بجا کر سنایا کروں۔ روشنی نے دیکھا اور سنا کہ قاضی صاحب نے مرزا شہر بالا کا نکاح عمزہ بیگم کے ساتھ باندھ دیا اور چاروں طرف سے مبارک سلامت ہونے لگی۔ ایجاب و قبول کی باتیں سن کر روشنی کے کلیجہ میں ایک گھونسہ لگا دھواں سا اٹھا اور بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر اس کے غریب آنسوؤں کو کون دیکھتا اور جو اس پر گذر رہی تھی، اس کو کون سمجھتا اور اس کا کون خیال کرتا۔ یکا یک مرزا ابوبکر نے آواز دی۔ روشنی او روشنی! جا اکتارہ لے! اور مبارک باد کی ایک چیز سنا کیونکہ اس وقت نہ کوئی اور گانے والا ہے نہ بجانے والا ہے۔ نکاح کا اعلان اس طرح ہو جائے گا روشنی یہ حکم سنتے ہی دوڑا ہوا گیا اور اکتارہ لے آیا۔ اس نے ہندی زبان میں لڑکی کی وداع کا دردناک منڈھا گانا شروع کیا اور ایسی درد انگیز آواز سے گایا کہ مرزا خضر سلطان صاحب اور مرزا ابوبکر اور دولہا مرزا سب ہی رونے لگے اور روشنی کی تو روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔

مرزا ابوبکر نے روشنی کی یہ حالت دیکھی تو مرزا خضر سلطان سے کہنے لگے کہ روشنی بچپن سے عمزہ کی خدمت میں رہے آج اس پر عمزہ کی رخصتی کا وہی اثر معلوم ہوتا ہے جو لڑکی کی رخصتی کے وقت ماں باپ اور بہن بھائیوں پر ہوا کرتا ہے مرزا خضر سلطان نے کہا درست ہے۔ بعض لونڈی غلام اور نوکر حقیقی رشتہ داروں کی طرح اپنے آقا اور ان کے بچوں سے محبت کرنے لگتے ہیں اور روشنی کو تو آپ نے بچوں کی طرح پالا ہے۔ مرزا ابوبکر نے روشنی سے کہا۔ جا گھر میں جا۔ رونا دھونا چھوڑ۔ یہ وقت رونے کا نہیں ہوا کرتا۔ یہ سن کر روشنی زنانہ میں چلا گیا وہاں دیکھا کہ عمزہ کی والدہ ملکہ بیگم بھی رو رہی ہیں روشنی ان کے قدموں میں سر رکھ کر رونے لگا ملکہ بیگم نے کہا ارے روشنی او روشنی! اسرا تھا کیوں روتا ہے۔ بی بی عمزہ کہیں دور تھوڑی جاتی ہیں ان کے دولہا کا گھر تو سامنے ہے۔ میں تجھ کو عمزہ کے ساتھ بھیجوں گی تو روز صبح شام ان کو گانا سنایا کیجیو۔ ملکہ بیگم کی یہ بات سن کر روشنی کو ذرا تسلی ہوئی اور وہ خلوت کے کمرہ میں گیا۔ جہاں عمزہ بیگم دلہن بنی بیٹھی تھیں۔ اور وہاں چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا مگر عمزہ نے گردن نہ اٹھائی۔ دلہن بنی سر جھکائے بیٹھی رہیں تو روشنی نے کہا۔ بی بی ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے روشنی کی یہ بات سن کر عمزہ نے گردن اٹھائی، اس کو دیکھا اور مسکرا کر کہا اور تو کیوں روتا ہے دیوانہ کہیں کا۔ روشنی کو یہ فقرہ سن کر پھر رونا آگیا اور وہ عمزہ کے پاس سے اٹھ کر واپس چلا آیا۔

۱۴ ستمبر کی صبح

عزہ بیگم ۱۳ ستمبر کی صبح سورج نکلنے کے وقت اپنے دولہا کے گھر گئیں اور رات کو مرزا دولہا (شہ بالا) کی اجازت سے روشنی نے اکتارہ بجا کر دونوں دلہن دولہا کو گانا سنایا اور دوسرے دن صبح کو بلکہ پچھلی رات سے جب کہ پہاڑی سے انگریزی توپوں کے گولے قلعہ کے اندر برس رہے تھے۔ مرزا شہ بالا کی خواب گاہ کے باہر روشنی نے غالب کی غزل گانی شروع کی۔

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

مرزا شہ بالا روشنی کا گانا سن کر باہر آگئے اور انہوں نے روشنی سے کہا، ارے تو رات کو سویا بھی تھا۔ ابھی تو رات ہے۔ صبح تو ہونے دے۔ روشنی نے کہا، سرکار، حضرت ظلِ سبحانی لال قلعہ سے جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ سامان تو رات ہی کو ہمایوں کے مقبرہ میں چلا گیا تھا اور اب وہ خود بھی تیار ہیں۔ بیگمات سوار ہو رہی ہیں۔ میں اس لئے جلد آگیا کہ آپ کو یہ خبر دیدوں شاید آپ اور بیگم صاحبہ بھی ارادہ فرمائیں۔ یہ باتیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شہ بالا کے والد حضرت مرزا خضر سلطان گھبرائے ہوئے آئے اور انہوں نے کہا، بیلو بیٹا جانے کی تیاری کرو حضرت ظلِ سبحانی دربار شاہ ظفر، اور آپ کا بھائی اور دوسرے سب بہن بھائی اور بیگمات بھی روانہ ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ آج انگریزی فوج ضرور شہر میں داخل ہو جائے گی۔ یہ سنتے ہی شہ بالا زنانہ میں گیا اور عزہ بیگم کو ساری کیفیت سنائی اور تیار ہونے کے لئے کہا۔ سورج نکلتے ہی یہ سب رتھ میں سوار ہو کر ہمایوں کے مقبرہ میں پہنچ گئے اور انگریز ۱۴ ستمبر کو بارہ بجے دہلی میں داخل ہو گئے۔

۱۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کی صبح

ہمایوں کے مقبرہ میں میجر ہڈسن آئے اور بادشاہ اور بیگم زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کو گرفتار کر کے لال قلعہ میں لے گئے اور دوسرے دن پھر مقبرہ میں آئے اور باقیماندہ شہزادوں کو گرفتار کر لیا اور ان کو راستے ہی میں قتل کر دیا۔ جرنیل بخت خاں بلب علی گڈھ میں تھا اور ۱۶ ستمبر کو اسے بادشاہ کی گرفتاری اور شہزادوں کے قتل عام کی خبر ملی۔ اس نے اپنے ماتحت افسروں کو جمع کر کے مشورہ کیا اور ان سب کی یہ رائے ہوئی کہ بادشاہ کے

خاندان پر خدا کا قہر ہے اور بلب گڈھ کے ہندو راجہ سے بھی کوئی امید نہیں ہے اس واسطے ہم سب کو ان کا ساتھ دینا مناسب نہیں ہے پہلے کسی مستحکم جگہ پہنچ جائیں۔ اس کے بعد ضرورت ہوگی تو ان میں سے کسی کو بلالیں گے۔ چنانچہ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کی رات کو یہ لوگ رات کے اندھیرے میں بھاگ گئے اور ۱۷ ستمبر کی صبح کو مرزا شہ بالا اور غمزہ بیگم اور راجہ بلب گڈھ نے یہ خبر سنی تو وہ سب بہت پریشان ہوئے اور سوچنے لگے کہ کوئی جگہ ایسی تجویز ہو کہ جہاں ہم سب جاکر پناہ لے سکیں۔

دولہا کا قتل

راجہ بلب گڈھ اور مرزا شہ بالا آپس میں باتیں کر ہی رہے تھے کہ یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ میجر ہڈسن پچاس فوجی سواروں اور رجب علی مخبر اور مرزا الٰہی بخش کے ساتھ یلغار کرتے چلے آتے ہیں۔ میجر ہڈسن نے سب سے پہلے راجہ بلب گڈھ کو گرفتار کیا مگر وہ مرزا شہ بالا سے واقف نہ تھا۔ اس نے مرزا الٰہی بخش اور رجب علی سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے؟ انہوں نے کہا کہ مرزا ابوبکر کے بیٹے مرزا شہ بالا ہیں۔ رجب علی نے کہا کہ یہ وہی ہیں جو سرکار کمپنی سے لڑنے کے لئے جرنیل بخت خاں کے ساتھ آئے تھے۔ میجر ہڈسن نے نہایت حقارت سے مرزا شہ بالا کو دیکھا اور کہا جناب عالم بہادر اپنے باوا دادا کا انجام بھی سن لیا کہ ان کو ان کے گناہوں کی کیسی سزا ملی؟ مرزا شہ بالا نے تیز ہو کر جواب دیا۔ ہاں میں نے سنا ہے، او خونی بھیڑیئے! تو نے میرے باپ اور دادا کو قتل کرکے ان کا خون پیا تھا مگر تجھے معلوم نہ تھا کہ میں تیری ہڈیاں چبانے کے لئے زندہ ہوں۔ میجر ہڈسن نے مرزا شہ بالا کے سامنے سر جھکایا اور کہا کہ معاف کیجئے صاحب عالم بہادر مجھے آپ کی زندگی کی خبر نہیں تھی۔ اجازت دیجئے کہ میں مغلوں کے اس آخری چراغ کو بھی بجھا دوں۔ یہ سنتے ہی مرزا شہ بالا آگ بگولا ہو گئے اور انہوں نے آگے بڑھ کر میجر ہڈسن کے ایک طمانچہ مارا اور کہا کہ پہلے ایک مغل زادہ کا ہاتھ تو دیکھ لے میجر ہڈسن کے برابر ایک گورا سپاہی کھڑا تھا اس نے مرزا شہ بالا پر پستول چلا دیا۔ گولی مرزا کے سر میں لگی اور وہ آہ غمزہ کہہ کر گر پڑے خاک و خون میں تھوڑی دیر تڑپے اور پھر ٹھنڈے ہو گئے اور غمزہ بیگم نے بلب گڈھ کے چند مسلمانوں اور روشن خدمت گار کی مدد سے اپنے دولہا کو انہی کپڑوں میں اٹھوا کر جن میں وہ قتل ہوئے تھے قبرستان میں دفن کرایا۔

جس وقت مرزا شہ بالا کا خون آلود لاشہ قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ غمزہ بیگم نے روتے ہوئے کہا۔ مرزا خدا حافظ۔ مجھ کو کس پر چھوڑ چلے۔ نہ سلطنت رہی، نہ ماں باپ رہے نہ تم رہے جو سرتاج تھے۔ دنیا کی تاریخ میں مجھ جیسی کوئی بدنصیب لڑکی نہ ہوگی جس کی شادی کو دو رات دن ہوتے ہیں اور اس کا

سہاگ اجڑ گیا مگر میں بہت سی عورتوں سے بھی زیادہ وفادار ہوں اور تمام عمر تمہاری یاد کی آگ میں جلتی رہوں گی۔ اسی رات کو عزہ بیگم روشنی خدمت گار کے ساتھ اپنے دولہا شہید کی قبر پر گئی اور روشنی سے کہا تو میرے دولہا کی یاد میں کوئی غمگین گانا سنا تاکہ فرقت کی وہ آگ جو میرے سینے میں بھڑک رہی ہے اور زیادہ تیز ہوجائے اور میں اس میں جل کر ختم ہوجاؤں۔

قبرستان میں جو رات گذری وہ عزہ بیگم کی زندگی میں مصیبت کی پہلی رات تھی۔ اگرچہ لال قلعہ سے نکلنا، مقبرہ ہمایوں میں آنا اور وہاں سے بلب گڈھ پہنچنا یہ سب بھی مصیبت اور پریشانی کے دن رات تھے۔ مگر مرزا شہ بالا کے مقتول ہونے کے بعد عزہ بیگم کے لئے یہ پہلی رات تھی جس کی صبح ان کو نظر نہ آتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رات کٹ جائے گی، سویرا ہوگا۔ سورج نکلے گا مگر میری مصیبت کی رات مرتے دم تک ختم نہ ہوگی اور میں رات کی صبح کا چہرہ کبھی نہ دیکھ سکوں گی، باپ بھی قتل ہوگئے سسرال والے بھی مارے گئے اور سرتاج شوہر بھی خون میں ڈوب کر دنیا سے چل بسے۔ سہاگ کی دولتیں بھی نہ دیکھیں۔ ہاتھوں کی لال مہندی اور سہاگ کا عطر، رنگ و بو کے لحاظ سے موجود ہیں مگر ان دونوں کی روح موجود نہیں۔ جب اجالا ہوگیا تو عزہ بیگم روشنی خدمت گار کے ساتھ قبر سے رخصت ہوئیں انہوں نے شہید مظلوم کی خاک کی ڈھیری کو آنسو بھری آنکھوں سے چلتے چلتے دیکھا اور کہا لو جاتے ہیں۔ شہ بالا تم نے اسی شہر کو آباد کیا اور ہماری زندگی کی دنیا اجاڑ دی۔ جب تک جئیں گے تمہارے نام اور تمہاری عزت کو سنبھالے رہیں گے۔

راجہ بلب گڈھ کی گرفتاری کے سبب بلب گڈھ میں بھی بڑی ہلچل تھی اور ایک کہرام مچا ہوا تھا اس لئے عزہ بیگم نے یہاں ٹھہرنا بھی مناسب نہ سمجھا اور مردانہ لباس پہن کر آگرہ کی تیاری کی۔ کچھ جڑاؤ زیور عزہ بیگم کے پاس تھے ان کو روشنی خدمت گار نے اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیا یہ دونوں کرایہ کی بیل گاڑی میں بلب گڈھ سے روانہ ہوئے۔ ان کا لباس ہندو گنواروں کا تھا۔ اس لئے لوٹنے والے ہندو گوجران کو نہ ستاتے تھے مگر جب گاڑی متھرا سے آگے بڑھی تو ملکانہ راجپوتوں کے ایک گروہ نے حملہ کیا ان کو لوٹا اور ان دونوں کے کپڑے اتار لئے۔ روشنی کی کمر سے جو زیور بندھا ہوا تھا وہ بھی چھین لیا اور یہ بہت دشواری کے ساتھ پیدل چل کر آگرہ پہنچے اور حکیموں کے محلہ میں جہاں روشنی خدمت گار کے کوئی واقف رہتے تھے۔ قیام کیا۔

روشنی خدمت گار نے دوسرے وقت قوالوں کی ایک چوکی میں شرکت کرلی جو ایک ہندو رئیس کے ہاں ملازم تھی رئیس کو روشنی کا گانا اس قدر پسند آیا کہ وہ اسے چوکی کی تنخواہ کے علاوہ بھی دس روپیہ مہینہ دینے لگے جس سے روشنی نے کرایہ کا ایک مکان لے لیا جہاں عزہ بیگم نے عدت کے دن پورے کئے اگرچہ

روشنی اور غمزہ بیگم ایک مکان میں اکیلے رہتے تھے دونوں کی عمریں کم تھیں مگر دونوں اس قدر پاکباز اور نیک دل تھے کہ کبھی کسی برے خیال کا اشارہ تک نہ ہوتا تھا۔ جب عدت پوری ہوگئی تو روشنی نے ایک دن غمزہ بیگم سے کہا کہ

"میری یہ مجال نہیں کہ آپ کی آئندہ زندگی کی نسبت مشورہ دوں یا اپنے کسی پوشیدہ تعلق کو ظاہر کروں مگر جب قسمت نے یہ دن دکھلائے ہیں تو عرض کرنا پڑتا ہے کہ ہم دونوں کا اس طرح اکیلا ایک جگہ بے پردہ رہنا شیطان کی رخنہ اندازی کا باعث ہوگا۔

غمزہ بیگم : تمہارا مدعا اس گفتگو سے کیا ہے؟

روشنی : میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کسی سے عقد کر لیں اور میں باہر ڈیوڑھی میں غلاموں کی طرح رہوں۔ اس طرح تنہائی میں دونوں ہم عمر مرد عورت کا رہنا خطرناک ہے۔

غمزہ بیگم : تم نے شہبالا کو اتنی جلدی بھلا دیا۔ میں ساری عمر ان کے نام پر بیٹھی رہوں گی۔ جیسا کہ میں نے ملب گڑھ سے چلتے وقت شہید کی قبر پر وعدہ کیا تھا۔

روشنی : عقد ہو جانے کے بعد بھی آپ ان کو یاد رکھ سکتی ہیں۔

غمزہ بیگم : اگر عقد محبت کا نام ہے تو وہ دو جگہ تقسیم نہیں ہو سکتی۔

روشنی : میری لیاقت اتنی نہیں ہے جو آپ سے بحث کر سکوں مگر ہاں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ میں ایک خدمت گار ہی ہوں اور آپ کو خوش رکھنے کی تمنا رکھنے والا بھی ہوں۔ عدت ختم ہوگئی۔ مرحوم کا سوگ ختم ہو جانا چاہئے یا ساری عمر رہے گی مگر سوگ ساری عمر نہیں رہا کرتا آخر اپنے والد کو اور دادا کو ان کی سلطنت کو اور اپنے عیش و آرام کو کب تک یاد کرتی رہیں گی۔

غمزہ بیگم : تو اپنے دل کی بات صاف صاف کیوں نہیں کہتا۔ میں یہاں کس سے عقد کروں گی اور کون میرا عقد کرنے والا ہوگا میں جانتی ہوں کہ ایک جوان عورت کا بیوہ رہنا گناہ ہے اور شادی نہ کرنا ہندوانہ رسم ہے۔ لیکن کیا کروں روشنی صدمہ دل پر ایسا ہے کہ تاب نہیں پایا جاتا۔

روشنی نے ان باتوں سے سہارا پایا اور غمزہ بیگم کے قدموں پر گر پڑا اور رو رو کر کہنے لگا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ میں ایک بات زبان سے کہنے کے لئے زندہ رہوں گا۔ بیگم آپ جانتی ہیں میرے دل کی بات آج کہ اس وقت سے معلوم ہے جب کہ آپ کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی مجھے معاف کیجئے۔ اگر اس عرض میں کوئی گستاخی ہو کہ میں آپ کی نگاہوں میں اپنی قدر کی روشنی بچپن سے دیکھ رہا ہوں میں چاہتا ہوں کہ مرتے دم تک اپنے دل کی آگ کو دبائے رکھوں مگر حالات ایسے پیش آئے کہ مجھے اظہار کی ضرورت پڑ گئی اور وہ کہنا پڑا جس کے لئے زبان پر ہمیشہ کے لئے قفل ڈال لیا تھا۔

عزہ بیگم : روشنی سر اٹھا، دل سنبھال۔ مجھے سب کچھ معلوم تھا اور سب کچھ معلوم ہے۔ اگر مرزا شہ بالا کا خیال قائم نہ ہو چکا ہوتا اور تو غلام نسل سے نہ ہوتا تو میں جس طرح بن پڑتا تجھ سے عقد کرتی۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ اگر تو اس پر راضی ہو کہ مرزا شہ بالا کی مزاحمت نہیں کریگا اور ان کی محبت کو رقابت کی نظر سے نہ دیکھے گا تو میں تجھ کو اجازت دے دوں گی کہ قاضی کو بلا اور کل جمعہ کی شام کو میری اور اپنی زندگی شریعت کے حکم سے باندھ لے۔

دوسرے دن دونوں کا نکاح ہو گیا اور ایک سال ایسی راحت کا گذرا کہ ان دونوں کو گذشتہ مصیبتیں خواب و خیال معلوم ہونے لگیں۔ البتہ عزہ بیگم نے مرزا شہ بالا کی یاد کو زندہ رکھا اور روشنی بھی اس یاد میں بیگم صاحبہ کا شریک حال رہا۔

مصیبت اور خاتمہ

یہ ایک سال ایسا گذر گیا گویا ایک گھڑی گذری۔ ان دونوں کی خوشیاں اور شادیاں اور زندگی قابل رشک تھی۔ آخر قسمت نے پھر پلٹا کھایا اور جو رئیس روشنی کے آقا تھے اور جن کو معلوم ہو گیا تھا کہ روشنی کے گھر میں بہادر شاہ ظفر بادشاہ کی پوتی ہے وہ آگرہ سے دھول پور چلے گئے جہاں ان کی جاگیر تھی اور روشنی کو حکم دیئے گئے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وہاں آ جائے۔ چنانچہ روشنی بھی چند روز کے بعد دھول پور چلا گیا اور کرایہ کا مکان لے کر رہنے لگا۔ ایک دن عزہ بیگم جاگیردار صاحب کے گھر میں کسی شادی میں گئیں۔ جاگیردار صاحب کی بیوی نے عزہ بیگم کی خاطر کی اور عزت کا برتاؤ کیا اور کہا کہ ہمارے مکان کے برابر ہمارا ایک بڑا مکان خالی ہے۔ تم یہاں آ جاؤ۔ سنا ہے کہ تمہارا مکان بہت چھوٹا اور خراب ہے۔ عزہ بیگم نے فوراً شکریہ ادا کیا اور کہا بے شک وہ جگہ اچھی نہیں ہے، محلہ بھی خراب ہے میں اب یہاں آ جاؤں گی۔

چنانچہ عزہ بیگم دوسرے دن اس مکان میں آ گئیں۔ چند ہفتے بعد روشنی رات کو جاگیردار صاحب کے ہاں سے آیا تو اس نے کہا کہ آج جاگیردار صاحب نے مجھے پان دیا تھا جب سے کھایا ہے متلی ہو رہی ہے یہ کہتے ہی روشنی کو قے ہوئی اور خون آیا۔ تھوڑی دیر میں دوسری قے ہوئی اور پھر تیسری ہوئی، روشنی بے ہوش ہو گیا۔ عزہ بیگم نے فوراً حکیم صاحب کو بلانے کے لئے جاگیردار صاحب کے ہاں آواز دی۔ وہاں سے جواب آیا کہ ابھی حکیم صاحب کو بلاتے ہیں۔

مگر حکیم صاحب دو گھنٹے تک نہ آئے اور روشنی جان کنی میں مبتلا ہو گیا۔ عزہ بیگم نے گھر کے علاج سب ہی کچھ کئے مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ اور روشنی مر گیا۔

عزہ بیگم نے بے تحاشا ہو کر چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ جاگیردار صاحب کی بیوی اور چند عورتیں اور آ گئیں انہوں نے عزہ بیگم کو تسلیاں دیں آخر صبح کو دفن قبرستان میں جا سوئے اور عزہ بیگم کے پاس جاگیردار صاحب کی ایک خاص نوکرانی رہنے لگی۔ وہ جاگیردار صاحب نے عزہ کا سب سامان بھجوا دیا۔ دو ہفتے کے بعد اسی نوکرانی نے جاگیردار صاحب کا پیغام دیا کہ وہ تم سے عقد کرنا چاہتے ہیں عزہ بیگم نے اس عورت کے ایک طمانچہ مارا اور کہا کہ ہندو میں مسلمان۔ عقد کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میں ابھی عدت میں ہوں اور مجھے شبہ ہے کہ جاگیردار صاحب نے ہی روشن کو مارا ہے۔ پان میں زہر دے دیا گیا تھا۔

دو چار دن کی خاموشی کے بعد ایک رات کو عزہ بیگم سوئی ہوئی تھی کہ کسی نے ان کو دبوچ لیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک اجنبی مرد ہے۔ عزہ نے جاگیردار کو دروازے کے سوراخوں سے بارہا دیکھا تھا۔ اس لئے پہچان لیا کہ یہ وہی جاگیردار ہے۔ عزہ بیگم نے اس کے سینہ پر مکہ مارا اور اٹھ کر دور جا کھڑی ہوئی اور کہا تم کو شرم نہیں آتی۔ اپنے نوکر کی بیوی پر بری نظر ڈالتے ہو اور تم ہی میرے شوہر کے قاتل ہو۔

جاگیردار نشہ میں تھا اس نے جواب نہ دیا اور پھر آگے بڑھا۔ عزہ نے باورچی خانہ کی چھری اٹھا کر دکھائی اور کہا دور کھڑا رہ ورنہ میں کام تمام کر دوں گی۔ مگر جاگیردار نے پرواہ نہ کی اور آگے بڑھ آیا۔ عزہ بیگم نے اس کے بڑھتے ہی اس کے سینے میں چھری ماری جو اس کے دل پر لگی اور جاگیردار ہائے کہہ کر گرا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ جاگیردار کے گھر کی عورتیں اور مرد شور و غل کی آوازیں سن کر جمع ہو گئے اور انہوں نے عزہ کے ہاتھ میں سے چھری چھین لی اور اس کو کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اسی وقت پولیس آ گئی اور ضروری تحقیقات کے بعد عزہ کو حوالات میں لے گئی۔ مقدمہ ایک ہندو حاکم کے ہاں پیش ہوا اور عزہ نے سارا حال سچا سچا بیان کر دیا۔ حاکم نے فیصلہ کیا کہ آبرو بچانے کے لئے جو تم نے جرم کیا ہے وہ قابل آفرین ہے۔ مگر جاگیردار کی نوکرانی جو عینی گواہ ہے اس کا بیان ہے کہ تمہارا جاگیردار سے تعلق تھا۔ اور تم نے اپنے شوہر کو خود زہر دے کر مارا تھا اور اب ایک دوسرے مرد کے تعلق پر جاگیردار صاحب نے تنبیہ کی تو تم نے اس کو قتل کر دیا۔ اس لئے میں تم کو بیس سال قید کی سزا دیتا ہوں۔ اپیل پر بھی یہ سزا بحال رہی جو عدالت کے خرچ پر ہوئی تھی۔ آخر عزہ بیگم دھول پور کے قید خانے میں بند ہو گئی۔

جیل خانہ کا داروغہ بہت بدچلن آدمی تھا۔ اس نے عزہ بیگم کو خوش رو دیکھا تو بدنیتی کا اظہار کرنے لگا۔ عزہ بیگم نے کہا تجھ کو معلوم ہے کہ میں نے جاگیردار کو جان سے مار ڈالا کیونکہ اس کی نیت خراب تھی

میں شہنشاہِ ہندوستان کی پوتی ہوں یاد رکھو اگر تم نے بھی بُرا ارادہ کیا تو تجھ کو بھی جاگیردار کے پاس پہنچا دوں گی۔ داروغہ نے عمزہ بیگم کو ایک من گیہوں پیسنے کے لئے دیئے اور بد قند از عورت کو حکم دیا کہ جب یہ عورت چکی پیسنے سے ہاتھ روکے اس کے کوڑے مارنے شروع کر دے۔

چنانچہ جب عمزہ بیگم نے چکی چلانی شروع کی تو تھوڑی دیر میں وہ تھک گئیں اور ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ بازو شل ہو گئے۔ سانس پھول گیا تو انہوں نے ہاتھ روکا۔ ہاتھ کا روکنا تھا کہ ظالم بد قند از عورت نے عمزہ بیگم کے کوڑے مارنے شروع کر دیئے۔ عمزہ بیگم بے تاب ہو کر لوٹنے لگیں اور ان کے منہ سے بے اختیار فقرے نکلے۔

"ظالم مجھے نہ مار میں ہندوستان کے شہنشاہ کی پوتی ہوں۔ مصیبت زدہ ہوں، رحم کر۔"

مگر وہ سنگدل عورت برابر کوڑے مارتی رہی۔ عمزہ بیگم کا سانس رکنے لگا اور وہ بے ہوش ہو گئیں عورت نے ہاتھ روک لیا اور داروغہ کے پاس خبر دینے گئی۔ داروغہ فوراً کوٹھڑی میں آیا، تھوڑی دیر میں عمزہ بیگم کو ہوش آیا تو انہوں نے داروغہ کو دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا اور کہا، پرے ہٹ بے غیرت، قیدی عورت بھی پردہ کا حق رکھتی ہے تجھ کو کس نے اجازت دی جو تو یہاں پر آ گیا۔

داروغہ نے یہ سن کر بد قند از عورت سے کوڑا لے کر عمزہ بیگم کو پھر مارنا شروع کیا۔ عمزہ بیگم اس مار کی تاب نہ لا سکیں اور انہوں نے چیخنا شروع کیا اور کہا۔

"ارے کوئی مرزا شہ بالا کو خبر دے کہ ان کی ناموس کے ساتھ یہ سفاکی ہو رہی ہے، یا اللہ میری مدد کر۔ میرا کوئی حمایتی تیری ذات کے سوا دنیا کے پردہ پر نہیں ہے۔ میں امیر تیمور کی نسل میں ہوں۔ میں اکبر کی اولاد ہوں۔ میں اورنگ زیب کی اولاد ہوں۔ مجھے بچا اس ظالم کے ظلم سے پناہ دے۔"

داروغہ نے کوٹھڑی بند کر دی اور باہر سے تالا لگا کر چلا گیا اور تین دن تک عمزہ بیگم کے کھانے پینے کی خبر نہ لی اور پہرہ لگا دیا کہ کوئی شخص اس کوٹھڑی کے پاس نہ جانے پائے۔ عمزہ بیگم رات دن چیختی تھی اور پانی مانگتی تھی مگر کوئی نہ سنتا تھا۔ تیسرے دن کوٹھڑی کھولی گئی۔ عمزہ ناتواں اور بے حس و حرکت پڑی تھی اور غشی کا عالم طاری تھا۔ داروغہ نے کہا کیوں اب بھی وہی بادشاہی غصہ ہے یا اب بل نکل گئے۔ عمزہ نے نہایت ناتواں آواز میں پانی مانگا۔ تھوڑا پانی۔ داروغہ نے پاؤں کی ٹھوکر مار کر کہا کہ تجھ کو پانی جب ملے گا تو اپنی گستاخی چھوڑ کر میرا حکم مانے گی عمزہ نے اپنا ہاتھ اٹھا کر ماتھے پر مارا اور کہا "ہائے قسمت" اور پھر چپ ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد پھر کہا، پانی میں مری جا رہی ہوں تھوڑا سا پانی دے دو۔ داروغہ نے کہا۔

"پانی بھی ہے، کھانا بھی ہے، آرام کی جگہ بھی ہے، اری دیوانی تجھ کو بیس سال یہاں رہنا ہے، عزت

وآبرو کا خیال چھوڑ اور میرا کہنا مان "۔

عزہ نے نہایت نفرت کے ساتھ داروغہ کو دیکھا اور کمزور سی آواز میں کہا۔ "ہرگز نہیں! مر جاؤں گی مگر باپ دادا کی عزت پر حرف نہ آنے دوں گی "۔ یہ سن کر داروغہ نے پھر ٹھوکر ماری جو عزہ کے سینہ پر لگی جس سے اس کے ناتواں قلب پر چوٹ لگی اور وہ آہ کر کر مرگئی۔ داروغہ نے یہ کیفیت دیکھی تو بہت ڈرا مگر اس نے اسی وقت جیل کے آدمیوں کو بلا کر گورِ غریباں میں عزہ کو دفن کرا دیا اور لکھ دیا کہ قیدی عورت تین دن سے پسلی کے درد میں مبتلا تھی اس مرض میں وفات پاگئی۔ یہ ہوا انجام اس شہزادی کا جس کی زندگی کا آغاز شاہانہ عیش و عشرت سے ہوا۔ اس وقت اس کو یہ خیال نہ آسکتا تھا کہ وہ جیل خانے میں ایک ظالم کی ٹھوکر کھا کر جان دے گی اور پھر کوئی اس کی موت کا سبب معلوم کرنے والا بھی نہ ہوگا۔

(بشکریہ ماہنامہ گل خنداں لاہور سن ۱۸۵۷ء نمبر)

بقیہ: سنی ادیب

۳۔ جناب محمود علی صاحب پاکپتن شریف۔ تاریخ اجودھن مطبوعہ ص ۱۴۱ مطبوعہ رام پور۔

۴۔ مرزا عثمان خاں بدایونی۔ رسالہ ذو القرنین بدایوں ص ۱۲ ماہ اپریل ۱۹۵۱ء

۵۔ حضرت مولانا عبد المجید صاحب خیر پوری۔ قلمی مخطوطہ ص ۲۲۱ مملوکہ اسد نظامی۔

۶۔ حضرت مولانا قاضی نور مصطفیٰ صاحب انصاری۔ تاریخ انصاریان قلمی ص ۴۹ مملوکہ اسد نظامی

۷۔ " " " " " " " "

قلعہ آگرہ

مقبرہ ہمایوں

جنگِ آزادی میں اُمرا کا حصّہ

(تحریر عابد قصوری)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ہر طبقۂ فکر کے لوگوں نے بھرپور حصہ لیا۔ علماء میں مجاہدِ کبیر، مولانا فضل حق خیر آبادیؒ، مولانا مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا امام بخش صہبائی، مفتی عنایت احمد کاکورویؒ، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا کفایت علی کافیؒ، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسیؒ، حکیم سعید اللہ قادریؒ، ڈاکٹر وزیر خان، عظیم اللہ خانؒ، مفتی انعام اللہ خانؒ، اہلِ سیف میں سے جنرل محمد بخت خانِ اعظمؒ اور امرا میں نواب تفضل حسین خان، نواب خان بہادر خان، نواب محمود خان اور نواب موتی خان وغیرہم نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کے علاوہ حضرت محل، اور رانی جھانسی نے بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔

اسے تاریخ کی ستم ظریفی کہیئے یا کچھ اور کہ آج ان محسنوں کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ آج لوگ جنگ آزادی کی تفصیلات تو کجا جنگ آزادی کے واقعے ہی سے روشناس نہیں ہیں۔ بعض لوگ حیرت سے پوچھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی بھی کوئی اہمیت ہے۔ وہ تو غدر تھا۔ آج مجاہدین کی مقدس ارواح کیا ہمیں احسان فراموشی کا طعنہ نہ دیتی ہوں گی؟ ...... ضرورت تھی کہ ان مجاہدین کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ ادارہ "ترجمان اہلِ سنت" قابلِ صد مبارکباد ہے کہ وہ خاص نمبر نکال کر اس عظیم فرض سے سبکدوش ہو رہا ہے۔

ذیل میں ان امرا و حکما کا تذکرہ (مختصراً) پیش کیا جا رہا ہے جنہوں نے آزادی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے اپنا تن من دھن لٹا دیا اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر آزادی کی جنگ میں کود پڑے۔

نواب تفضل حسین خانؒ والئی فرخ آباد

نواب تفضل حسین خاں ریاست فرخ آباد کے نواب تجمل حسین خاں کا بھتیجا اور نصرت جنگ کا بیٹا تھا۔ چونکہ نواب تجمل حسین خاں کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، اس لئے تفضل حسین خاں کو ریاست کا والی تسلیم کر لیا گیا۔ تفضل حسین خاں ربیع الثانی ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۶ر اکتوبر ۱۸۲۷ء کو متولد ہوئے۔ نواب تجمل حسین خاں کی آغوش میں پرورش پائی۔ ۴ر دسمبر ۱۸۴۶ء کو مسند نشین ہوئے۔

ابوالکلام کے والد ماجد مولانا خیر الدینؒ فرماتے ہیں کہ " تفضل حسین خاں اتنا شوقین اور خوش

پوشاک نفیس تھا کشمیر کے تاجر سب سے پہلے اسی کے پاس جاتے تھے۔ پھر لکھنؤ کا رُخ کرتے۔" یہ نواب تھا جس کے لئے ۱۸۵۷ء میں جہاد آزادی کو تقویت پہنچانے کا کام مقدر ہو چکا تھا۔

جنگِ آزادی شروع ہوئی تو ۱۰ رجمنٹ نے انگریزوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکا۔ اور نواب صاحب کو اپنا رئیس بنا کر اعلانِ جہاد کر دیا۔ سیتاپور سے آغا حسین دو ہزار فوج لے کر نواب صاحب کے پاس آئے۔ احمد یار خاں اور محسن علی خاں مجاہدین فرخ آباد کے رئیس تھے۔ اس طرح نواب صاحب کے پاس تین ہزار کے قریب لشکر جمع ہو گیا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ساتھ معرکۃ الآرا جنگ ہوئی۔ غداروں نے ہر جگہ دھوکے دیئے اور نواب صاحب کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ نواب صاحب نے بالآخر مجبوراً جاں بخشی کے وعدے پر اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

نواب صاحب پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ چونکہ جاں بخشی کا وعدہ ہو چکا تھا، اس لئے پھانسی نہیں دی جا سکتی تھی۔ ہندوستان میں آزاد چھوڑنا بھی خارج از بحث تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نواب صاحب نے پھانسی کی سزا کے خلاف وائسرائے کے ہاں اپیل کی تھی۔ اس پر یہ حکم صادر ہوا کہ نواب صاحب مقبوضاتِ برطانیہ سے باہر کسی ملک میں جا بسیں۔ چنانچہ نواب صاحب مکہ معظمہ چلے گئے۔

مولانا ابوالکلام کے والد ماجد مکہ معظمہ پہنچے تو دیکھا، جس نواب کی خوش پوشاکی کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس کا یہ حال تھا کہ چھینٹ کا ایک میلا کچیلا انگرکھا جسم پر تھا۔ یہ دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ..... کہتے ہیں۔

"میں نے ہر چند کوشش کی کہ نواب صاحب کی ضروریات کا انتظام کر دوں مگر انہوں نے قبول نہ کیا۔ وہ کہتے تھے، میں آپ کے خاندان سے ارادت رکھتا ہوں۔ میری جگہ نذر پیش کرنے کی ہے نہ لینے کی۔"

مولانا کے والد ماجد نے نواب صاحب کی ملاقات شریفِ مکہ سے بھی کرا دی۔ بے نوائی کی حالت میں بھی انہوں نے گوارا نہ کیا کہ تحفے کے بغیر ملیں۔ ایک قیمتی چیز ان کے پاس رہ گئی تھی، وہی تحفے میں پیش کر دی۔"

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں حج کے لئے گئے تو مکہ معظمہ میں نواب تفضل حسین خاں سے ملاقات کی۔ اور نواب صاحب کی شکستہ حالی اور فقر و تہی دستی سے سخت متاثر ہوئے۔ چنانچہ ریاست کی طرف سے جو اعلیٰ ملبوسات تقسیم کیلئے لے گئے تھے، ان میں سے ایک بیش قیمت لباس بکمالِ اصرار نواب صاحب کی نذر کیا۔

نواب صاحب کا معمول یہ تھا کہ ظہر کے اوّل وقت حرم شریف میں آتے اور عشاء کی نماز پڑھ کر گھر جاتے ۱۸۸۲ء میں اس مردِ مجاہد نے وفات پائی اور مکہ کی خاکِ مقدس میں آسودۂ خوابِ ابدی ہے۔

نواب خان بہادر خاں رحمہ اللہ

نواب خان بہادر خاں، والی روہیلکھنڈ حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے۔ شجاع الدولہ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر جب حافظ رحمت خاں

کو شکست دی تو وہ غیرت و حمیت کے جوش میں انگریزی توپوں سے ٹکرا کر ختم ہو گئے اور روہیل کھنڈ کو حکومت اودھ میں ملا لیا گیا۔ روہیلے تباہ ہو گئے۔

خان بہادر خان جب جوان ہوا تو اس میں دادا کی سمجھ، دلیری اور انسانیت تھی۔ اسی طرح غیرت مند مسلمان تھا۔ انگریزوں نے اس کی عزت کی اور بریلی میں مجسٹریٹی کا عہدہ بھی دے دیا۔ علاقے کو اس پر بھروسہ اور قوم کو اعتماد تھا۔ جب اسلام کی گری وجاہت کا ڈنکا بجایا گیا تو یہ بہادر رد بیمہ اسٹیج پر کود پڑا۔

بریلی میں انقلاب کی تیاری ہوئی، بارودی سرنگیں بچھائی گئیں۔ بہادر خان نے مجاہدین کی کمان سنبھالی اور ۳۱ مئی کی رات کو انگریزی نظام کے قلعے کو مسمار کر دیا۔ رسالدار محمد شفیع نے سپاہیوں کو للکار کر کہا کہ "اپنے دین کے لئے مر جاؤ اور مار دو" ان سواروں نے جھپٹ کر بریگیڈیر سیبلڈ، کپتان کربی، کرنل ٹراپ کپتان رابرٹ وغیرہ کو کاٹ پھینکا۔ بریلی آزاد ہو گئی۔

صوبیدار بخت خان کو کمانڈر بنا دیا گیا۔ اس نے اتفاق رائے سے حضرت بہادر خان کو روہیل کھنڈ کا حکمران چنا۔ حکمران بننے کے بعد بہادر خان نے انگریز قیدیوں کو اپنے سامنے طلب کیا۔ چونکہ خود جج رہ چکا تھا، اس نے انگریز مجرموں پر مقدمہ چلانے کے لئے ایک جیوری مقرر کی۔ ان انگریزوں میں ایک ڈاکٹر تھا، جو صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر کا داماد تھا۔ ان میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی شامل تھا اور یہ اس کے دوست تھے۔ جیوری نے مختلف جرم ثابت کر کے سب کو موت کی سزا دی۔ کمشنر کی تلاش کے لئے ایک ہزار روپیہ مقرر کیا۔

اس کے بعد نواب بہادر نے بریلی کی آزادی کا پیغام بادشاہ کو بھیج دیا۔ چھ گھنٹے کے اندر تمام مقامات بدایوں شاہ جہاں پور، مرادآباد وغیرہ سے انگریز نکال دیئے گئے ہیں۔ اور ملک کا جھنڈا بلند کر دیا ہے۔

سر کولن کیمبل خود فوجیں لے کر بریلی پہنچا، پھر تاریخ نے دیکھا کر خان بہادر خان کی زیر کمان جمعیت نے اس معرکے میں کیا کارنامہ کیا۔ جاں باز مسلمان اور مجاہد روہیلے انگریزی فوجیوں کو کاٹ کر خود ایک ایک کر کے کٹ گئے اور میدان سے قدم نہ ہٹایا۔

مولانا احمد اللہ شاہ کی شہادت کے بعد مجاہدین اور آس پاس کے زمینداروں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راجہ پوایں کو غداری اور بدعہدی کی عبرت ناک سزا دیں۔ اس پر جہان نظام علی خان، نواب تفضل حسین خان، ولایت شاہ، علی خان میواتی، اور بعض دوسرے مجاہد فوج لے کر جمع ہوئے۔ خان بہادر خان بھی چار ہزار جانبازوں کے ساتھ ان کے ہمراہ تھا۔ نظام علی خان اور علی خان میواتی نے اس سلسلے میں پیلی بھیت پر بھی حملہ کیا۔

۱۸۵۹ء میں کوہستان نیپال کے دامن کی ایک لڑائی میں خان بہادر خان گھوڑے سے اتفاقیہ گر پڑا اور گرفتار ہو گیا۔ انگریز اسے لکھنؤ لائے۔ چیف کمشنر کے روبرو پیش کیا گیا تو خان بہادر زمین پر بیٹھ گئے۔ کرسی پیش کی گئی تو فرمایا۔ "مدتوں کرسی پر بیٹھے، اب قیدیوں کی جگہ بیٹھنا چاہیئے۔" چیف کمشنر نے بزور کرسی پر بٹھا دیا۔

بعد ازاں لکھنؤ سے بریلی لاکر کوتوالی کے سامنے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ آخری وقت ان سے کہا گیا کہ کچھ نصیحت و وصیت کرنی ہو تو کر دیجئے۔ فرمایا "مجھے کچھ نہیں کہنا" پھر آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا۔

بہ جرم کلمہ حق می کشند غوغا نیست ... ز مرگ زندگی بے شود تماشا نیست

انگریزوں نے فوج اور توپ خانے سے شہر کی ناکہ بندی کر دی تھی، تاکہ کوئی شورش نہ ہو۔ پھانسی کے بعد نعش ورثہ کے حوالے نہ کی گئی کہ وہ لوگ باہر دفن کر کے قبر کو زیارت گاہ عام بنا دیں گے۔ ڈسٹرکٹ جیل بریلی ہی میں خان بہادر مجاہد کو دفن کرا دیا۔ سید الطاف علی بریلوی ایڈیٹر "العلم" کراچی اس موقعے پر موجود تھے۔ انہوں نے نعش کو بلا غسل قبر میں رکھتے ہوئے دیکھا تو اپنا رومال مرحوم کے چہرے پر ڈال دیا۔ خان بہادر خان کی مہر پر "الحکم للہ والملک للہ" کے الفاظ کندہ تھے۔

نواب محمود خاں

نواب محمود خاں نجیب الظفر بن یوسف زئی روہیلہ پٹھان تھے۔ نواب معین خان عرف جہانگیر خان ابن محمود خاں ابن ضابطہ خاں ابن نواب نجیب الدولہ کے لڑکے اور غلام قادر خاں روہیلہ کے بھتیجے تھے۔ نجیب آباد ضلع بجنور کی کوٹھی مبارک محل میں پیدا ہوئے۔ نواب جلو خاں نے محمود خاں کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔ جب سن شعور کو پہنچے تو علاقے کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔

محمود خاں نے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ میاں محمد شفیع اپنی کتاب "۱۸۵۷ء" میں لکھتے ہیں

"نجیب الدولہ کے پوتے محمود خاں نے بھی ملک کی آزادی میں جان لڑائی۔ سرسید اس وقت بجنور میں منصف تھے۔ انگریزوں کو پناہ دے رہے تھے۔ یہ بات انقلابیوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ محمود خاں ان سے سخت الجھا۔ جس سے سرسید کی جان بھی خطرے میں پڑ گئی اور بمشکل چھٹکارا پا کر کسی طرف کھسک گئے۔ لیکن اتنا کیا کہ انگریزوں کو میرٹھ بھیج دیا۔

یہی وجہ ہے کہ وہ اس روہیلے پر لعن طعن کرتے تھے اور انقلابیوں کے کاموں کو مستحسن نہ سمجھتے تھے۔ آخر کار انگریزوں کی بن آئی اور اس جوان کو بھی شکست دے کر موت سے ہم آغوش کر دیا۔ اس طرح نجیب الدولہ کا خاندان بھی ختم ہو گیا۔"

جب انگریز بجنور پر قابض ہو گئے تو نواب کے خلاف مقدمہ چلا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔ لیکن ابھی انڈیمان بھیجے نہ گئے تھے کہ قید ہی میں وفات پائی۔ ان کے چھوٹے بھائی جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں نور پور میں ۱۹ اپریل ۱۸۵۸ء کو پھانسی پر لٹکائے گئے اور ان کا دیوان خانہ بارود سے اڑا دیا گیا۔

نواب مَمّو خاں

میر واجد علی عرف ممّو خاں الملقب علی محمد خاں بہادر داروغہ دیوان خاص شجاع اور بہادر شخص تھے۔ برجیس قدر کو تخت لکھنؤ پر بٹھانے میں ممّو خاں کی

کارفرمائی کو زیادہ دخل ہے۔ بلکہ حکومت برجیسی کے لئے اپنی جان کی بازی لگادی۔ معرکۂ جنگ میں پیش پیش رہے۔ جب حضرت محل انگریزی فوج کے مقابلے کے لئے شاہ جہان پور گئیں تو یہ ان کے ساتھ تھے۔ پھر ان بیٹوں نے نیپال کا رُخ کیا۔ جنگ بہادر سپہ سالار نے ہر دو کو نیپال میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ باقی ہر ایک کو رخصت کر دیا۔

نواب ممّو خاں نیپال کے سپہ سالار کے کیمپ کے قریب اس انتظار میں رہے کہ حضرت محل راجہ نیپال سے پروانہ داخلہ کا بھجوا دیں گی۔ مگر یہ بہادر برادر راجہ جنگ بہادر نے انگریزی فوج کے افسروں کو دے کر ان کو گرفتار کرا دیا ۷ دسمبر ۱۸۵۹ء کو جیل میں داخل کئے گئے۔ مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ آپ پر پھانسی منسوخ کرکے کالے پانی بھیج دیا گیا۔ چنانچہ دریائے شور جزیرہ انڈمان بھیج دیئے گئے۔ وہاں معمولی سی دکان کھولی۔ اور اسی کس مپرسی کی حالت میں جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

رکھ لی میرے خدا نے میری بے کسی کی شرم ۔۔۔ مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

نواب مجّو خاں مرادآبادی

نواب مجّو خاں مرادآباد کے جاگیردار تھے۔ امارت کے ساتھ تہور و شجاع بھی تھے۔ بہت بڑے مخیر اور اہلِ علم کے قدر دان تھے۔ جنگ آزادی میں نواب صاحب نے علمِ آزادی بلند کیا اور شہزادہ فیروز شاہ کی ہر قسم کی معاونت کی۔ نواب رام پور نے ملک و وطن کے ساتھ غداری کی۔ اور رام پور سے اپنی فوج بھیج کر مرادآباد پر انگریزوں کا قبضہ کرا دیا۔ انگریزی حکام نے محبانِ وطن کو گرفتار کرکے تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ نواب صاحب بھی گرفتار ہوئے اور مقدمہ چلا۔ نواب صاحب کو چونے کی بھٹی میں زندہ جلا دیا گیا اور ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔ آج بھی ان کی روح زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ع جبر اسب کچھ میرے وطن کے لئے ہے۔

نواب ولی داد خاں

نواب صاحب مال گڑھ کے رئیس تھے۔ ان کی بھتیجی بہادر شاہ ظفر کے ایک لڑکے سے بیاہی ہوئی تھی۔ جنگ آزادی میں دلی گئے۔ شاہی دربار میں شریک ہوئے۔ بلند شہر اور علی گڑھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ ان کے مشیروں میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور سید گلزار علی شریک تھے۔ آپ نے انگریزی فوج کے مقابلے میں خوب دادِ شجاعت دی۔ مگر قسمت کے چکر نے ناکامی کا منہ دکھایا۔ نواب صاحب روپوش ہوگئے، پھر معلوم نہ ہو سکا کہ انجام کیا ہوا۔

نواب محمد ابراہیم خاں لکھنوی

نواب شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں بہادر امرائے لکھنو میں تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جب واجد علی شاہ کو تخت سے معزول کرکے کلکتہ بھیج دیا گیا اور تمام ملک انگریزوں کے خلاف ہوگیا تو برجیس قدر تخت سلطنت پر بیٹھے۔ نواب شرف الدولہ کو نیابت کا عہدہ عطا ہوا۔ انگریزی فوج سے جب برجیسی فوج کا مقابلہ ہوا تو شرف الدولہ

پیش پیش تھے۔ حضرت محل نے لکھنؤ چھوڑتے وقت ان کو بھی ساتھ لے جانا چاہا مگر نواب صاحب نے لکھنؤ سے باہر قدم نہ نکالا۔ ایک دن بازار میں نکلے تو انگریزی فوج نے گھیر لیا۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا۔ نواب صاحب نماز میں مشغول ہو گئے۔ اسی حالت میں گولی مار دی گئی۔ اور لاش کو خاکروب گڑھے میں دفنا دیا گیا

احمد خاں کھرل

سردار احمد خاں کھرل علاقہ ساہیوال (ملتان) کی قوم کے سردار تھے۔ یہ قوم جلیر ابن آباد تھی۔ سردار صاحب کو انگریزوں سے دلی عناد تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سردار صاحب نے انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مقابلے میں برکلی صاحب اسسٹنٹ کمشنر گوگیرہ قتل ہو گیا۔ انگریزوں نے ان کے ساتھیوں کو توڑ لیا اور احمد خاں کو دھوکے سے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد تمام وطن پرست منتشر ہو گئے۔ سردار صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ بعد ازاں انگریزوں نے اہل علاقہ کو خوب لوٹا اور سزائیں دیں۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

نواب صاحب ۱۸۰۶ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ جہانگیر آباد ضلع دہلی کے رئیس تھے۔ اور والدہ مرزا اسمٰعیل بیگ ہمدانی، مشہور سپہ سالار کی بیٹی اور اعتشام الدولہ محمد بیگ ہمدانی کی نواسی تھیں۔

نواب صاحب نے فارسی، عربی اور علوم متداولہ کی تعلیم میاں جی مال مالا دہلوی اور حدیث و قرأت کی تعلیم مولانا حاجی نور محمد دہلوی نقشبندی، شیخ عبداللہ سراج حنفی مکی اور شیخ محمد عابد سندھی مقیم مدینہ منورہ سے حاصل کی۔ ترغیب السالک الی احسن المسالک، تذکرہ "گلشن بے خار"، "دیوان ریختہ و فارسی اور رقعات شیفتہ ان کی علمی یادگاریں ہیں۔

جنگ آزادی کا غلغلہ بلند ہوا تو دوسرے رؤسا کی طرح آپ نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ دیگر رؤسا نے آپ کو ڈیوٹی بہادر شاہ ظفر سے خط و کتابت کرنے پر بھی لگا دی تھی۔ جسے آپ نے احسن طریقے سے انجام دیا۔ انگریزوں نے غلبہ حاصل کرنے کے بعد آپ کو سات برس کی قید سنائی۔ اور تمام جاگیر بھی ضبط ہو گئی اور بعد میں بڑی مشکل سے رہائی ملی اور نصف جاگیر واگزار ہو سکی۔

مآخذ

مشاہیر جنگ آزادی
از مفتی انتظام اللہ شہابی

۱۸۵۷ء کے مجاہد
از غلام رسول مہر

۱۸۵۷ء
از محمد شفیع

۱۸۵۷ء کے ہیرو
از سیدہ انیس فاطمہ بریلوی

نواب خان بہادر شہید
از سید مصطفیٰ علی بریلوی

جنگ آزادی کے سُنّی شعراء

(جناب اسد نظامی کے قلم سے)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جہاں علماء و مشائخ نے فرنگی تسلط کے خلاف اپنی مخلصانہ بھرپور کوششیں کیں وہیں پر شعرائے اہل سنت نے بھی عوام میں شعور آزادی کو ابھارنے میں نمایاں حصہ لیا جن کے نتیجے میں ان شعرائے اہل سنت کو زندہ دیوار میں چنوایا گیا کسی کو تختہ دار پر کھنچوایا گیا کسی کو توپ اور بندوق کی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا کسی کو حبس زندان کر دیا گیا۔ غرضیکہ اس ہولناک دور میں کوئی سنی عالم، شیخ یا شاعر ایسا نہیں تھا جو برطانوی حکام اور افواج کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہا ہو۔

برسبیل تذکرہ قارئین ترجمان اہل سنت سے مختصر الفاظ میں ان شعرائے اہل سنت کا تعارف کرایا جا رہا ہے کہ جنہوں نے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر علم سنت کو بلند رکھنے کی ہر ممکن جد و جہد کی۔

حضرت مولانا لیاقت علی صاحب الٰہ آبادی

آپ علاقہ چائل ضلع الٰہ آباد کے باشندہ تھے آپ علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فنی شاعری میں حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی فرنگی علیہ الرحمۃ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے

کے بعد درس و تدریس میں مشغول رہے پھر جب حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد دیا تو آپ نے بھی درس و تدریس کو خیرباد کہہ کر فرنگی تسلط کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔

جب آپ نے اعلان جہاد فرمایا تو الہ آباد کی فوجی رجمنٹ نے جس میں بیشتر حضرت مولانا صاحب کے مرید و معتقد تھے۔ اعلان جہاد سنتے ہی فوج سے باغی ہو کر برگشتگی اختیار کر لی اور تمام کے تمام حضرت مولانا کی خدمت میں مع اسلحہ و ہتھیار حاضر ہو کر حضرت کو اپنا میر کارواں بنا لیا۔

جب برطانوی کپتان الگزینڈر برن نے فوج میں بغاوت دیکھی تو وہ کپتان راج گھاٹ کے قلعے میں قلعہ بند ہو گیا اور اپنے حامیوں سمیت قلعہ کے اندر سے گولہ باری شروع کر دی مولانا آپ کے ساتھ قلعے کا محاصرہ کر کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے جس میں رام چند توپچی کپتان الگزینڈر برن اور اتھر جیسے برطانوی افواج کے فوجی جرنیل مارے گئے۔

حضرت مولانا لیاقت علی صاحب کی مجاہدانہ قیادت نے قلعہ فتح ہونے کے بعد الہ آباد میں جہاں جہاں بھی برطانوی فوج کے ہیڈ کوارٹر تھے ان سے مقابلہ کر کے سب کو جہنم واصل کر دیا۔ ڈاکٹر ہرل کی کوٹھی مسٹر ہڈیل کا ڈاک خانہ اور دیگر اہم مقامات کو ان مجاہدین نے تہس نہس کر دیا۔

حضرت مولانا نے بہادر شاہ ظفر کا علم بزرنگ سبز لے کر الہ آباد میں نصب کر دیا اور فرمان شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا التحیۃ والثناء نافذ کر کے شرعی قوانین کا اجرا کر دیا۔

۶ جون ۱۸۵۷ء کو برطانوی پلٹن نے الہ آباد پر حملہ کر دیا جس میں متعدد مجاہدین شہید ہو گئے ان کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈیمان بھیج دیا گیا۔ ۱۷ اپریل ۱۸۶۱ء میں آپ برطانوی صعوبتوں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔

آپ ایک بہترین سپاہی کے علاوہ ایک لازوال شاعر بھی تھے آپ کے دیوان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ نے رزمیہ اشعار و رباعیاں بھی لکھی تھیں ؎

جاتے ہیں کفن باندھ کر مقتل میں ہم علی پئیں گے ہم بھی جام شہادت بھرے ہوئے

حضرت مولانا رضی الدین صاحب بدایونی شہید رحمۃ اللہ علیہ

آپ علم و ادب میں حضرت مولانا امام بخش صہبائی شہید کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے آپ عربی فارسی کے ایک بہترین عالم و محقق تھے حضرت مولانا فیض احمد صاحب عثمانی بدایونی کے ساتھ مل کر برطانوی

سامراج کے خلاف نواب بہادر خاں کی معیت میں بدایوں کی سرزمین پر ایک آزاد حکومت قائم کر دی جس میں نواب بہادر خاں کو مجاہدین آزادی کا میر کارواں بنا کر برطانوی حکام کے خلاف اپنی جدوجہد شروع کر دی آپ کے قافلے نے برطانوی افواج پر بے شمار حملے کئے جس میں لاتعداد برطانوی سپاہیوں کو کیفر کردار تک پہنچایا گیا۔

"جب مولوی شاہ رضا علی بریلوی و مولوی امام بخش صاحب صہبائی کے رفیق مولانا رضی الدین بدایونی اور چند محب وطن اشخاص نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی تو آخر میں مولانا کو گرفتار کر لیا گیا۔"

جب مولانا صاحب کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا تو انگریزوں میں کارمیکل نے آپ کو ہر چند کہا کہ آپ بغاوت میں حصہ لینے سے انکار کر دیں تو ہم آپ کو رہا کر دیں گے مگر

جب کارمیکل کی بات سنی تو آپ نے گرج کر کہا کہ جب ہم آپ کو غاصب سمجھتے ہیں تو غاصب سے نجات پانا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ ہم آخری دم تک آپ جیسے ظالم جابر و غاصبین کے خلاف ہر ممکن جہاد کریں گے۔"

بقول صاحب تاریخ بدایوں کارمیکل نے آگے بغاوت کرنے کی پاداش میں بندوق کی گولی سے شہید کر دیا۔

"مولانا رضی الدین بدایونی بڑے مخلص مسلمان تھے مذہبی علوم و معارف سے آپ بخوبی واقف تھے حسن فکر و نظر کے ساتھ ساتھ فنون حرب و ضرب میں بھی آپ کو مہارت تام حاصل تھی۔ جہاد کو آپ فرض عین جان کر انگریزی حکام سے برسر پیکار رہے۔"

آپ نے میدان جہاد میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر میدان جہاد میں کود پڑے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

آپ ذوق شعر و سخن کے بھی بخوبی شناسا تھے۔ جب انگریزوں کے خلاف آپ نے علم جہاد بلند کیا تو آپ نے رزمیہ اشعار کہے جس سے عوام میں برطانویوں کے خلاف یک لخت لاوا ابل اور عوام برطانوی افواج کے خلاف میدان جہاد میں ان غاصبین کو تہ تیغ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

زجرم یاد اش آزادیٔ افرنگ — در قفس محبوس بود یہ چشم پُر ز آب
محنتی و صعب بیماری دلفگار — پناہ گاہم حاشیہ دست مآب

۱۴ ماہ اپریل ۱۸۵۹ء کو آپ نے شہادت کا جام حاصل کیا۔

حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب آزردہ رحمۃ اللہ علیہ

خطۂ دہلی کے ارباب فکر و سخن و حلقۂ دانش کے شہنشاہ و نیر تاباں کہ جن کی علمی صلاحیت ایک مسلمہ حقیقت تھی جن کا اعتراف غالب و مومن، نیر و تاباں جیسے لوگ کرتے تھے آپ کی قابلیت کے سبھی معترف نظر آتے وہ بزم فکر و سخن تشنۂ تکمیل ہی نظر آتی جس بزم میں حضرت قبلہ مفتی صاحب شریک نہ ہوتے۔

آپ کے سامنے غالب و مومن شیفتہ جیسے شعرا بھی ہیچ نظر آتے جب آپ اشعار بیان فرماتے تو دہلی کے شعراء، ادبا، فصحا، بلغا کہ جنہیں اپنی ادق علمی کا غرہ رہتا تھا وہ حضرات ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتے اور آپ کی پر عظمت شخصیت کے سامنے انگشت بدنداں ہو جاتے۔

جب مغلیہ خاندان کی حکومت سمٹ دہلی کے لال قلعے تک محدود ہوگئی۔ برطانوی حکام تمام ملک پر اپنی عیاری کے بل بوتے پر محیط و مسلط ہوگئے تو بزم ہائے شعراء و مجالس فکر و سخن آہستہ آہستہ سونی ہوتی چلی گئیں ارباب شعر و فن کے قدر داں نہ رہے بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا طنطنہ آخری ہچکی لے کر عدمیت کے عالم میں ڈوب گیا۔

اندریں حالات۔۔۔ بزم فکر و سخن کا انعقاد نا ممکن ہوگیا۔ علمی ادبی مجلسیں سونی ہوگئیں امتداد زمانہ نے فقدان کا تلاطم برپا کر دیا احباب منتشر ہوگئے حضرت قبلہ مفتی صاحب پر انگریزوں کی تہمت اور فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے کی پاداش میں ہر سمت سے ابتلا و آزمائش کے طوفانوں کے ریلے بہہ اٹھے چنانچہ حضرت قبلہ مفتی صاحب خود ارشاد فرماتے ہیں۔ ؎

آفت اس شہر پہ قلعے کی بدولت آئی — واں کے اعمال سے دلی پہ بھی شامت آئی
روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی — کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
گوش زد تھا جو فسانوں میں وہ آنکھوں دیکھا — جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

قبلہ مفتی صاحب اس دور کی ابن الوقتی و طوائف الملوکی پہ نوحہ کرتے ہوئے بڑے رنج و قلق کے ساتھ اظہار خیال فرماتے ہیں۔ ؎

غم بربادیٔ دہلی میں بجائے مئے ناب — خونِ دل پیتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی
زمزمے بھول گئے نغمہ طرازانِ دہلی — ہے ہر اک نوحہ گر و مرثیہ خوانِ دہلی

مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی نے حضرت مولانا امام بخش صاحب صہبائی کی شہادت پر یہ شعر پڑھا ؎

کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو — قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

پھر ارشاد فرماتے ہیں ؎

گو اسیری میں ہوں پر مثل اسیر تصویر
نہ غم قید نہ پروائے رہائی مجھ کو

بقول صاحب حدائق الحنفیہ کے

"تمام جائیداد و املاک جو تیس سال کی ملازمت میں پیدا کی ہوئی تھی سرکار میں ضبط ہو گئی بلکہ جہاد کے فتویٰ کے اشتباہ میں چند ماہ نظر بند رہے۔"

برطانوی سامراج سے رزم و بزم میں مقابلہ کرنے میں آپ کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔ بعض لوگ آپ کی شخصیت کو مجروح کرنے کی سازش کے پیش نظر آپ کے فتویٰ جہاد کو مشکوک قرار دیتے، بالخیر کو بالجبر کا الزام لگا کر آپ پر انگریز پرستی کی تہمت لگانے میں مصروف نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ؎

کور چشماں بازدو خوبند   مقبلاں را زوال نعمت وجاہ

آپ کی عمر اکاسی سال کی تھی، آپ کا وصال شریف ۲۴، ماہ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں بعارضہ فالج کے ہوا۔

حضرت مولانا امام بخش صاحب صہبائی شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

آپ کا مولد تھانیسر تھا آپ حضرت مخدوم جلال الدین صاحب تھانیسری چشتی علیہ الرحمت کی اولاد امجاد میں سے تھے آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی مولانا محمد بخش صاحب تھانیسری علیہ الرحمت تھا۔

آپ علم عربی، فارسی، اردو و علم وادب پر مکمل طور پر عبور رکھتے تھے آپ کی علمی قابلیت ایک مسلمہ امر تھی، سرسید احمد خان علی گڑھی نے آپ کی ذات گرامی کے متعلق ان الفاظ میں اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔

بریلوی مکتب فکر کے مشہور عالم دین مولانا امام بخش صاحب صہبائی جیسے محقق کا اگر ہم تذکرہ نہ کریں تو یہ سراسر بے انصافی ہوگی کہ جس نے دنیائے علوم و فنون میں اپنی عظمت و ثقافت

علوم و معارف کا سکہ بٹھا دیا۔ یہ بات صرف معاصرین
میں نہیں بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس
ہندوستان میں قیامت تک صہبائی جیسا شخص پیدا
بھی نہ ہو۔"

[حض]رت علامہ صہبائی شہید کے متعلق یہ رائے صرف سر سید احمد خاں علیگڑھی کی نہیں بلکہ [آ]پ کے تمام معاصرین ادبا فضلا نقبا، محققین علم و ادب بھی آپ کے سامنے زانوئے تلمذ [تہہ] کرنے کا شرف حاصل کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ زوال خاندانِ مغلیہ اور [بر]طانوی سلاطین کے بعد علمی و ادبی محافل روبہ زوال پذیر ہوگئیں۔ افراتفری و ابتری پھیلتی [چ]لی گئی۔

[چن]انچہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی آپ کے متعلق رقم طراز ہیں۔

"شہر دہلی میں جتنے اہل کمال اس وقت جمع تھے ان میں فارسی
دانی اور علم و بلاغت میں کوئی شخص صہبائی سے بڑھا ہوا
نہ تھا۔ غالب و ذوق، آزردہ، منیر، شیفتہ، مومن،
سب ادبائے عصر کو صہبائی کی فضیلت علمی کا اعتراف تھا۔"

[عل]م و ادب کی محفلوں میں گو آج کل غالب کی علمیت کا چرچا ہے مگر افسوس ہے کہ غالب کے [م]داحین غالب کا تذکرہ کرتے وقت حضرت علامہ صہبائی جیسی شخصیت کو یکسر فراموش کر [جا]تے ہیں حالانکہ غالب جیسا شخص حضرت صہبائی کا علمی فقاہت کا نہ صرف معترف ہے [بل]کہ اپنے آپ کو ایک مقام پر شاگرد تصور کرتا ہے

"میں حضرت علامہ امام بخش صاحب صہبائی کی عظمت
و علمی فقاہت کا نہ صرف معترف ہوں بلکہ علوم و معارف
میں علامہ کا شاگرد بھی ہوں۔"

[غا]لب کے اعتراف سے بھی یہ بات مترشح ہے کہ علم و فضل میں علامہ صہبائی جیسا علم و فضل [کا] بحر ذخار کم از کم آپ کے معاصرین میں تو نہ تھا۔

حضرت علامہ صہبائی کی شہادت

جب حضرت علامہ نے انگریزی سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اپنے علم و

ادب کی روشنی میں لوگوں میں شعور آزادی کا جذبہ ابھارنے کی مساعی جیلہ شروع کی تو برطانویوں نے آپ کی آزادی کا نعرہ ناپسندیدہ قرار دیا اور آپ کو گرفتار کر کے مسجد پر شہید کر دیا۔

بقول شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی کے

"جب دہلی میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو صہبائی خانہ نشین ہو کر بیٹھ گئے مگر زیادہ دیر تک کنج عزلت اور گوشۂ عافیت ان کو پناہ نہ دے سکا اور ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پانچ ماہ کے محاصرہ کے بعد انگریزوں نے دہلی فتح کر لی جس کے بعد انگریزی فوج نے دہلی کے مظلوم اور بے کس باشندوں پر وہ ظلم توڑے جن کی انتہا نہیں۔

مولانا صہبائی ایک دن محلہ کی مسجد میں نماز فجر ادا کر رہے تھے کہ گورے مسجد میں گھس آئے اور سارے نمازیوں کے ساتھ ان کو اور ان کے دو بیٹوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ چلتے چلتے محلہ کے چودہ سو آدمی پکڑے اور سب کو جمنا کے کنارے گولی مار دی۔"

(حضرت علامہ کی شاعری)

جیسا کہ گذشتہ سطور میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت علامہ کی علمی قابلیت سے آپ کے تمام معاصرین نہ صرف معترف تھے بلکہ بعض تو خود کو علامہ صہبائی کا شاگرد و تلامذہ قرار دینے میں فخر و انبساط محسوس کرتے تھے۔ حضرت علامہ کی رزمیہ شاعری کا صرف ایک شعر ہمیں مل سکا ہے ؎

جاتے ہیں سوز عشق لئے یوں کفن میں ہم   دامن سے ڈھک کے جیسے کوئی لے چلے چراغ

حضرت علامہ صہبائی کی شہادت پر حضرت علامہ مولانا شاہ رضا خاں صاحب بریلوی علیہ الرحمت نے چند شعر کہے وہ یہ ہیں ؎

ندانم کجا رفت آں نقش پاک   فلک بُرد یا ماند بہ روئے خاک

ندانم کسے داد اودا کفن ۔ دیا ماند چوں سایہ بر خاک تن
ندانم چہ کرد است با او سپہر ۔ زجامہ کفن کر دیا تاب مہر
نجاکش نمودند اور انہاں ۔ دیا مہ تفخ شد سوئے آسماں
کسے فاتحہ ہم بروخواندہ است ۔ بہ عشر گلابی برافشاندہ است

کداے گل و بلبل دبا دوشت
نجاکش بہ حسن عقیدت گذشت

حضرت مولٰنا اعجاز حسین صاحب سوز شہید رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت مولنا اعجاز حسین صاحب سوز شہید حضرت علامہ امام بخش صاحب صہبائی شہید علیہ الرحمت کے خواہر زادہ تھے آپ نے تعلیم و تربیت اپنے ماموں علامہ صہبائی کی زیر نگرانی حاصل کی جب برطانوی حکام غداروں کی غداری، سازشیوں کی سازشوں کی بدولت برصغیر پاک و ہند پر مسلط ہونے میں کامیاب ہوگئے تو وہ شخصیتیں جو برطانوی تسلط کے خلاف برسرپیکار رہیں اور انگریزوں نے منتقمانہ کارروائیاں شروع کر دیں تو انگریزی نوک تلوار سے کوئی بھی ایسا شخص محفوظ نہ رہ سکا جو انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہا ہو۔ جب مسجد میں حضرت صہبائی شہید صبح کی نماز ادا فرما رہے تھے تو انگریزوں نے حضرت علامہ صہبائی کے ساتھ آپ کے بھانجے کو بھی دریائے جمنا کے ساحل پر لے جا کر شہید کر کے نعشیں دریا میں بہا دیں حضرت مولنا سوز شہید کے یہ اشعار رزمیہ ماہنامہ طریقت دہلی نے نقل کئے ہیں ؎

اے سوز مقصد زیست تست ۔ جان دہ در راہ حق برسر پیکار تو
رضائے رسول طلب کن تو مدام ۔ سوز تو بر شمع حق کن زندگی ایثار تو

حضرت منشی محمد اسماعیل صاحب منیر شکوہ آبادی علیہ الرحمتہ

جناب منشی محمد اسماعیل صاحب منیرؔ ان شعرائے مجاہدین میں سے تھے جنہوں نے دنیائے فرنگیت کے خلاف شعرائے اہل سنت کو جمع کر کے فرنگی تسلط کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا آپ حضرت مولنا فضل حق خیر آبادی کے ممتاز تلامذہ اور حضرت مخدوم شاہ رضا

علی صاحب مجاہد کبیر بریلوی علیہ الرحمت کے عقیدت مندوں میں سے تھے آپ کو برطانوی سامراج کے خلاف جدو جہد کرنے میں گہرا شغف رہا۔

آپ کے جد اعلیٰ جناب سید بہاؤ الدین بلخی بزمانۂ سلطان علاؤ الدین غوری شکوہ آباد میں تشریف فرما ہوئے اور جناب سید صاحب کے پوتے کے پڑپوتے جناب سید شرف الدین علی خاں کو شکوہ آباد، فیروز آباد کی صوبہ داری" بجانب سلطان محمد شاہ " عطا ہوئی۔"

آپ کا ذوق شاعری

سرزمین شکوہ آباد سے آپ دہلی میں تشریف لے گئے غالب و مومن اسیر و ریختہ کی محفلیں دیکھیں مگر آپ مطمئن نہ ہوئے کچھ عرصے کے بعد جب حضرت علامہ فضل حق صاحب خیرآبادی علیہ الرحمت خیر آباد سے دہلی میں تشریف فرما ہوئے تو آپ نے مولانا کی شاگردی اختیار کر لی۔ اس کے بعد دہلی میں کوئی ایسی محفل شعر و ادب نہ ہوتی تھی جس میں منیر صاحب کو شامل نہ کیا گیا ہو۔

> "منشی محمد اسماعیل صاحب منیر شکوہ آبادی مرحوم مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ غالب، صہبائی، آزردہ، اشک، بھی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے فن شاعری میں آپ کا بہت بلند مقام تھا۔"

سنی طبقہ کے علماء و مشائخ نے آپ کا بے حد احترام کیا حضرت مخدوم شاہ احمد سعید صاحب مجددی حضرت خواجہ نظام الدین صاحب اورنگ آبادی چشتی نظامی حضرت مولنا سید محمد قاسم شاہ صاحب داناپوری حضرت مولانا غلام امام شہید، حضرت مولنا مفتی کفایت علی صاحب کافی مرادآبادی جیسی شخصیتوں نے بھی آپ کی خدمات کو بے حد سراہا۔ جب حکومت مغلیہ کا آفتاب سلطنت غروب ہوا تو جہاں شعرائے اہل سنت نے برطانوی اسٹیٹ انڈیا کے خلاف متحدہ طور پر ایک زبردست محاذ بنایا پورے برصغیر میں فرنگی تسلط کے خلاف لوگوں کے جمود خون میں ولولہ جرأت ہمت پیدا کرنے کی ہر چند مساعی جمیلہ کیں وہیں پر حضرت منیر شکوہ آبادی کی خدمات جلیلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(باندہ کی فتح پر منیر کا اظہار تحسین)

شہر باندہ پر جون ۱۸۵۷ء کے آخری عشرے میں برطانوی افواج نے چند غداروں کی سازش سے

باندہ پر قبضہ کر لیا جس میں بے شمار مجاہدین آزادی جام شہادت نوش کر گئے مگر بعض مجاہدین اسی فرنگی بلوے سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے جس میں باندہ کے وزیر اعظم جناب مرزا ولایت حسین خان بھی شامل تھے باندہ سے نکل کر شکوہ آباد میں پہنچے رات کو جناب منیر کے ہاں قیام کیا۔ اس قیام کے دوران ایک فوجی دستہ تیار کیا جس میں شکوہ آباد و فیروز آباد سے اسلحہ جمع کیا گیا ان مجاہدین کو اسی موصولہ اسلحہ سے لیس کر کے راج گڑھ پر حملہ کر دیا جس میں سپاہی بد حواس ہو کر مقابلہ کئے بغیر فرار ہو گئے۔ پھر اس کے بعد باندہ پر حملہ کر دیا تو باندہ بھی فتح ہو گیا۔ جس میں اسلامی بقاء و استحکام کی خاطر ایک لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ جناب منیر صاحب نے باندہ کی فتح پر یہ تاریخی قطعہ تحریر فرمایا۔ ؎

چو فوج ہندیہ بباندا رسید ۔۔۔ زحصن اجے سنگھ برائے فساد
پریشان ظفر یافت نواب ما ۔۔۔ دل اہل انصاف گردید شاد
چنیں گفت تاریخ نصرت منیر
خدا فتح عالی بہ نواب داد
۱۲۷۴ھ

(منیر قید فرنگ میں)

برصغیر پاک و ہند پر بزور مکاری و سازش برطانیوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد ان مجاہدین آزادی میں سے کسی کو تختہ دار پر کھینچوایا کسی کو دریائے جمنا پر شہید کر کے ان کی نعشوں کو طغیانیوں کے سپرد کر دیا کسی کو سزا کے طور پر جزیرہ انڈیمان بھیج دیا باقی ماندہ مجاہدین کا عرصہ حیات کا قافیہ تنگ کر دیا غرضیکہ کوئی شخص بھی ان کے نشانہ جور و استبداد سے نہ بچ سکا۔ ان مجاہدین شعرائے اہل سنت میں جناب منیر بھی تھے کہ جن پر برطانوی حکام نے بے تحاشہ ظلم و ستم کو روا رکھا جن کا تذکرہ خود منشی صاحب اپنی کلیات منیر میں فرماتے ہیں۔ اور آپ کو پاداش آزادی برصغیر پاک و ہند کے جزیرہ انڈیمان میں سزا کے طور پر بھیج دیا گیا۔ آپ کے استاد مکرم مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی جو یہاں پہلے سے جیل کی قید و بند کاٹ رہے تھے جب منشی صاحب نے حضرت مولانا صاحب کی یہ کیفیت دیکھی تو خون کے آنسو روتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ ؎

اشک زلیخا ہوئی سب صفت جوش زن ۔۔۔ غرق ہوا نیل میں یوسف گل پیرہن
مخزن فضل و کمال، عالم عالی مقام ۔۔۔ ناقد تازی زبان فیض شناس سخن

مولوئ بے نظیر فضل حق اسم شریف! دہلی سے تا لکھنؤ، مشتہر و مؤتمن

جناب منشی صاحب سے بھی مشقت کرائی گئی اور دریں اثنا مولانا فضل حق صاحب کا انتقال ہوگیا جب یہ خبر منشی صاحب کو ہوئی تو انگریزوں کے خلاف اپنا اظہار رنج و قلق کرتے ہوئے بصد افسوس کہتے ہیں۔ ؎

قید میں، میں اور وہ رہتے تھے ایک ہی جگہ عین سمندر میں غرقۂ بحر محن
نصف قصیدہ کیا ہے سامنے ان کے رقم ختم ہوا جب، تھے وہ ہمدم گور و کفن

منیر شکوہ آبادی کی رہائی

جب آپ کی سزا کی مدت پوری ہو چکی تو پھر آپ کو واپس وطن بھیج دیا گیا۔ تاریخ رہائی ۲۸، محرم الحرام سنہ ۱۲۸۲ھ ہے۔

آپ کا وصال

آپ کی رحلت سنہ ۱۲۹۷ھ میں ہوئی اور رام پور کے قدیم گورستان میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

حضرت مولانا فضل احمد صاحب اسیرؔ دہلوی علیہ الرحمۃ

آپ کو علم شاعری میں حضرت مخدوم مولانا مفتی سید کفایت علی کافیؔ شہید سے شرف تلمذ حاصل تھا آپ کو تمام معاصرین پر فوقیت حاصل تھی جب تحریک آزادی کی ابتدا ہوئی تو آپ نے حسب الامر محترم استاد کافی علیہ الرحمۃ دہلی میں حافظ رحمت خان روہیلہ، مولانا فضل حق خیرآبادی، اور دوسرے زعمائے اہلسنت کا ساتھ دیا۔

"جب[۱۲] میجر جنرل ہڈسن نے مرزا الٰہی بخش کی مخبری سے بہادر شاہ ظفر اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کیا تو آپ کو بھی ان کے ساتھ پابند سلاسل کر دیا گیا۔"

پھر دہلی سے باہر لے جا کر آپ کو گولیوں کی بوچھاڑ سے شہید کر دیا گیا، جب آپکو گرفتار کیا گیا تو آپ نے یہ شعر پڑھے ؎

رزم گاہ میں جا کر قربان ہوں کے اسیر
مقصد قلبی ہوگا حق جمیں بھی مدام
یہ خوشی حاصل ہے کہ ہم ہوں گے شہید
جان دیں گے ہم رسول اللہ کی آن پر

جناب میر حسین تسکین دہلوی علیہ الرحمتہ

آپ کا خاندان حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین سلطان نور بخش دہلوی چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربار مقدس پر جاروب کشی کرتا چلا آرہا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہولناک دور آپہنچا۔ نتیجۃً آپ پر بھی بے حد اثر پڑا۔ آپ نے بالواسطہ اور بلاواسطہ حصہ لیا۔

جب علامہ مولانا فضل حق خیرآبادی کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈیمان بھیجنے کی سازش کی جا رہی تھی تو آپ کو اس سازش کا علم ہوا تو آپ دربار شریف سے اٹھ کر دہلی کے قید خانے کے دروازے پر آئے تو وہاں پر میجر جنرل ہڈسن موجود تھا اس میجر پر آپ نے تلوار سے حملہ کر دیا جس میں ہڈسن زخمی ہوگیا بڑی مشکل سے آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر اس کے باوجود بھی چھ برطانوی فوجی مارے گئے۔ ایک ہفتے کے بعد آپ کو جیل خانے ہی میں شہید کر دیا گیا ۱۲۶۸ھ سن شہادت

حضرت محمد یعقوب علی آبادی چشتی شہید

آپ دہلی کے کوچہ چیلاں میں سکونت رکھتے تھے جب غالب، شفیتہ و آزردہ، صہبائی کی محفلیں سجتیں تو خصوصی طور پر آپ کو بھی مدعو کیا جاتا تھا ۱۸۵۷ء کا ہولناک دور شروع ہوا تو آپ کو بھی انگریزوں نے گرفتار کر کے شہر سے باہر کسی درخت پر لٹکا دیا آپ ان ظالموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہوگئے۔ آپ علم و ادب کے شاعر کا درجہ رکھتے تھے آپ نے بھی برطانوی تسلط کے خلاف چند اشعار کہے ہیں۔

آبادؔ وقت آ چلا ہے تجھے جان دینے کا
اس جہاں سے چل بسو کے کوچہ میں جوانمرد

میں گدائے کوچۂ قطب و نظام الدین ہوں　　　اسی کے نام پر سر داسی کا سدا رہم بھرو

سید برہان الدین آثی دہلوی شہید

آپ حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی فرنگی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے حضرت علامہ بھی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے کیونکہ آپ سید زادہ تھے اور حضرت علامہ فاروقی النسب تھے۔ بقول تذکرہ شعرائے دہلی کے آپ فن شعر میں قادر الکلام تھے جیسا کہ مؤلف کتاب مذکور نے اعتراف کیا ہے۔

"آپ تمام شعرائے دہلی کے سرگروہ فن و سخن کے علاوہ تاریخ گوئی و شمشیر شناسی میں بے پناہ دستگاہ تھے۔"

آپ برطانوی تسلط سے بے حد پریشان تھے جیسا کہ آپ نے برطانوی حکام کی چیرہ دستیوں کا تذکرہ اپنے ان اشعار میں کیا ہے۔

میں وہ بلبل جو صیاد کے گھر پیدا ہو　　　جہاں میں آنکھ جب کھولی قفس کا آشیاں تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہیں جز خار گلشن میں　　　بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا
فرنگیوں نے سب لوٹ لی متاع میری　　　نہ آزادی قفس رہی

آپ کو حق گوئی کی پاداش میں میجر جنرل ہڈسن نے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے ۱۷ ماہ اپریل ۱۸۵۸ء کو شہید کر دیا۔

جناب رفیع الدین خاں رضوی لکھنوی شہید علیہ الرحمتہ

آپ مولانا امام بخش صہبائی شہید کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے آپ کا خاندان دہلی میں مدتوں سے آباد تھا آپ نے علوم و فنون مراد آباد و لکھنؤ سے حاصل کئے بلند پایہ کے ادیب و شاعر تھے حضرت مولانا مفتی کفایت علی صاحب کافی کے ساتھ مل کر تحریک آزادی کے اندر بھرپور حصہ لیا تحریک آزادی کے مجاہدین میں شامل ہو کر اپنی رزمیہ شاعری سے لوگوں میں حریت پسندی کی جرأت پیدا کرنے کی مساعی جملہ فرمائی اسی کی پاداش میں آپ کو گرفتار کر کے دہلی سے لا کر مراد آباد کے چوک حسن خاں میں گولیوں کی بوچھاڑ کر کے شہید کر دیا گیا۔ تاریخ شہادت ۵ اپریل ۱۸۵۸ء آپ کے یہ اشعار صاحب تاریخ مراد آباد نے نقل کئے ہیں ۔

ناتوانوں کے ستانے سے حذر کر ظالم　　　دشت بھی آہ سے مظلوم کی جل جاتا ہے۔

کب تک تم غدر کروگے ظالم
ایک ہم ہیں کہ حد سے گذر جائیں گے
ظالم فرنگیو یہ سب ہمارا ہے
نکل جاؤ یہاں سے تم کیوں پیر پسارا ہے

جناب مرزا محمد جان صاحب بیگ کشمیری علیہ الرحمتہ

آپ کا خاندان دشت قپچاق سے کشمیر میں وارد ہوا آپ نے کشمیر سے دہلی میں حضرت خواجہ میر درد دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا پھر واپس کشمیر جاکر انگریزوں کے خلاف تحریک شروع کی نتیجۃً میجر جنرل ہڈسن نے آپ کو گرفتار کیا اور دریائے توی کے ساحل پر شہید کر کے نعش کے ٹکڑے کر کے دریائے توی میں بہادیئے۔ (۱۷ اپریل ۱۸۵۹ء کو آپ کی شہادت ہوئی)

جب آپ کو پابند سلاسل کیا گیا تو آپ نے اپنے ایک دوست کو دو شعر لکھ کر ارسال کئے ؎

ہم گھر میں تمہارے کہو کس راہ سے پہنچیں
دشمن ہیں ہمارے فرنگی جیسے در و دیوار ہیں جیسے
مرغانِ قفس ان کو پھڑکتے ہیں دیکھیں
دن رات تڑپتے ہیں

جناب عبداللہ خاں ہمدم شہید علیہ الرحمتہ

آپ بریلی شریف کے باشندہ تھے آپ نے جملہ علوم و معارف حضرت مخدوم شاہ رضا علی صاحب بریلوی علیہ الرحمت سے حاصل کئے آپ کو حضرت مولانا غلام امام شہید علیہ الرحمت سے شرف تلمذ حاصل تھا جب تحریک آزادی شروع ہوئی تو آپ نے بھی مولانا پیر علی صاحب پٹنوی شہید کے ساتھ مل کر برطانوی فوج کے خلاف نفرت پھیلانے میں نمایاں حصہ لیا آپ نے مجاہدین کی بے حد امداد کی مگر برطانیہ پرستوں کی مخبری کرنے کی بنا پر گرفتار کر لئے گئے۔ قید و بند کی حالت میں یہ رباعی لکھی ؎

ہیں تو گرفتار جب کچھ رسم مجھے یاد نہیں
اس لئے لب پہ مرے نالہ و فریاد نہیں
کس کو حال دل غمگیں میں سناؤں
قیس صحرا میں نہیں کوہ میں فرہاد نہیں

آپ کو فتح بریلی کے بعد شہید کر دیا گیا۔ تاریخ شہادت ۱۷ جون ہے (سن معلوم نہ ہو سکا)

حضرت امیر احمد صاحب مینائی علیہ الرحمتہ

آپ علم شاعری و فن ادب کے مشہور شاہکار اور بالخصوص تحریک آزادی کے علمبردار تھے آپ نے علم و

ادب میں اپنا ایک بہترین مقام پیدا کیا بیشتر محقق و شاعر و ادیب آپ کے کارناموں سے بخوبی واقف ہیں آپ لکھنؤ کے باشندہ تھے فن شاعری میں آپ نے جناب امیر الدولہ منشی مظفر علی خان کی شاگردی اختیار کی عقائد سنیہ کے زبردست مؤید و موثق تھے آپ کی خداداد قابلیت کا شہرہ بڑھا رامپور کے نواب کلب علی خان نے بھی آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا آپ نے تحریک آزادی کے اندر حصہ لیا بعض لوگوں نے آپ کو خریدنا چاہا تو آپ نے انہیں صاف طور پر جواب دیدیا۔

۱۸۵۷ء آپ بالواسطہ اور بلا واسطہ انگریزوں کے خلاف اپنی بھرپور جد وجہد کرتے رہے۔" جن کی پاداش میں آپ کو پابند سلاسل کر دیا گیا آپ نے جیل میں یہ دو شعر لکھے۔

اللہ رے انقلاب جہاں پلید کا — خون حسین غازہ ہے روئے عید کا
مقفل ہے کم نہیں قلمدان میرا امیر — ہر کلک ہے گلوئے بریدہ شہید کا

صیاد فرنگی میرے مارنے پہ تلا ہے

آپ پر مختلف صعوبتوں کا پہاڑ ڈھایا گیا بالآخر جب انگریزوں نے دیکھا کہ اب امیر مینائی میں تاب جور و ستم باقی نہیں رہی تو انہوں نے آپ کو رہا کر دیا۔

رہائی کے بعد بھی آپ کی صحت اچھی نہ رہی بلکہ نقاہت و بیماری کا عالم روز بروز بڑھتا چلا گیا آپ کی وفات سنہ ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔

حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب رضا بریلوی علیہ الرحمۃ

بریلی شریف کی مشہور شخصیت کہ جو فرنگی تسلط کے خلاف بے سر و سامانی کے باوجود بھی "برسرپیکار رہا" جن کی کاوشیں اسلامی خدمات دینی ترویج کے لئے وقف رہیں جن کی مجاہدانہ یلغار سے باطل بید لرزاں کی طرح کانپتا و ہانپتا رہا۔

آپ نہ صرف علوم و فنون کے معتبر عالم دین تھے بلکہ میدان غنیجہ گاہ میں تلوار کے دھنی بھی تھے۔ جب بریلی شریف میں برطانوی سامراج کے تسلط کی غوغا آرائی ہوئی تو آپ نے بھی نہ صرف فتویٰ جہاد کی تائید و توثیق فرمائی بلکہ آپ نے بریلی کی سنی مساجد میں برطانوی سامراج کے مذموم عزائم سے بھی خبردار کیا۔

۱۸۵۷ء آپ کو علم و ادب سے بھی بے حد ذوق تھا آپ فن شاعری میں حضرت مولنا مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگردوں میں سے تھے۔

حضرت مولانا صاحب کا ذوق ادبی انتہائی عروج پر تھا چنانچہ آپ نے ہزاروں کی تعداد میں ادبی، دینی اشعار میں ارشاد فرمائے ہیں۔

آہ ہم پر ہوا مسلط و یاں فرنگیاں ہمیں ہے مالک اور ہمیں آنکھیں دکھائی جاتی ہیں
ہم کریں گے کب برداشت تسلط ان کا

حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب مجاہد کبیر ایک اور مقام پر فارسی زبان کی رباعی ارشاد فرماتے ہیں ؎

عجب افتاد بر ہندوستان بود تسلط فرنگیاں بر مسلماں بود
رضا چگونہ رنج و قلق نیفتاد قضائے مہربان بر مسلمان بود

فرنگی تسلط کے خلاف آپ مسلسل اپنی جدوجہد کرتے رہے آپ فنون حرب سے مہارت تامہ رکھتے تھے آپ کا وصال شریف ۲ جمادی الاول شریف ۱۲۸۲ھ کو ہوا۔

آپ کی رحلت کے بعد آپ کے فرزند ارجمند حضرت مخدوم العلماء والصلحاء مولانا شاہ نقی علی خان صاحب اور آپ کے پوتے اعلحضرت مجدد مائتہ حاضرہ مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب بریلوی قدس سرہ اہم قابل ذکر ہیں۔

جناب نورالدین محمد خاں انور شہید علیہ الرحمتہ

آپ نواب بدرالاسلام خان بہادر کے نبیرہ اور نواب والا جاہ کے دربار سے منسلک تھے آپ علوم شاعری میں جناب مفتی صدرالدین آزردہ جناب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے شاگردوں میں سے تھے آپ گوپاموکے باشندہ تھے آپ نے برطانوی تسلط کے خلاف حصہ لیا جن کی پاداش میں، آپ کے گھر پر گورپٹنوں نے رات کی تاریکی میں حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ آپ کا یہ شعر صاحب تذکرہ خیرآباد نے نقل کیا ہے ؎

کر رود بر باد سوز نالہائے عندلیب گل گریباں چاک آمدانہ بوئے عندلیب

آپ کی تاریخ شہادت ۷ ماہ صفر المظفر ۱۲۷۳ھ ہے آپ کو گوپاموکے گورستان میں سپرد خاک کر دیا گیا

جناب سید منور علی صاحب شہید علیہ الرحمتہ آشفتہ شاہجہان آبادی

آپ علم شاعری میں مفتی صدرالدین آزردہ علیہ الرحمتہ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، شاہجہان آباد

دہلی کے باشندہ تھے جب جنگِ آزادی کا دور شروع ہوا تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے اور باقاعدگی کے ساتھ حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی جیسے مجاہدین اسلام کے ساتھ شریک ہو کر عوام کو برطانوی تسلط کے خلاف ابھارنے اور بے حد اکسانے پر انہوں نے آپ کو مامور کر لیا۔

"جب لارڈ ہیسٹنگ کو آپ کے متعلق یہ خبر ملی کہ سید صاحب علمائے حق اہل سنت و جماعت کے ساتھ ملکر انگریزوں کے خلاف سازش کرنے میں ملوث ہیں تو انگریزوں نے اپنا ایک مخبر بھیج کر آپ کو مسجد میں ہی جاکر شہید کر دیا۔"

آپ کا یہ شعر بہت زیادہ مقبول و مشہور ہے ؎

نہ قتل کا خیال ہمیں اور نہ موت سے ہے ڈر — قسمت میں لکھا ہو میرے جام شہادت

۱۴ ماہ جمادی الاول ۱۲۷۴ھ میں آپ کی شہادت ہوئی۔

جناب حافظ عبدالرحمٰن صاحب احسان دہلوی شہید

آپ کو اپنے عہد طفلی ہی میں علم فنون شاعری سے بے حد ذوق تھا اسی ذوق کے پیش نظر آپ حضرت مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی علیہ الرحمت کی خدمت میں حاضر ہو کر تسکین تشنگی حاصل کرتے رہے مرزا ایزد بخش اور شاہ عالم ثانی سے بھی آپ کے گہرے تعلقات تھے جب۔

مرزا الٰہی بخش جیسے سازشی غداروں کی بدولت میجر جنرل ہڈسن دہلی میں داخل ہوا تو دہلی کی سرزمین پر سب سے پہلا جو اس جنرل ہڈسن کی بندوق کی گولی کا نشانہ بنا وہ حافظ عبدالرحمٰن احسان دہلوی علیہ الرحمت تھا" آپ کا یہ شعر جسے ایک مورخ نے نقل کیا وہ یہ ہے۔ ؎

یہ ستانے سے تجھ کو ہے حاصل ظالم
تجھے موذی کہے خلقت، مجھے ایذا پہنچے

تاریخ شہادت:

۲۱، ماہ ربیع الاول شریف ۱۲۷۳ھ ہے

حضرت مولانا مفتی سید کفایت علی صاحب کافی شہید علیہ الرحمت

خطہ مراد آباد سے حضرت مولانا مفتی سید کفایت علی صاحب کافی شہید جیسی شخصیت نے برطانوی استعمار کے خلاف مجاہدین آزادی کی حتے الامکان مساعی جمیلہ کی۔

بہادر شاہ ظفر آپ کی علمی و حربی صلاحیتوں کا معترف تھا بہادر شاہ ظفر کے علاوہ جنرل بخت خاں اور دوسرے زعمائے مجاہدین حضرات بھی برطانوی استعمار کے خلاف مفید مشورے اور تجاویز آپ سے حاصل کرتے۔

آپ کو برطانوی افواج نے تحریک آزادی کے اندر حصہ لینے کی پاداش میں مرادآباد سے ۲۰ رمضان المبارک ۱۲۷۴ھ میں حسن پور سے گرفتار کیا اور ۲۷ ماہ رمضان المبارک ۱۲۷۴ھ بروز جمعرات بوقت عصر روزہ کی حالت میں برسر عام تختہ دار پر لٹکا دیا۔

جب آپ کا سر دار پر چڑھایا جا رہا تھا تو اس وقت آپ کی زبان مبارک پر یہ نعتیہ اشعار تھے۔

کوئی گل باقی رہے گا نہ چمن رہ جائیگا	پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا
ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا	بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا
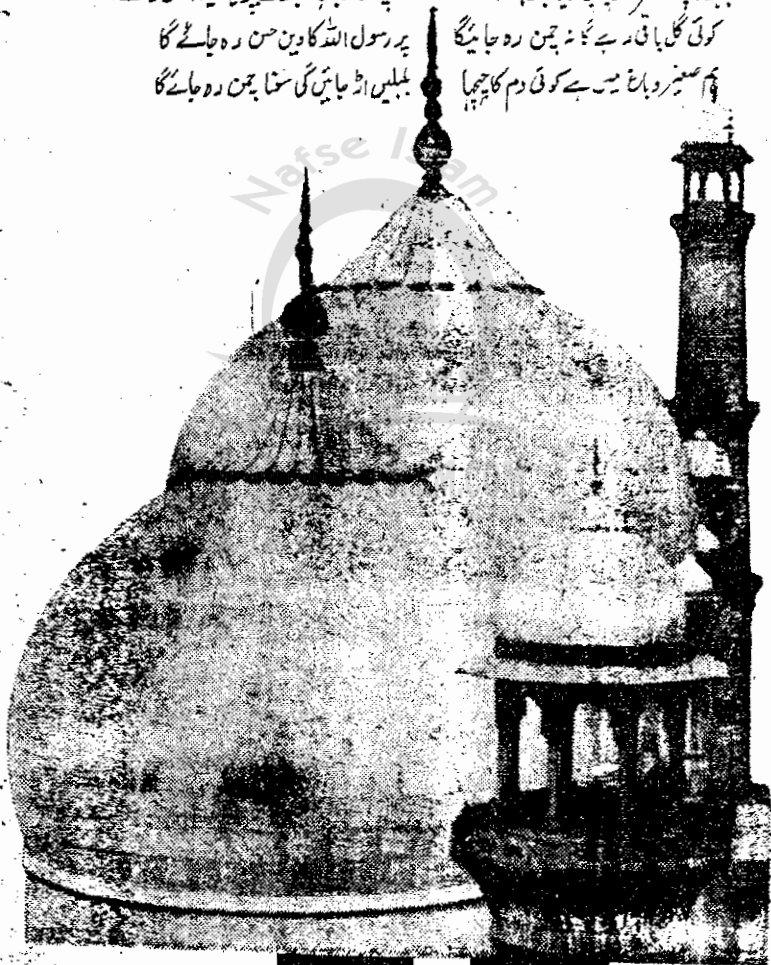
از:- مولانا لیاقت علی الٰہ آبادی

(مرتبہ:- سعیدہ بانو)

جنگ آزادی کے سلسلے میں یہ جہادیہ نظم پیش کی جاتی ہے۔ ان اشعار میں آپ فنی خوبیاں نہ تلاش کیجئے، بلکہ کہنے والے کے جذبہ کو دیکھئے کیونکہ ان کے کہنے والے پرجوش سپاہی تھے شاعر نہ تھے۔ یہ مولانا لیاقت الٰہ آبادی کی ہے جو الٰہ آباد میں مدرس اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے پرجوش مبلغ تھے۔ تاریخ محاربہ عظیم کا مؤلف کنہیا لال لکھتا ہے کہ موصوف الٰہ آباد میں جگہ جگہ وعظ کرتے پھرتے تھے۔ اور انہوں نے وہاں کے باشندوں میں انگریزی حکومت کے خلاف انتہائی جوش پیدا کر دیا تھا۔ یہ نظم صرف سنائی ہی نہیں جاتی تھی بلکہ جگہ جگہ دیواروں پر چسپاں بھی کر دی گئی تھی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اسے کھڑے ہو کر پڑھتے اور "دین۔ دین" کے نعرے لگاتے ہوئے آزادی کی راہ میں لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ اس جہادیہ میں قرآن و حدیث کے ذریعہ جہاد کی تلقین کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ "اب وقت آگیا ہے کہ ہماری بات سنو اور تلوار کو بڑھ کر اٹھا لو" بہرحال یہ جہادیہ ملاحظہ ہو:

بعد تحمید خدا نعت رسول اکرم — یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم
واسطے دین کے لڑنا نہ پئے ضبط بلاد — اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن۔ احادیث میں خوبی جہاد — ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کر لو یاد
فرض ہے تم پہ مسلمانو جہاد کفار — اس کا ساماں کرو جلد اگر ہو دیندار
جو مسلمان رہ حق میں لڑا لحظہ بھر — روضۂ خلد بریں ہو گیا واجب اس پر

اے برادر تو حدیث نبوی کو سن لے
باغ فردوس ہے تلوار کے سائے کے تلے

دل سے اس راہ میں پیسہ کوئی دیویگا اگر
سات سو اس کو خدا دیوے گا روز محشر

زر بھی گر خرچ کیا اور لگائی تلوار
پھر تو دیوے گا خدا اس کے عوض سات ہزار

جو کہ مال اپنے سے غازی کو بنادے اسباب
اس کو بھی مثل مجاہد کے خدا دیگا ثواب

جو نہ جائے خود لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا بیشتر از مرگ وبال

جو رہِ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں

مدت العمر کے مٹتے ہیں گناہِ شہدا
کیوں نہ ہر جنگ میں کٹواتے ہیں سر بہر خدا

فتنہ جز دغم صور و قیام محشر
ایسے صدموں سے شہیدوں کو نہیں ہے کچھ ڈر

حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثل دیوار جو سر باندھ کے جم جاتے ہیں

اے مسلمانو سنی تم نے جو خوبیٔ جہاد
چلو اب ان کی طرف مت کرو گھر بھر کو یاد

مال و اولاد کی اور گھر کی محبت چھوڑ دو
راہِ مولا میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو

گر رہے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے
اور گئے مارے تو جنت کو چلے جاؤ گے

دین اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے

زورِ شمشیر سے غالب رہا اسلام مدام
سستی اگلے جو کبھی کرتے تو ہوتا گمنام

کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹکاؤ گے
اپنی سستی کا جو افسوس نہ پھل پاؤ گے

اب تو غیرت کرو نامردی کو چھوڑو یارو
لو چل چل کے امام اپنے کے کافر مارو

بارہ سو برس کے بعد آئی یہ دولت آگے
حیف اس دولتِ بیدار سے مومن بھاگے

یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار
سب دیا تو نے ہمیں اور کیا پھر سردار

بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو تم یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ کر مارو

مولوی وہاج الدین مراد آبادی
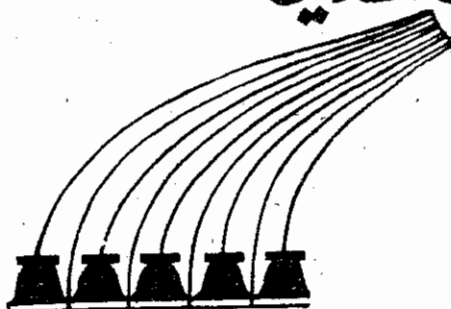
(عزیز احمد قادری چشتی)

شہید ملت، فدائے قوم مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو رحمۃ اللہ علیہ۔ خلف مولوی جمیل الدین ابن مولوی وجیہ الدین ابن مفتی شیر محمد مراد آباد کے ممتاز با اثر قوم پرور اور جلیل القدر رئیس تھے۔ نہایت ہی فیاض، سیر چشم اور مہمان نواز تھے ان کا دستر خوان فراخ، مذہب کے معاملے میں آہنی ستون، عبادت گزار، بے مثل شجاع اخلاق کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ ہر اعلیٰ وادنیٰ کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے سب سے یکساں ملتے جلتے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے۔ ضرورت مندوں اور غرباء کی دل کھول کر امداد کرتے اور ان کی تقریبوں اور محفلوں میں بغیر کسی بلندی و پستی کے فرق کے شریک رہتے۔ مختصر یہ کہ بہت بڑے جتھے بند اور مقتدر رئیس ابن رئیس تھے۔ لندن سرکار سے خصوصی اعزاز بھی ملا ہوا تھا۔ شہر کے حکام نہایت احترام کرتے تھے اور ان سے ملنا باعث فخر و ناز سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب کو عربی فارسی اور اردو علوم کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے انگریزی زبان اپنے حقیقی چچا مولانا محمد اسماعیل لندنی کی بیوی سے جو ایک یورپین مہذب خاندان سے تعلق رکھنے والی لیڈی تھیں، پڑھی تھی۔

مولانا محمد اسمٰعیل لندنی قریب قریب ہر زبان کے عالم تھے۔ ان کے باپ مولوی وجیہ الدین اور دادا مفتی شیر محمد عمائدین شہر میں ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا محمد اسماعیل لندنی اور مولوی جمیل الدین دونوں حقیقی بھائی تھے اور دونوں بھائی اودھ سرکار

میں بلند عہدوں پر فائز تھے۔۔۔۔۔ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں۔

"سرکار اودھ کی طرف سے جو علماء وقتاً فوقتاً لندن پہنچ گئے ان میں دو نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل لندنی اور مولوی محمد حسین لندنی۔ ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم و فنون سے اہل ملک کو آشنا کیا۔ مولوی محمد اسمٰعیل لندنی مرادآباد کے رہنے والے تھے جو نواب نصیر الدین حیدر کی طرف سے سفیر لندن بھی مقرر ہوئے۔ منطق کی بعض قدیم کتابوں پر ان کے حاشیے ہیں۔ ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی۔ نواب نصیر الدین حیدر کے زمانے میں، ان کے علاوہ دو اور قابل ذکر ہیں اور مولوی کمال الدین حیدر۔ لکھنؤ میں جو یورپین علماء رہتے تھے ان سے برابر ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اس کا نتیجہ وہ رسدخانہ ہے جو ۱۲۴۷ھ میں شاہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں جنرل کلاؤڈ کی کوٹھی میں بننا شروع ہوا۔ اور محمد علی شاہ کے زمانے میں بنکر تیار ہوا۔ اس رسدخانے میں کرنل ولکاکس وغیرہ کے علاوہ مولوی عبدالرب صاحب مولوی کمال الدین صاحب اور مولوی اسمٰعیل صاحب مرادآبادی شریک تھے (ماخوذ از نقوش سلیمانی ص۸۲)

مولانا محمد اسمٰعیل لندنی کا کوئی نواسہ اور پوتہ نہ تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی اور ایک نواسی تھی۔ نواسی کا نام شہر بانو تھا۔ کیونکہ مولانا کے کوئی مزید اولاد نہ تھی اس لئے انکی وفات کے بعد ان کے بڑے بھتیجے مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کو دولت انگلشیہ سے خلعت کے ساتھ ساتھ وہ اعزازی چیز بھی عطا کی گئی جو لندن سرکار سے ان کے چچا مولانا محمد اسمٰعیل لندنی کو ملی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب کوئی انگریز مولوی منو صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے ان کے دولت کدے پر حاضری دینے آتا تو سلام کے بعد بھی مودب کھڑا رہتا۔ جب مولوی صاحب مذکور اس اعزازی شے کو تن سے جدا کر کے الگ رکھ دیتے تو بیٹھ کر گفتگو کرتا۔ غرض مولوی صاحب شہر کی ناک تھے۔

مولوی وہاج الدین کے یہاں روزانہ شہر کے شرفاء اور اہل علم جمع ہوا کرتے تھے۔ ان کا حلقہ احباب ذی علم لوگوں سے پر تھا۔ جن میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ مولانا کافی صاحب۔ مولوی سرفراز علی صاحب۔ سید اکبر علی صاحب سید گلزار علی صاحب اور مولوی وزیر علی صاحب۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مولوی وہاج الدین عرف منو نے ایک قائد کی حیثیت سے انتہائی سرگرمی سے کام کیا۔ اور متعلقہ اسکیم کے تحت پارٹیاں قائم کرنے کے لئے پوشیدہ طور پر بذات خود اور نمائندوں کے ذریعے سربرآوردہ لوگوں کو حصول آزادی کی اس تحریک

میں شرکت کی دعوت دیتے رہے۔ چند رؤسا ان کو اس کار خیر میں پیش پیش دیکھ کر انکے ساتھ ہو گئے اور اس طرح ایک بڑی جماعت وجود میں آگئی۔ لیکن نواب مجوخاں جو شہر کے ایک بڑے رئیس تھے۔ آخری وقت تک تحریک میں شامل نہ ہوئے۔ اسوقت شہر کا جوائنٹ مجسٹریٹ جے جے کمپل تھا۔ مسٹر جان کرانٹ ولسن جج تھے۔ لارسی بی سانڈرس کلکٹر تھا۔ حکمران طبقہ ضلع مرادآد کے لوگوں کے خیالات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ انگریزی حکومت کے حالات روز بروز زبوں ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب مجسٹریٹ ضلع مسٹر سی بی سانڈرس کو میرٹھ چھاؤنی کی ہندوستانی فوج کے باغی ہو جانے کی اطلاع ملی تو اس کے چھکے چھوٹ گئے اور انگریز عہدیداران دانتوں تلے انگلی دبا گئے۔ کلکٹر نے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے ضلع کا انتظام مسٹر جان کرافٹ ولسن (جو ایک معمر اور نہایت مستقل مزاج انگریز تھا) کے سپرد کر دیا اور یوریین عورتوں کو نواب مجوخاں کی پناہ میں اس لئے دیدیا کہ وہ اس تحریک سے علیحدہ تھے اور خود مع اپنے ساتھیوں کے نینی تال کی جانب فرار ہو گیا۔

۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کی قیادت میں ضبط و نظم کے ساتھ حریت نوازوں کا ایک جم غفیر جیلخانہ کی طرف گیا۔ ہجوم نے مولوی منو صاحب کا اشارہ پاتے ہی جیل خانہ پاش پاش کر دیا۔ قائد نے سب سے پہلے پرچم محمدی لہرایا اور تمام قیدیوں کو آزاد کر کے ان کے خورد و نوش اور دیگر ضروریات اہم کا انتظام کیا۔ بعد ازاں ان کے حسب خواہش جس نے اس جماعت میں شامل ہونا چاہا شامل کیا۔ اور باقی لوگوں کو زادراہ دے کر خدا حافظ کہدیا۔ قائد نے شامل ہونے والے نئے لوگوں کا ایک جتھا بنا کر سید علی اکبر صاحب اور سید گلزار علی صاحب کی سپردگی میں اودھ کی سمت روانہ کر دیا۔ اس دوران میں جان کرافٹ ولسن حریت نوازوں کی مارچ کی خبر پاتے ہی روپوش ہو گیا۔

مرادآباد کے جیل خانے لوٹنے کی خبر روہیلکھنڈ میں پھیلتے ہی عہدیداروں کا سارا رعب دبدبہ یخ بستہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کی جس قدر بھی دہشت عوام کے دلوں پر طاری تھی یکسر غائب ہو گئی۔ روہیلکھنڈ کے صدر مقام بانس بریلی میں حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں کے پوتے نواب خان بہادر خاں حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے۔

مرادآباد سے ایک وفد قصبہ اور بریلی بھیجا گیا۔ وفد کے صدر مولوی کفایت علی کافی تھے۔ جنھوں نے اپنے فرائض انتہائی خوش اسلوبی، جوانمردی، شجاعت اور دانشمندی سے سرانجام دیئے اور مرادآباد تشریف لے آئے۔

ریاست رامپور کی سرد فضاؤں میں بھی حرارت آچکی تھی لیکن انقلاب کی مکمل تیاریوں کے لیے وہاں جانا امر محال تھا۔ ایسے میں کس کی ہمت تھی جو خود کو جان بوجھ کر آگ کے کنویں میں جھونکتا۔ مگر فدائے قوم مولوی دہاج الدین عرف مولوی منو جی کی یہ قوم پروری حُب الوطنی اور شجاعت تھی کہ سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے چند ساتھیوں میں جلسے کرتے۔ پمفلٹ پڑھ کر سناتے اور اس طرح اپنے وطن کے سپوتوں کو بیدار کر کے جنگ آزادی کی تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتے۔

مرزا ناظم بخت کے بیٹے اور فرخ سیر بادشاہ کے نواسے شہزادہ فیروز شاہ کا جب ورود مرادآباد ہوا تو شہر کے خواص و عوام سب ہی شاندار طریقے پر استقبال ہوئے۔ مولوی دہاج الدین عرف مولوی منو۔ فیروز شاہ کے دستِ راست تھے۔ مولوی صاحب مذکور اور دیگر رؤسائے شہر اس کی ہر قسم کی معاونت کرتے رہے۔ شہزادہ فیروز شاہ نے شہر کا گشت کیا اور فرداً فرداً ان رؤسا کے یہاں بھی گیا جو جنگ آزادی میں شریک نہ تھے اور اپنے دروازے مقفل کر چکے تھے بالآخر فیروز شاہ نے نواب مجو خاں کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا لیکن ہر دستک اور صدا کا جواب مکمل سکوت ہی رہا اور دیگر رؤسائے شہر کی طرح مجو خاں کے کان پر جوں تک نہ رینگی شاہزادہ مایوس ہو کر ان کے در پر یہ الفاظ لکھ کر واپس ہو گیا۔

" نہ کھلواؤ دروازہ۔ مگر یاد رہے جاکر تم ایسی موت مارے جاؤ گے کہ لوگ عبرت حاصل کریں گے۔ ہم تو جاتے ہیں "

مرادآباد میں فیروز شاہ اور اسکی ہمراہ فوج کا پڑاؤ اس باغ میں ہوا تھا جس باغ کی کوٹھی میں کبھی نتھو ں والا صاحب رہتا تھا مقام مذکور اس سڑک پر واقع ہے جو سڑک گل شہید کے برف خانے کے ٹکڑے سے بڑے اسٹیشن کو جاتی تھی۔

ریاست رامپور کے نواب نے قوم سے غداری کی اور انگریزوں کی ہر ممکن اور ہر طرح سے مدد کی۔ انگریزوں نے موقعہ کو غنیمت جان کر پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں نے نواب رام پور کی کثیر فوج لے کر مرادآباد پر چڑھائی شروع کر دی۔ شاہزادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں مولوی دہاج الدین عرف مولوی منو کے علم جہاد کے زیر سایہ مجاہدین جنگ آزادی نے نواب کی فوج اور انگریزوں سے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حتیٰ کہ بعض خواتین مردانہ لباس زیب تن کر کے میدان میں آئیں اور مخالفین کے دانت کھٹے کیے۔ لیکن حریت نوازوں کو شکست ہوئی اور انگریز شہر پر قابض ہو گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ سنبھل والی سڑک سے روانہ ہوا اور کندرکی

ہوتا ہوا قصبہ آنولہ سے گزرکر بریلی جا پہنچا۔ اگرچہ انگریزوں نے اس کا بے حد تعاقب کیا۔ مگر فیروزشاہ کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

شہر پر قبضہ کرتے ہی انگریز افسران نے ضلع کلکٹر سانڈرس کی نجو خاں کی پناہ میں دی ہوئی عورتیں واپس لیں نواب مجو خاں اس تحریک آزادی میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے قطعی محفوظ تھے اور ان پر کوئی حرف نہیں آیا تھا لیکن یو تہین عورتیں واپس گئیں تو انھوں نے افسران سے مجوخاں کی شکایات کیں جن کو انگریز افسران برداشت نہ کر سکے اور انھیں گرفتار کرکے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور جونے میں بھگوا کر ان کی لاش کو ہاتھی کے پیر سے بندھوا کر کھنچوایا گیا اور انکی تمام جائداد ضبط کرلی گئی۔

انگریزوں نے برسر اقتدار ہوتے ہی شمع حریت کے پروانوں کی ایک طویل فہرست بنائی فہرست میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ گرفتاریاں شروع کردی گئیں محبان وطن کے لئے سزائے موت کا حکم جاری ہونے لگا۔ شہر کی مختلف سمتوں میں پھانسی گھر قائم کئے گئے۔ پھانسیوں کا مرکز سرائے پختہ کے سنبھلی گیٹ کے متصل رکھا گیا۔ جاں نثار قوم کو آزادی سے پھانسیاں دی جانے لگیں۔ حریت کے پروانوں کے لئے کوئی قانون اور انصاف نہ تھا جو شخص جس کا بھی نام لیتا اس کو انتہائی بے رحمی سے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جاتا اور پھانسی کے بعد انھیں وہیں دفنا دیا جاتا تھا۔ شہدائے ملت کی یاد میں ایک محلہ اب بھی آباد ہے جو گل شہید کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

ایک شخص نے جو مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کے دستر خوان کا بھاگڑ بلا بھی رہ چکا تھا متعلقہ انگریز افسر کو مولوی صاحب مذکور کی تحریک آزادی کی مخبری کردی اور گرفتار کرا دینے کی حامی بھرلی اس افسر نے اسی وقت ایک رسالہ بھاگڑ بلے کے ہمراہ مولوی صاحب کو گرفتار کردینے کے لئے بھیجا۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور عصر، مغرب کے درمیان کا وقت بھاگڑ بلے نے ملازم کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ مولوی صاحب ان دنوں انتہائی محتاط تھے مگر آنے والے کا نام سنتے ہی ان کی احتیاط اور وقت کی نزاکت، نرم دلی خلوص اور ہمدردی تلے دب گئی اور انھوں نے فوراً ہی صدر دروازہ کھول دینے کا حکم صادر فرما دیا دروازہ کھلتے ہی بھاگڑ بلے کے ساتھ فوجی رسالہ بھی دیوان خانہ میں داخل ہوا۔ اور آزادی سے آگے بڑھا۔ اس پر ایک نمک حلال ملازم نے تیوری بدل کر مداخلت کی جسکو اسی وقت شہید کر دیا مولوی صاحب نے اپنی بندوق جو قریب ہی بھری ہوئی رکھی تھی اٹھائی لیکن معاً ان پر گولیاں برس پڑیں

اور انکی روح کلمہ پڑھتی ہوئی قفس عنصری سے عالم بقا کی طرف پرواز کر گئی۔ آقا اور ملازم کی لاش فوجی رسالہ اپنے ساتھ لے گیا اور انکی تمام آبائی جائداد ضبط کر لی گئی۔

مولوی رضی الدین عرف مولوی منوا اور ان کے ملازم دونوں شہدا کی پختہ قبریں خطیرہ کے اندرون واقع محلہ کنجری سرائے نخل ہندوؤں کی مسجد کے نزدیک کچہری روڈ کے متصل میدان میں نیم کے اشجار کے سایہ میں موجود ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حوالہ جات

۱؎ تاریخ الہ آباد ص ۲۰۴ مفتی افضل خان الہ آبادی مطبوعہ افضل پریس الہ آباد
و غدر کے چند علماء ص ۱۱۶ مفتی انتظام اللہ شہابی مطبوعہ دینی بکڈپو اردو بازار دہلی
۲؎ تاریخ بدایوں ص ۱۵۷، مصنفہ وکیل احمد مفتی بدایونی، مطبوعہ شمسی پریس بدایوں
۳؎ تاریخ بدایوں ص ۱۵۸ تا ایضاً
۴؎ ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور ص ۵۸ بابت ماہ مئی ۱۹۵۷ء جنگِ آزادی نمبر
۶؎ حضرت مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۲، مطبوعہ مطبع نامی منشی نول کشور لکھنو
۷؎ رسالہ معلم الاخلاق علی گڑھ، ص ۲۱ ، بابت ماہ اکتوبر ۱۸۷۵ء
۸؎ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، لیل و نہار لاہور ، بابت مئی، ۱۹۵۷ء جنگِ آزادی نمبر
۹؎ روزنامچہ غالب ص ۱۱۷ ، مطبوعہ دہلی
۱۰؎ مولانا فضل قیوم قادری صاحب "تاریخ شعرائے دہلی شریف"، ص ۱۳۱، مطبوعہ افضل المطابع دہلی شریف
۱۱؎ نقل مولانا محمد احسن صاحب قادری بدایونی، ماہنامہ طریقت دہلی ائمہ اہلسنت نمبر ص ۱۱۹، اپریل ۱۹۵۲ء
۱۲؎ " " ۱۴۴ "
۱۳؎ تذکرۂ منیر ص ۱۱۶ مطبوعہ عظیم آباد
۱۴؎ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی، غدر کے چند علماء ص ۷۲ ، مطبوعہ دہلی شریف۔
۱۵؎ جناب منیر شکوہ آبادی ، ص ۱۱۷۔

باقی ص ۲۲۷

کتب خانوں، مدرسوں اور خانقاہوں کی بربادی

پروفیسر محمد ایوب قادری کی زیر طبع
کتاب "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے ماخوذ

دھلی مسلمانوں کی ساڑھے سات سو سالہ تہذیب کا قدیم مرکز تھا۔ اس سرزمین میں بڑے بڑے علماء و فضلا پیدا ہوئے۔ بہت سے مدارس اور خانقاہیں قائم ہوئیں، علوم و فنون، تاریخ و ادب کا مرکز رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے ہزاروں انسانوں کو بے دریغ قتل کیا اور ہزاروں عمارتوں کو ڈھایا۔ اور منہدم کیا۔ بہت سی درس گاہیں اور مدرسے ویران و برباد ہوئے۔ سینکڑوں علماء، و فضلا اور شعراء و ادباء گولیوں کا نشانہ بنے۔ صہبائی و میر پنجہ کش جیسے استادان زمانہ مارے گئے۔ بہت سے کتب خانے برباد ہوئے۔

سلاطین دہلی کے سینکڑوں برس کے ذخیرے اور علماء قدیم کی کتابیں برباد ہوگئیں۔

شاہی قلعہ کے کتب خانے کی بربادی سب سے بڑا سانحہ ہے۔ یہ وہ کتب خانہ تھا جس میں ہمایوں کے ذخائر تھے۔ جس میں ہمایوں کے حکم سے ترجمہ کی ہوئی اور جمع شدہ کتابیں تھیں۔ جس میں جہانگیر کی صناعی اور کاریگری کے نمونے تھے۔ غرض کہ یہ ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا، بعض اوقات حضرت شاہ عبدالعزیز بھی قلعے سے کتابیں منگاتے تھے۔ اسی طرح میاں نذیر حسین قلعے کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔ یہ کتب خانہ ایسا مٹا کہ نام و نشان نہ رہا۔

مفتی صدرالدین رحمتہ اللہ علیہ نامی گرامی عالم تھے۔ بہت سے علماء ان کے شاگرد تھے۔ مدرسہ دارالبقا کو انہوں نے زندہ کیا۔ مفتی صاحب کے پاس ایک اچھا کتب خانہ تھا۔ سقوط دہلی کے بعد مفتی صاحب بھی گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، بڑی مشکل سے آدھی جائیداد واگزاشت ہوئی۔ لیکن کتب خانہ واپس نہ ہوا۔ لارڈ لارنس سے خاص طور سے اس سلسلے میں درخواست کی گئی۔

مؤلف حدائق حنفیہ رقمطراز ہیں[1]۔

---

[1] حدائق الحنفیہ ص ۴۸۲

"۱۲۷۳ھ میں دہلی کے غدر میں آپ کو سخت زخم چشم پہونچا کہ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا۔ اور تمام جائداد و املاک بھی جو تیس سال کی ملازمت میں پیدا کی تھی سرکار میں ضبط ہو گئی۔ بلکہ جہاد کے فتوے کے اشتباہ میں چند ماہ تک نظر بند رہے۔ آخر کو رہائی پاکر لاہور میں تشریف لائے۔ اور واسطے اپنے کتب خانے مالیتی تین لاکھ روپے کے جو دہلی کی لوٹ میں نیلام ہو گیا تھا۔ حضور لارڈ جان لارنس کے پاس گئے، اس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور مولانا ممدوح کے دہلی میں مہربان رہ چکے تھے مطالبہ کیا لیکن چونکہ جائداد منقولہ کے نیلام کا واپس ہونا متعذر تھا، اس لئے اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہوئے۔"

نواب ضیاء الدین احمد خاں نواب احمد بخش کے فرزند تھے۔ لوہارو سے ان کے حصے کی رقم ملا کرتی تھی۔ اردو فارسی کے ادیب اور شاعر تھے، اردو میں نیّر اور فارسی میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ تاریخ کے بڑے عالم تھے۔ ان کے پاس ایک اچھا کتب خانہ تھا، وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ کتابوں کی فراہمی پر صرف کرتے تھے۔ ہندوستان کی ضخیم تاریخ ایلیٹ نے آٹھ جلدوں میں لکھی ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد کے کتب خانے سے ایلیٹ کو سب سے زیادہ مدد ملی۔ اس نے آٹھویں جلد میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد مرزا غالب کی نظم و نثر کو خاص طور سے محفوظ رکھتے تھے۔ مرزا صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں[1]

"میرا ایک بھی بھائی ہے۔ نواب ضیاء الدین خاں سلّمہ اللہ تعالیٰ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ "مجموعہ نثر اور کلیاتِ نظم اردو" سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے، وہ کتب خانہ کہ ڈر کر عرض کر رہا ہوں بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا۔ لٹ گیا ایک ورق نہیں رہا۔"

دلی کے ایک رئیس زادے حسین مرزا تھے جو حسام الدین حیدر خاں کے فرزند اور نواب ذو الفقار الدولہ نجف خاں کے نواسے تھے۔ مرزا غالب سے بڑے خاص تعلقات تھے بلکہ مثل ان کے عزیزوں کے تھے ان کا بڑا اچھا کتب خانہ تھا۔ وہ بھی بری طرح برباد ہو گیا۔ مرزا غالب لکھتے ہیں[2]

"بھائی ضیاء الدین صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی، فارسی، نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی، نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔"

---

[1] یہ اقتباس "خطوطِ غالب" مرتبہ غلام رسول مہر سے ماخوذ ہے۔ [2] یہ اقتباس خطوطِ غالب مرتبہ غلام مہر سے ماخوذ ہے۔

شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا۔ ولی کامل تھے۔ ان کی خانقاہوں میں دیگر خانقاہوں کی طرح کتب خانہ تھا۔ اس کے علاوہ شیخ کا کلام وغیرہ بھی تھا۔ جب بربادی ہوئی تو شیخ کے تبرکات اور کتب خانہ بھی برباد ہوگیا۔ مرزا غالب یکم دسمبر ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں حکیم احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں :[1]

" شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی، ان کے گاؤں کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ وہاں کے رہنے والے گولی سے بچ گئے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہے کہ کہاں ہوں گے۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا، کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب وہ لوگ نہیں ہیں۔ کس سے پوچھوں۔"

غرض یہ ان چند کتب خانوں کی نشان دہی ہو سکی۔ ورنہ بہت سے علمی ذخائر اور کتب خانے ایسے برباد ہوئے کہ آج ان کی نشان دہی بھی مشکل ہے۔

مدرسوں اور خانقاہوں کی ویرانی

ان کتب خانوں کے علاوہ بہت سے علمی مراکز اور تہذیبی و ثقافتی ادارے بھی ختم ہوگئے۔ ان میں سے دہلی کالج خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مفتی صدر الدین آزردہ کا مدرسہ دار البقا ختم ہوا۔ جس سے سینکڑوں نامور طالب علم فارغ ہو کر نکلتے تھے۔ ان کے علاوہ بزرگوں کے روحانی مراکز اور خانقاہیں بھی برباد ہوگئیں۔ کئی نامور بزرگ اور مشائخ حجاز کو ہجرت کر گئے۔

حضرت کلیم اللہ جہاں آبادی کی خانقاہ دہلی کی مشہور خانقاہ تھی۔ اس کی بربادی کا ذکر غالب کے خط میں اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت شاہ فخر الدینؒ کا خاندان بری طرح برباد ہوا۔ حضرت کالے صاحب نبیرۂ شاہ فخر الدینؒ۔ بادشاہ کے پیر تھے، ان کے ہزاروں عقیدت مند تھے۔ اس خاندان کے متعلق مرزا غالب حکیم احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں :[2]

" خود یہاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا۔ جیسے جھاڑو پھیری۔ کوئی کا پرزہ، سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔"

یہاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین سخت مشکلات میں مبتلا ہوئے اور شہر وں

---

[1] خطوطِ غالب جلد دوم ۔ ص ۔ ۱۳۸۔

[1] خطوطِ غالب جلد دوم ص ۱۳۸ [2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۶۰ [3] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۶۰

شہزادے مارے مارے پھرتے ہیں۔ مرزا غالب الور والوں کو لکھتے ہیں ۷

"حال صاحبزادہ میاں نظام الدین (فرزند کالے میاں) کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے نکل گئے تھے وہاں یہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے۔ اورنگ آباد میں رہے۔ حیدرآباد میں رہے۔ سال گزشتہ جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی لیکن نری جان بخشی ہو گئی۔"

اس کے علاوہ حضرت مرزا جانجاناں کی خانقاہ برباد ہوئی۔ اس خانقاہ کے سجادہ نشین شاہ احمد سعید صاحب تھے۔ شاہ صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی صاحب اس وقت کی دلی کے بزرگ مشائخ اور علماء میں سے تھے ۸

جب دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو یہ دونوں بھائی حجاز کو ہجرت کر گئے۔ ان دونوں بزرگوں کے جانے سے دلی سونی ہو گئی ۹

---

۷ خطوط غالب جلد دوم ص ۔۔۔ ۔ ۸ قیصر التواریخ ص ۲۶۳

۱۵ مرزا رحمت علی، رسالہ دبدبۂ سکندری رام پور، ص ۹ مقام اشاعت رام پور ۱۲۳۰ھ
۱۶ میر اعجاز حسین دہلوی، دہلی کا ادب، ص ۲۱۷
۱۸ تذکرہ شعرائے دہلی، ص ۹ مطبوعہ دہلی، مصنف سید محمد معظم دہلوی
۱۹ تذکرہ شعرائے دہلی ص ۱۲۱ مطبوعہ دہلی، مصنف سید محمد معظم دہلوی۔
۲۰ عبدالقیوم مراد آبادی، تاریخ مراد آباد، ص ۱۰۰، مطبوعہ مراد آباد یوپی بھارت
۲۱ مولانا فضل حق صاحب بریلوی، دہلی کے شاعر و ادیب، ص ۱۵۵، مطبوعہ افضل المطابع
۲۲ ابوالحسن مینائی، تذکرہ شاہ مینا ص ۱۹۵ مطبوعہ افضل المطابع لکھنؤ
۲۳ محمد نعمان قادری بریلوی، جنگ آزادی کے شعراء ص ۴۷ مطبوعہ، لکھنؤ
۲۴ بروایت مولانا محمد احسن صاحب قادری دہلوی، ماہنامہ رسالہ طریقت دہلی، ص ۲۰۱، محمد بن سنت نمبر، بابت ماہ اپریل ۱۹۲۰ء
۲۵ مولانا وکیل احمد صاحب سکندرپوری، تذکرہ علمائے اہلسنت خیرآباد، ص ۲۱۹ مطبوعہ حسن پریس دہلی
۲۶ مولانا وکیل احمد صاحب سکندرپوری، تذکرہ علمائے اہلسنت خیرآباد، ص ۲۰۴ مطبوعہ حسن پریس دہلی
۲۷ فضل کریم صاحب اودھی، نکات الشعراء ص ۱۱۹ مطبوعہ افضل المطابع دہلی شریف۔

مرزا غالب کے دیوان خانے میں

(از:- عشرت رحمانی)

جنرل بخت خاں کے دہلی آنے کے بعد تنظیم، استقلال اور عزیمت کا زمانہ شروع ہو گیا تھا اور بادشاہ سلامت کو بھی اطمینان ہونے لگا تھا۔ ۲۶ر جون سے ۳ر جولائی کے درمیان لڑائی کا زور زیادہ گھٹنے لگا تھا۔ لیکن پہلی اور دوسری جولائی کے درمیان روہیل کھنڈ کے لشکروں کی آمد آمد سے مجاہدین کے حوصلے بڑھ گئے۔ دروازے کھول دیئے تھے۔ پہاڑی سبزی منڈی، باڑہ ہندو راؤ، داڑہ وغیرہ کے مورچے آزاد فوجوں نے قبضہ کر کے سنبھال لئے تھے۔ شرفائے شہر جن میں علماء، شعراء و ادبا شامل ہیں جب کہیں موقعہ پا کر مل بیٹھتے ہیں۔ جنگ کے حالات اور ان پر رائے زنی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جب سے شہر کی تنظیم شروع ہوئی ہے۔ دبیر الملک، مرزا غالب اور ان کے مخصوص احباب امام بخش صہبائی، مفتی صدر الدین آزردہ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل حق خیر آبادی، دیگر حضرات مرزا غالب کے دیوان خانہ اور نواب شیفتہ یا مولانا آزردہ کے مکان پر اکثر اس قسم کی بزم آرائیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک دن مرزا غالب کے دیوان خانے میں محفل آراستہ ہے۔ اور سب حضرات گفتگو میں مصروف ہیں۔ مولانا فضل حق بادشاہ کے امیروں کا ذکر کرتے رہے اور رائے زنی ہوتی رہی۔ اسی دوران میں مولانا آزردہ نے کہا۔

"مولانا بادشاہ سلامت بری طرح نرغے میں ہیں۔ مجھے تو مرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی کی طرف سے شدید اندیشہ ہے۔"

مولانا فضل حق:- میں نے بھی عرض کیا۔ دربار کا نقشہ ان دنوں دیکھ رہا ہوں۔ عجیب ہے۔

دونوں کچھ ایسی حرکتیں کر رہے ہیں کہ عقل تاصرہے اور حضور بادشاہ سلامت اس قدر حلیم الطبع۔ راست باز اور خلقِ مجسم ہیں کہ اگر کوئی خیر خواہ دولت کسی مفسد کے بارے میں اشارۃً شبہ ظاہر بھی کرتا ہے تو حضور اس کی طرف سے صفائی دے دیتے ہیں۔ اور خصوصاً ان دونوں کو تو بے حد مخلص اور خیر خواہ تصور کرتے ہیں۔

مرزا غالب (آہ سرد کھینچ کر)۔ صاحبو! اللہ ہی الغرب۔ اس ہنگامہ کار زار سے ہم تو تنگ آ گئے۔ آہ چرخِ کج رفتار کا بُرا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال، جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشۂ دلتوشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے ؎

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک | اور تو یہاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

بادشاہت نام کی ہے۔ کام کرنے والے اچھا بُرا جو چاہے کرتے ہیں۔ اس درشتِ بے ریا کو ہر طرح پریشان اور بدنام کئے جاتے ہیں۔ دیکھئے اب اس کا حشر کیا ہو۔ حقیقت یہ کہ اگر دلی مٹ گئی تو انسانیت برباد اور تہذیب تباہ ہو جائے گی۔"

نواب شیفتہ۔ بہرحال ہم لوگ سوائے دعائے خیر اور کیا کر سکتے ہیں۔ زبانی باتوں کے سوا کیا چارہ ہے۔ سنا ہے جب سے جنرل بخت خاں نے شہر کا انتظام اور جنگ کا نقشہ سنبھالا ہے۔ آزاد فوج کی فتح کی امیدیں بندھنے لگی ہیں۔"

مولانا فضل حق: "نواب صاحب موجودہ حالات بڑی حد تک غازیوں کے حق میں ہیں، خدا مشکل آسان کرے۔ اور ان فرنگیوں سے نجات بخشے۔ جنرل بخت خاں کی بروقت آمد تو اس کی مصداق ہے کہ

مردے از غیب آید و کارے بکند۔"

مولانا آزردہ۔ "ہاں مولانا عضب کا شیر دل انسان ہے۔ فربہ اندام۔ دراز قد، تنومند اور بلا کا جیالا۔ کافروں کو ہر ہر مورچہ پر مولی گاجر کی طرح کاٹ کے پھینک دیا ہے اسی بہادر نے۔"

صہبائی:۔ "جی ہاں کئی روز ہوئے صاحب عالم ملے تھے۔ سنا رہے تھے کہ ۹ جولائی کو جنرل صاحب نے دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ انگریزی فوج پر حملہ کیا اور تیس ہزاری میدان ان سے چھین لیا۔ گھوڑے ہتھیار اور بہت سا سامان میدان جنگ سے ہاتھ آیا۔

غالب۔ "میاں صہبائی ایک روز تم نے ہی تو بیان کیا تھا کہ یہ بخت خاں شہر میں کس طرح داخل ہوئے۔"

صہبائی۔ "قبلہ یہ واقعہ مجھے بھی راقم الدولہ کی زبانی معلوم ہوا۔ اپنا چشم دید حال سنا رہے تھے مگر معلوم ہوتا ہے یہ بھی غازیوں کے خلاف اور انگریزوں کے ہوا خواہ ہیں۔"

غالب "خیر اس بحث کو تو جانے دو۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے اس وقت۔ انجام پر جو نظر ہے۔ واقعہ دلچسپ تھا۔"

آزردہ :۔ "ذرا سنائیے نا۔"

صہبائی :۔ "جی وہ کہتے تھے۔ جنرل بخت خان جب دہلی میں داخل ہوا تو ہمراہ کا کچھ چند توپیں اور تین رجمنٹیں سواروں کی ساتھ تھیں اور کئی رسالے پیدل بھی لے کر آیا۔ سر پہ انگوچھا لپیٹا ہوا۔ جال کے بنے گلے میں پڑی ہوئی، پیچھے ڈھال لٹکا کر بریلی والا جرنیل وہی تھا۔ بظاہر تو اس کا لباس گھاس کھدوں کا سا تھا۔ میں تو سمجھا جیسے اور لوگ سپاہی ہیں۔ یہ بھی کوئی سپاہی ہوگا۔ بادشاہ نے فرزند کا خطاب عطا کیا۔"

غالب ۔ "بھئی واہ کیا خوب ۔!!"

فضل حق :۔ "جی ہاں ان کا بیان درست ہے۔ حضور بادشاہ سلامت نے خطاب کے علاوہ ایک بیش قیمت ڈھال اور تلوار بھی عنایت کی اور تمام شہر میں منادی کرائی گئی کہ پلٹنوں کے افسروں کو مراتب سننے کے لیے جرنل کے پاس جانا چاہیئے۔ انہوں نے اپنا فوجی دفتر علیحدہ قائم کیا ہے۔ اس کے منشی میراث علی مقرر ہوئے ہیں۔ ان کے ڈسپلن کی بدولت فوج میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔"

آزردہ ۔ "یہ تو فالِ نیک ہے صاحب۔ حالات بہتر ہو جائیں گے۔ اسی لیے شہر کا انتشار اور ابتری ختم ہو رہی ہے اور فوجی نظام بھی سدھر رہا ہے۔"

فضل حق :۔ "لیکن مولانا۔ جرنل صاحب کا تو حال یہ ہے۔ ع

دو گونہ رنج و عذاب است جانِ مجنوں را

ایک طرف شہر کا انتظام۔ دوسری طرف فوجی نظام۔ حاسدین و سازش پسند لوگوں کا تتبع کرنا اور پھر سب سے زیادہ مشکل کام شہزادہ مغل کو رضامند رکھنا۔"

غالب :۔ "یہ کیوں صاحب شہزادے کو کیا تکلیف ہے۔؟"

فضل حق :۔ "وہ اپنا اقتدار و اختیار چاہتے ہیں اور ناتجربہ کار ہیں۔ جرنل صاحب ہر طرح سے بہبودی کے خواہ ہیں۔ اس لیے شہزادہ سے ان بن رہتی ہے۔ جرنل صاحب کی شہزادہ جواں بخت سے خوب بنتی ہے۔ اسی بات پر دونوں بھائیوں کے درمیان بھی کچھ چپقلش ہونے لگی ہے۔"

غالب :۔ "تو یوں کہیے جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔"

فضل حق :۔ "جی ہاں! جرنل غریب یکسوئی سے کام نہیں کر سکتا ہے۔ حضور بادشاہ سلامت نے کلی اختیارات دیئے ہیں اور اس کی شجاعت و دیانت اور فرائض منصبی کی انجام دہی پر حضور کو کامل اعتبار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ مغل کو کوئی نہ کوئی مفسد بہکاتا ہے۔ یہ بھی کوئی سازش ہے۔ ورنہ مرزا مغل بھی شجیع، عقل مند جوان ہیں۔"

آزردہ ۔ "یہ گمان درست معلوم ہوتا ہے مولانا۔ مرزا مغل ذرا جوشیلے اور کوتاہ اندیش بھی ہیں۔"

فضل حق "جی ہاں! برعکس اس کے جوان بخت سلیم الطبع، بُردبار اور سنجیدہ نوجوان ہیں حالانکہ مرزا مغل سے کم عمر ہیں اور ملکہ زینت محل کی نازبرداری شہزادہ مغل سے زیادہ ان پر ہے۔ تاہم فطری طور پر بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔"

غالب "صاحبو! مجھ کو تو نظر آتا ہے کہ دلی پر ایک نہیں کئی لشکروں کا حملہ ہے۔ پہلا باغیوں کا، اس میں اہل شہر کا اعتبار تھا۔ دوسرا خاکیوں کا۔ اس میں جان و مال و ناموس۔ مکان دکانیں، زمین و آسمان و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا کال کا۔ اس میں ہزاروں آدمی بھوکے مرے۔"

آزردہ! "مرزا صاحب آپ بھی عام شہریوں کی طرح غازیوں کو باغی سمجھتے ہیں!"

غالب "مولانا یہ اپنی اپنی بات ہے۔ گو کہ میں ذرا سے فرق سے اس لشکر عظیم کو دو گروہوں میں بانٹنے کو تیار ہوں۔ ایک وہ جو واقعی ملک کے خیرخواہ ہیں اور غازی ہیں۔ اور دوسرے وہ جو ان کی آڑ میں لوٹ مار مچا رہے ہیں۔ یہ صریحاً باغی ہیں۔ اور چونکہ یہ جنگ خواہ کسی نظریئے اور مقصد کے تحت ہو ایک برسرِ اقتدار طاقت کے خلاف دوسری قوت کی بغاوت ہے۔ اس لئے اس میں شریک ہونیوالے نیک و بد سب باغی ہی کہلائیں گے۔ اور صاحب انگریز بہرحال انگریز ہے۔ ان کے انداز حکومت اور طرز جہاں بانی کی داد دینا پڑتی ہے۔"

آزردہ۔ "مرزا صاحب۔ خدا خدا کیجئے۔ یہیں تاویل آپ کی بجا۔ لیکن آخری ارشاد قابلِ غور ہے۔"

غالب "جی ہاں غور و فکر ہی کے لئے عرض کرتا ہوں ؎

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

فضل حق "مرزا صاحب۔ آپ نے اس مسئلہ کے جملہ پہلوؤں پر غور نہیں کیا۔ یہ دینی جنگ ہے۔"

غالب "مولانا غور بھی کروں تو کیا حاصل۔ مفتی صاحب تو متفق ہیں۔ خدا خدا کروں۔ آپ فرماتے ہیں۔ "دین دین" کا نعرہ لگاؤں۔ یہ باغیوں کی صدا ہے اس لئے میں کچھ نہیں کہتا۔ ہاں آپ نے تو جہاد کے فتوے پر دستخط کر دیئے ہیں۔ خدا خیر کرے۔"

مولانا آزردہ کچھ سوچنے لگے۔ سب حضرات مسکرانے لگے۔ مرزا صاحب نے اس سنجیدہ بحث میں بھی بذلہ سنجی کا پہلو نکال لیا۔

مولانا فضل حق نے کہا "خیر صاحب کچھ بھی ہو۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ الحمد للہ اب حالات رو بہ اصلاح ہیں۔ اگر عقل و تدبر سے کام لیا۔ جنرل بخت خاں کے نقشے کے مطابق کام ہوتا رہا اور غدر اور خانہ جنگی کی وبا نہ پھیلی تو انشاء اللہ میدان مجاہدین کے ہاتھ میں ہے۔"

مفتی آزردہ اور صہبائی نے یکزبان ہو کر کہا "آمین ثم آمین۔"

اس کے بعد گفتگو کا پہلو بدل گیا۔ مولانا فضل حق نے مرزا غالب سے پوچھا۔ ''مرزا صاحب معاف کیجئے گا۔ اس بحث کے ہنگامہ میں مرزا یوسف کی مزاج پرسی کرنا بھول ہی گئے۔''

غالب:۔ ''بحث کے ہنگامے میں نہیں بلکہ ہنگامے کی بحث میں۔''

مولانا فضل حق مسکرا دیئے اور پھر اپنے سوال کو دہرایا۔

مرزا صاحب نے مضمحل انداز میں کہا۔ ''صاحب اس بگڑے مزاج کا حال ہی کیا۔ دماغ ماؤف قویٰ مضمحل۔ اس تمرد کے ہنگامے میں نہ علاج معقول ہو سکتا ہے۔ نہ مناسب غذا بہم پہنچتی ہے۔ ہوش میں آجاتا ہے تو واہی تباہی بکتا ہے۔ یا رات دن بے ہوش پڑا رہتا ہے۔ کئی کئی روز اس ہنگامے کے زمانے میں میں اس کی خبر تک کو نہ جا سکا۔''

مرزا صاحب محبوب بھائی کے درد سے آبدیدہ ہوگئے سب خاموش، افسوس و ہمدردی کے کلمات کہنے اور صحت کی دعا کرنے لگے۔ مرزا یوسف بیگ مرزا غالب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ جو جوانی کے عالم میں مرض جنون میں مبتلا ہو کر ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ سینکڑوں علاج ہوئے مگر افاقہ نہ ہوا۔ مرزا صاحب کو ان سے عشق ہے اور وہ ان کے حالِ زار سے سخت رنجیدہ ہیں۔ مرزا صاحب علیحدہ مکان میں رہتے تھے مگر مرزا غالب ان کے نگران تھے۔ اس ہنگامہ کے دوران مرزا صاحب بھائی اور ان کے بال بچوں کی خبر گیری نہ کر سکے۔ کچھ دیر بعد مولانا فضل حق وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مرزا صاحب اور دوسرے احباب حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتے رہے۔ مرزا صاحب نے صہبائی صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

''میاں صہبائی۔ یہ فساد ہمارے حق میں تو عذاب بن گیا ہے۔ خون کی کشید ہو رہی ہے۔ دیسی عرق کی کشید بند ہے۔ ولایتی شراب نایاب ہے۔ اگر کہیں سے مل جائے تو غم غلط کرنے کا سامان کریں۔''

احباب مسکرانے لگے۔ مرزا صاحب نے مولانا آزردہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مولانا معاف کیجئے۔ رنج و غم کی دوا کا ذکر کر رہا تھا۔ فتوے سے ڈرتا ہوں۔ آپ دوستی کا حق نبھا کر معاف بھی کر دیں گے۔ مگر آج کل بریلی کے مولویوں کی جماعت جگہ جگہ فتوے دیتی پھر رہی ہے۔ ان سے بچنا دشوار ہوگا۔''

''آزردہ۔ مرزا صاحب۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ مجاہد علما کی اس جمعیت نے کارہائے عظیم انجام دیئے ہیں۔ اخیر معاملہ تو یہ ہے کہ ع

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

شیفتہ: ''انگریز کے دل سے پوچھئے۔ اس کے عیش و فراغت میں خلل انہیں نے ڈالا ہے اور

ان کے مظالم کے خلاف بغاوت کے بانی بھی ہوئے۔"

صہبائی۔ "نواب صاحب واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں کی مسلسل زیادتیوں اور ظلموں نے یہ دن دکھایا ہے اور انگریز بہادر کی کمپنی خود اس کی بانی ہے۔"

آزردہ۔ "اس میں کوئی شک نہیں۔ لارڈ ڈلہوزی کی ناانصافیوں اور بدعہدیوں نے ملک گیری کی ہوس میں تمام ریاستوں حتیٰ کہ اودھ کی اتنی بڑی مملکت کو کمپنی کے تحت ملا لینے سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہندوستان کی شہنشاہیت کے خواب کی تعبیر تلاش کر رہے ہیں۔"

صہبائی۔ "یہ حقیقت ہے اور اس لئے اس جنگ کو ہنگامی بغاوت نہیں کہا جا سکتا۔ ملک کے تمام باشندوں نے سیاسی بےچینی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔"

شیفتہ۔ "خدا انجام بخیر کرے۔ انگریز اس آسانی سے تو بھاگنے والا نہیں۔"

آزردہ۔ اندیشہ یہی ہے کہ جیسے کچھ ہندوستانی سپاہی انگریزی فوج میں شامل ہو گئے ہیں۔ کہیں طمع و لالچ میں انہیں ہمارے ہی بھائی زیادہ سے زیادہ امداد نہ دینا شروع کر دیں۔ بندے نے تو اپنا اقدام بھی حزم و احتیاط سے روا رکھا ہے۔"

شیفتہ: "اگر صرف انگریز کا مقابلہ ہو رہا ہے تو ہندوستانی ہار نہیں سکتے۔ پھوٹ پڑ گئی تو حالات بگڑ جائیں گے۔"

صہبائی: "سنا ہے انگریز جاسوسوں نے عجیب طریقے ہندوستانیوں کو بہکانے، ورغلانے اور پھوٹ پیدا کرانے کے اختیار کئے ہیں۔ بھیس بدل کر ہندوستانی بن جاتے ہیں۔ ہماری فوجوں کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں اور عام رعایا کو انگریزوں کے ساتھ ملانے کے لئے نئی نئی سازشیں کر رہے ہیں۔"

مرزا صاحب جو دیر سے خیالات میں کھوئے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ یہ باتیں سن کر چونک پڑے اور بولے۔ "مولانا ذرا احتیاط کیجئے۔ دیوار ہم گوش دارد۔ انگریزوں کی حکمت و تدبر سے بعید نہیں کہ صہبائی اور شیفتہ کے لباس میں بھی کوئی انگریز افسر ہم سے ہم کلام ہو۔ اور کل تک ہم اور آپ بغاوت کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیئے جائیں۔"

سب خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر بعد یہ حضرات رخصت ہوئے۔

(منقول از سن ستاون۔ از عشرت رحمانی)

حوالجات

۱۔ داستان غدر از ظہیر دہلوی راقم الدولہ۔ ۲۔ ایضاً۔ ۳۔ غالب کا روزنامچہ
۴۔ مراد گوروں سے ہے جن کی وردی خاکی تھی۔

(سید مصطفیٰ علی بریلوی)

۱۸۵۷ء کے چند گمنام مجاہد

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی میں بے شمار افراد کام آئے۔ صرف دہلی میں ساڑھے ستائیس ہزار افراد پھانسی پاکر شہید ہوئے۔ انگریزوں نے اپنی ملکی مصالح کے تحت اس عظیم جدوجہد میں حصہ لینے والوں کے حالات پر دیدہ ودانستہ پردہ ڈال دیا۔ برصغیر پاک وہند کی آزادی کے بعد قدرتی طور پر، ۱۸۵۷ء کے موضوع پر بہت کام ہوا اور ہو رہا ہے۔ ذیل میں ہم اس قومی المیہ کے چند گمنام کردار پیش کرتے ہیں۔ جن کا حال امداد صابری کی کتاب "تاریخ صحافت اردو"، "۱۸۵۷ء کے مجاہد" از سیدہ انیس فاطمہ "یوپی گورنمنٹ ریکارڈ" بابت جنگ آزادی نیز پنجاب یونیورسٹی ریکارڈ اور دیگر ذرائع سے ماخوذ ہے۔

احمد خان کھرل

احمد خان کھرل سابق ریاست بہاولپور کے پار دریائے راوی کے دوسرے کنارے والا ایک سردار تھا۔ وہ اپنے قبیلے کا سردار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک روحانی پیشوا بھی شمار کیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کی خبریں سن کر انگریزوں نے بطور احتیاط اس جنگلاتی علاقے کے سادہ لوح لیکن پرجوش مسلمان قبائل کے سرداروں کو جیل خانے میں نظربند کر دیا۔ اتفاق سے داروغہ جیل، احمد خان کا ممنونِ احسان تھا کیونکہ اس نے ایک نازک وقت میں اس کی جان بچائی تھی۔ چنانچہ اس نازک موقع پر داروغہ جیل نے شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے قیدیوں پر خصوصی نوازشات کا سلسلہ جاری کر دیا۔ یہ بات جب مسٹر برکلی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کو معلوم ہوئی تو داروغہ بے چارہ کی نوکری ختم ہو گئی۔

اسی دوران میں آگرہ سے مجاہدین کے نمائندہ قبائل بھی پہونچے اور ان میں جہاد کی روح پھونک دی۔ انگریزوں کا اور تو کچھ بس نہ چلا انہوں نے نہتے قیدیوں کا قتلِ عام کر ڈالا۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو احمد خان کھرل نے طبلِ جنگ بجوا دیا اور انگریزی چوکیوں پر حملہ کر کے ان کو تباہ وبرباد کر دیا اور پورے علاقے پر اپنا کنٹرول کر لیا۔ انگریزوں کی خوش قسمتی دیکھئے کہ ان کو کاسہ لیسان ازلی مل گئے چنانچہ کھرل قبیلے کے ایک سردار سرفراز خان کھرل نے اپنے منہ پر سیاہی ملی اور مخبری کے فرائض انجام دیئے۔ میاں محمد شفیع نے اپنی کتاب ۱۸۵۷ء میں لکھا ہے کہ

"اس کھرل رئیس نے انگریزوں پر بری طرح جان چھڑکی۔ پنجاب میں قدم رکھتے ہی ان پر قربان ہو گیا۔ ان خدمات کے صلے میں سے خان بہادری کا خطاب، پانچ سو روپے کا خلعت اور پانچ سو بیگھے زمین کی جاگیر دی گئی۔"

ان غدارانہ کارروائیوں کے باوجود مجاہدین نے خوب خوب حملے کئے۔ انہوں نے جیل خانہ میں سرداروں کا قتل کرنے والے مسٹر برکلی کو جان سے مار کر بھرپور بدلہ لے لیا۔ اس کے علاوہ انگریزی فوج کا ایک سالار میجر ۱۴ گھوڑے سوار اور ۲۶ ملٹری کے سپاہی بھی مارے گئے۔ انگریزی فوجیں پورے علاقے میں مسلسل کئی ماہ دوڑ دھاگ کرتی رہیں لیکن احمد خاں ان کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ کیونکہ اسے علاقے کے عوام و خواص کی حمایت حاصل تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے ریکارڈ کے مطابق ایک فوجی افسر نے بیان کیا کہ ایک دریائی گھاٹ پر متعین چوکیدار سے جب کہا کہ انگریزی فوج کے واسطے کشتیاں بھیجے تو اس نے جواباً کہلا بھیجا کہ

"احمد خان کھرل اس ملک کا بادشاہ ہے۔ اس نے کشتیاں نہ بھیجنے کے واسطے ذاتی طور پر پیغام دیا ہے۔ لہٰذا تعمیل حکم سے معذور ہوں۔"

۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء کو احمد خاں کھرل انگریزی فوج سے دست بدست جنگ کرتے ہوئے شہید ہوا۔ مسٹر الفنسٹن نے مرحوم مجاہد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"بغاوت کا اصل سرغنہ احمد خاں کھرل تھا۔ سابقہ ہنگاموں میں اس کی مسلسل کامیابیاں عام مقبولیت بڑھانے کے واسطے کافی تھیں۔ اس کا اثر راوی کے کنارے آباد قبائل پر بے پناہ تھا۔ اس کی موت کا خاطر خواہ اثر فوری طور پر نہ ہوا کیونکہ قبائلی خوفزدہ ہونے کے بجائے مشتعل ہو گئے تھے۔"

مشہور مصنف غلام رسول مہر نے کھرل کے بارے میں لکھا ہے

"احمد خاں کھرل بڑا بہادر شخص تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ افراتفری پھیل گئی ہے تو میدان عمل میں آ گیا یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ کسی نیم خود مختار یا من چلے سردار کی ویسی ہی حرکت تھی جیسی عام طور پر سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ احمد خاں نے باقاعدہ اعلان کیا تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس سے مقصود شہنشاہ دہلی کی حمایت ہے۔"

سعادت خاں اندوری

سعادت خاں اندوری بڑا محب وطن شخص تھا۔ اردو اخبار بابت ۸، اکتوبر ۱۸۷۴ء میں اس کے بارے میں اس طرح لکھا ہے۔

"سعادت خاں اندور میں ایک سرگروہ باغیوں کا تھا اور یکم جولائی ۱۸۵۷ء کو اس شخص کی ذات سے ریذیڈنسی پر حملہ ہوا تھا۔ چنانچہ فی الحال یہ شخص گرفتار ہوا۔ اس کے مقدمے کی تحقیقات ہوئی۔ ایام غدر میں سعادت خاں بہت آسودہ آدمی تھا اور مہاراجہ ہلکر کے رسالے میں رسالدار تھا۔ اس کا مقدمہ ۱۶ ستمبر ۱۸۷۴ء کو محکمہ ایجنٹ گورنر جنرل سینٹرل انڈیا میں پیش ہوا اور اس پر جرم قائم ہوا کہ اس نے یکم جولائی ۱۸۵۷ء کو چند یورپین صاحبان اور رعایائے سرکار کو قتل کیا اور باغیوں کا سرگروہ رہا۔۔۔۔۔۔ دو گواہوں نے بیان کیا کہ ہم نے سعادت خاں کو یکم جولائی ۱۸۵۷ء

کو دیکھا تھا۔ باغیوں کو غدر کرنے کی ترغیب دیتا تھا اور خود دین کا جھنڈا کھڑا کیا تھا اور جب ریذیڈنسی پر توپیں چلتی تھیں اس وقت سعادت علی خان موجود تھا اور جب کرنل بریور صاحب نے توپوں پر حملہ کیا تو یہ شخص بھی زخمی ہوا تھا۔۔۔۔ مہاراجہ ہلکر کے پاس جا کر عرض کیا کہ دیکھئے انگریزوں سے میں اس قدر زخمیوں کو زخمی ہو گیا۔ ایک صاحب کو میں نے زخمی کیا اور دوسرے صاحب کو قتل کر دیا۔ اس نے پورا میں حکم دیا تھا کہ جیل کا دروازہ کھول دیا جائے۔"

مقدمے کا نتیجہ خدا جانے کیا نکلا۔ اغلب ہے کہ سعادت علی خان اندردی کو پھانسی نصیب ہوئی۔

جنرل نیاز محمد خاں

یہ رام پور کے رہنے والے افغان النسل اور آزمودہ کار فوجی تھے۔ ان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔ البتہ فتح پور چھاؤنی پر نواب خان بہادر خان روہیلہ کی افواج کو ساتھ لے کر حملہ کرنے کے سلسلے میں ان کی خاص شہرت ہوئی۔ اس منصوبے میں ان کو اندرونی غداروں کی وجہ سے ناکامی ہوئی۔ ان کے مقدمے کی حسب ذیل روداد اردو اخبار کے کالموں میں درج تھی۔ جو درج ذیل ہے۔

"اس کا مقدمہ عدالت ہائی کورٹ میں دائر ہے۔ شاہ جہاں پور کی عدالت سیشن سے اس شخص کی نسبت پھانسی کا حکم ہو چکا ہے۔ لیکن دفعہ ۲۸۷ ایکٹ نمبر ۲۵ ۱۸۷۲ء عدالت مذکور نے اس مقدمے کو واسطے تجویز ہائیکورٹ کے بھیج دیا ہے۔ یہاں دارنز صاحب اور کیمپ صاحب سرکار کی طرف سے پیروکار ہیں۔ مدعا علیہ کی جانب سے انگلش صاحب بیرسٹر اور گاسپر صاحب، ولسن صاحب، میر ظہور صاحب اور پنڈت اجودھیا ناتھ جواب دہی کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ بروقت پیشی کے بہت سے انگریز صاحبان کا بطور تماشائیوں کے ہجوم تھا۔ منجملہ عذرات مدعا علیہ کے خلاف ایک عذر یہ تھا کہ اس نے خان بہادر خان بریلی کے نواب کے حکم سے سرکار انگریزی کا مقابلہ کیا تھا اور اس وقت وہ رعیت نواب رام پور تھا۔ وہ ریاست ایک ریاست خود مختار ہے۔ اس واسطے ایکٹ ۱۱ ۱۸۵۷ء کی پہلی دفعہ اس پر عائد نہیں ہوتی۔ دوسرا عذر یہ تھا کہ حسب اشتہارات گورنمنٹ ایسے تمام لوگوں کو وعدہ معافی کا دیا گیا تھا جو ہتھیار رکھ دیں۔ تیسرا عذر یہ تھا کہ مدعا علیہ کو ملکہ معظمہ کے مقابلے میں جنگ کرنے کے الزام کی بابت سرٹیفکیٹ معافی مل چکا ہے اور وہ شامل مسل ہے۔ چوتھا عذر یہ تھا کہ اس پر الزام فلاں فلاں بے جا ہیں اس لئے کہ یہ قانون اس وقت نافذ نہیں تھا۔ پانچواں عذر یہ کہ الزام ناک کان کاٹنے اور لینے مبلغ ۳ ہزار روپے بدایوں کے بنئے سے، گواہی۔۔۔ ثابت ہو چکا ہے مگر وہ اظہار مسل سے نکال ڈالے گئے ہیں۔ چھٹے یہ کہ فلاں شخص کے قتل کے عوض ایک اور شخص مسمی۔۔۔۔۔۔ پھانسی پا چکا ہے۔ ساتواں عذر یہ کہ فلاں شخص کے قتل کے الزام کی نسبت فیصلہ صاحب جج کا خلاف شہادت ہے۔"

(بحوالہ تاریخ صحافت اردو از مولانا امداد صابری)

برطانوی خفیہ ریکارڈ (شائع شدہ یوپی گورنمنٹ جلد اوّل) صفحہ ۲۵۸ پیر علی خان

پیر علی خان

مجدد بہار کے بارے میں تحریر ہے کہ

"بہار کے فسادات کا ہیرو اور ڈاکٹر ریل کو گولی مارنے والا شخص پیر علی خان تھا۔ اس کی سزا کمشنر نے اس امید پر ملتوی کر دی تھی کہ مزید معلومات حاصل ہو جائیں۔ لیکن وہ زندگی کے آخری مرحلے تک عدم تعاون برتتا رہا۔ چونکہ اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس لئے اسے بھی پھانسی چڑھا دیا گیا۔ اپنی عادات و اطوار اور ظاہری شکل و صورت سے جیسا کہ کمشنر نے بیان کیا ہے وہ ایک سفاک لیکن بہادر مذہبی جنونی شخص تھا۔ اس کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کانپور کے نسیم الزماں سے خط و کتابت سقوط اودھ کے وقت سے مسلسل جاری تھی اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ پٹنہ میں کچھ عرصے قبل ایک خفیہ سازش ہوئی تھی جس پر عمل درآمد شمال و مغرب کی ہدایت پر ہونا۔"

حملہ کئے علاقے کے صوبوں میں ۱۸ / جولائی ۱۸۵۷ء کے دوران امن و امان قائم تھا۔ تقریباً ۸۰ یا ۹۰ بلوائی ایک مسلمان کتب فروش کے مکان پر جمع ہوئے جس کا نام پیر علی خان تھا اور پھر یہ مجمع رومن کیتھولک چرچ کی طرف دوڑا چلا گیا۔ مجمع کے ساتھ دو بڑے جھنڈے تھے اور ایک بڑا ڈھول تھا۔ یہ لوگ مسلسل یا علی یا علی کا نعرہ لگا رہے تھے۔ پادری جس کو غالباً یہ مارنا چاہتے تھے بچ گیا۔ جب یہ لوگ مشن کی حدود سے باہر آئے تو مسلسل نعرے لگا کر لوگوں کو ساتھ دینے پر اکسا رہے تھے۔

ایک شخص تو زخمی ہو گیا تھا اس نے حقیقت حال کا انکشاف کیا جس کے نتیجے میں فساد کرنیوالے گرفتار کر لئے گئے۔ اس شخص نے بتایا کہ ایک سازش واقعی پہلے سے موجود تھی۔ متعلقہ لوگوں کو پابندی کے ساتھ پیسہ دیا جاتا تھا کہ لوگوں کے جذبات مذہب اور شاہ دہلی کے واسطے لڑنے کے لئے ابھاریں۔ پیر علی خان کے مکان سے جو خطوط ملے ان سے برطانوی حکومت کا تختہ الٹ کر مسلمانوں کی حاکمیت قائم کرنے کی ایک جامع سازش کا سراغ ملا۔

پیر علی خان کا ایک قول کسی جگہ میرے مطالعے میں آیا ہے کہ مقصد کی خاطر سچ بول کر جان دے دینا بھی بعض اوقات ضروری اور کامیابی کی بنیاد بنتا ہے۔

جنرل محمود خان

جنرل محمود خان مشہور جنگ پانی پت ۱۷۶۱ء کے ہیرو امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کے پرپوتے اور تاریخ کے بدنام ہیرو نواب غلام قادر خان کے حقیقی بھتیجے تھے۔ خاندانی وجاہت کے علاوہ جذبۂ اسلامی اور درد قومی سے سرشار تھے۔ ان کے والد کا نام نواب معین الدین خان عرف بھنبو خان تھا۔ انہوں نے لال قلعے کے حادثۂ فاسدہ اور اپنے خاندان و علاقے کی بربادی کے بعد غوث گڑھ کے علاقے پر قبضہ کر کے ایک عارضی حکومت قائم کر لی تھی۔ انگریزوں نے نواب کو مختلف طریقوں سے علاقے کے بدلے پنشن لے کر بریلی مقیم ہونے پر مجبور کر دیا۔

مولانا محمد علی جوہر کے پردادا علی حسین خان نواب معین الدین خان کی سرکار میں مدار المہام تھے۔ نواب کے

انتقال کے بعد ان کے دونوں صاحبزادوں محمود خاں اور جلال الدین خان کی پنشن بحال نہیں کی گئی۔ اس سلسلے میں طرح طرح سے توہین کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں بھائی اندر ہی اندر انگریزوں کے خلاف ہوتے گئے۔ تاریخ کاملان رام پور از احمد علی خاں شوق رام پوری میں ان واقعات کی تفصیلات موجود ہیں۔ ۱۸۵۷ء کا لاوا ابل پڑا۔ چنانچہ سر سید احمد خاں جو انگریزوں کے ساتھ تھے جنرل محمود خاں کے سخت خلاف ہوگئے اور انہوں نے اپنی کتاب "تاریخ سرکشی بجنور" میں نواب کو "نا محمود خاں" کے نام سے یاد کیا ہے۔ ضلع بجنور میں نواب اور انگریزوں کے خوب مقابلے ہے۔ ہندو چودھریوں اور نواب رام پور کی غداریوں کی وجہ سے نواب کو شکست ہوگئی۔ جلال الدین خاں کو پھانسی دے دی گئی۔ نواب محمود خاں گرفتار ہوئے اور بحالت قید، قید حیات سے نجات پائی۔

…الطاہر فدا حسین فدا

اِستقامت

مشکلیں عزم کے اعجاز سے حل ہوتی ہیں　　کوششیں قلب سے داغ الم دھوتی ہیں
خوش دلی دیکھیں گی وہ آنکھیں جو اب روتی ہیں　　اشک جو دردِ اخوت کے ہیں وہ موتی ہیں

ہمت مرد سے ہر کام سنور جاتا ہے
استقامت ہو تو فرعون بھی خم کھاتا ہے

بڑا اک کام کا انسان اٹھاتے ہیں اگر　　اہلِ دانش ہوں تو انجام پہ رکھتے ہیں نظر
آکے میدان میں وہ کھول نہیں دیتے کمر　　کامیابی کے لئے ہوتے ہیں سب سینہ سپر

پیچھے ہٹتے ہی نہیں مرد جو کہلاتے ہیں
آگے بڑھ بڑھ کے وہ مردانگی دکھلاتے ہیں

عزم و ہمت ہو تو امدادِ خدا ہوتی ہے　　جوشش کردار ہو تو دور بلا ہوتی ہے
یک دلی دردِ جماعت کی دوا ہوتی ہے　　فتح مندی ہے جو آپس میں وفا ہوتی ہے

کرکے جو عہدِ وفا بعد میں پھر جاتے ہیں
وہ فرازِ شرفِ زیست سے گر جاتے ہیں

خام جو ہمت مردانہ میں رہ جاتا ہے　　سامنے مردوں کے نامرد ہی کہلاتا ہے
صنفِ نازک کی طرح رزم سے گھبراتا ہے　　ناوکِ ذلت و رسوائی و غم کھاتا ہے

اہلِ عزت اسے نظروں سے گرا دیتے ہیں
بزمِ توقیر و شرافت سے اٹھا دیتے ہیں

بدگہر ہیں جو زباں دے کے مکر جاتے ہیں　　چھوٹے برتن کی طرح جلد ہی بھر جاتے ہیں
ناخلف بامِ ترقی سے اتر جاتے ہیں　　وہ شریفوں کے لئے زندہ ہی مر جاتے ہیں

اے فدا مرد زباں دے کے بدلتا ہی نہیں
اور بد عہد کہیں گر کے سنبھلتا ہی نہیں

عقیدت بحضور رئیس المجاہد مولانا شاہ احمد اللہ شاہ صاحب مدراسی علیہ الرحمۃ

پیکرِ عشق و محبت نازشِ قوم و وطن
احمد اللہ شاہ فخرِ خاندانِ بوالحسن

لشکرِ احرار کا وہ رہنمائے اوّلیں
آتشِ نمرود جس پر بن گئی رشکِ چمن

خوب دی دادِ شجاعت کارزارِ عشق میں
بارک اللہ اے امیرِ حریت فخرِ وطن

گونجتا تھا اس طرح میدانِ حرب و ضرب میں
قلعہ خیبر میں جیسے نعرۂ خیبر شکن

برقِ وش سیماب طبع، شعلہ جو آرہ نو
خرمنِ افرنگ پر ہر دم رہا جو شعلہ زن

جس نے سب کچھ راہِ آزادی میں قربان کر دیا
وہ علمبردارِ آزادی وہ میرِ انجمن

جس کی تقریروں نے پیدا کر دیا جوشِ جہاد
جس کی بے باکانہ یلغاروں سے جاگ اٹھا وطن

جس نے گوروں کی سیاہی کو نمایاں کر دیا
چیخ اٹھے جس کی ضرب سے تنانِ سیمتن

جس سے باطل کے بہادر سُورما ڈرتے رہے
کانپ کانپ اٹھتے تھے جس سے بندگانِ اہرمن

سیّد قربان و محراب قلندر کے طفیل
جس نے پھونکا صورِ آزادی بآہنگِ علن

جس نے قطروں سے لیا تھا کام موجِ نیل کا
جس نے ذرّوں کو بنا ڈالا فروغِ انجمن

خالد و طارق کا ثانی مظہرِ حیدر تھا وہ
ہند میں رُوحِ جہاد و زہد کا پیکر تھا وہ

انگریزوں کے چند پشتینی وفادار

(اسد نظامی)

تاریخ داں طبقہ حضرات سے ایسے اشخاص کہ جنہوں نے ایسٹ انڈیا کی اماریت کو مستحکم کیا" یہ بات مخفی نہیں کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا عمر بھر شیوۂ زیست یہ رہا کہ تحریک آزادی کے والہ و شیدائی حضرات پر کفر و شرک و بدعات کے فتوے جاری کر کے انگریزوں کی بالواسطہ یا بلا واسطہ چاپلوسی و اعانت کریں اور خود کو انگریزوں کا پشتینی وفادار ثابت کریں ایسے اشخاص کو موجودہ دور کے نام نہاد مورخین امیر المجاہدین امیر الشہداء کے نام سے ملقب کر کے ان کی سیہ کاریوں کو لفاظی جوابات کے ذریعہ موجودہ نسل سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ قوم ان کی بداعمالیوں و سیہ کاریوں کو یکسر فراموش کر کے خوشنما سہرے ناموں سے انہیں یاد کرے۔

مگر ان خود ساختہ لوگوں کے کرداروں سے بخوبی واقف جب تک ایک بھی منصف اہل قلم موجود ہے اسی وقت تک یہ جانبدار مورخ ہرگز ہرگز اپنے ان مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

سر دست انگریزوں کے پشتینی وفاداروں کی برطانوی حکام سے بیگی وفاداری کا تذکرہ خود ان کے قلم سے اعترافات کی صورت میں کیا جاتا ہے۔

"مولوی محمد اسماعیل دہلوی

ابن مولوی عبدالغنی رحیمی خاندان کے مشہور خانوادے سے تعلق رکھتے تھے چونکہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی علیہ الرحمۃ کا شہرۂ آفاق تذکرہ زبان زد خلائق تھا اس لئے انگریزوں نے مشرقی بنگال پر اپنا تسلط جمانے کے بعد اپنی للچائی نظروں سے دہلی کے پایۂ تخت پر حکومت گیری کا نشانہ بنانے کے لئے چند ایک مولویوں کو زر خرید غلام بنا کر مسلمانوں میں تشتت وانتراق پیدا کیا اور صحیح العقیدہ مسلمانوں پر کافر مشرک بدعتی کے الزام لگا کر انگریزوں سے عدم اجتہاد کا فتویٰ دے کر ان کی عیارانہ چالوں کو کامیاب بنانے میں اپنی ہر ممکن کوششیں کیں ان ہی میں مولوی شاہ محمد اسماعیل دہلوی بھی شامل ہیں چنانچہ موصوف کا اعتراف ملاحظہ ہو۔

"کلکتہ میں جب مولانا اسماعیل نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی تو ایک شخص نے دریافت کیا۔ آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے۔ آپ نے جواب دیا ان پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں ہے، ایک تو ان کی رعیت ہیں، دوسرے ہمارے مذہبی ارکان ادا کرنے میں ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔

ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے بلکہ ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔"

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے اس واضح اعتراف کے بعد مولوی صاحب کی انگریز پرستی میں کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

سید احمد تکوی صاحب

اب اسماعیل دہلوی کے مرشد سید احمد صاحب تکوی کی انگریز پرستی ملاحظہ ہو۔

"اس سوانح اور مکتوبات متعلقہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کا سرکار انگریز سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہ تھا وہ اس آزاد عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار انگریزی اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ مدد نہ پہنچتی۔ مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔"

سید احمد صاحب تکوی کا اعتراف انگریز پرستی ایسا بین ثبوت ہے کہ جس سے سوانح احمدی و تاریخ عجیبہ اور دیگر متعدد کتابیں پُر ہیں اور ان کتابوں کا یہ لوگ ہرگز انکار نہیں کر سکتے۔

سید نذیر حسین دہلوی

غیر مقلدین کے مشہور سرخیل مولوی سید نذیر حسین دہلوی کہ جن کا مطمح نظر شروع ہی سے یہی رہا کہ انگریزوں کی جی بھر کر خوشامد

کرو۔ انگریزوں کے مخالفوں پر بھی کھول کر سب و شتم کرو۔ لکھتے ہیں۔

"انگریز گورنمنٹ ہندوستان میں ہم مسلمانوں کے لئے خدا کی رحمت ہے" صاحب الحیات بعد الممات نے سید نذیر حسین کی انگریز پرستی کے متعدد حوالہ جات دیئے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان بھوپالوی

نواب صدیق حسن خان بھوپالوی کی زندگی برطانوی استعمار کی حمایت اور سنی مسلمانوں کو کافر بنانے میں ہی گذری نواب صاحب کی برطانیہ پرستی ملاحظہ ہو۔

"خود را باین سرکار بذمہ منت پری از غربا اسلام برستبہ انداسخ پس بالیقین میتواں گفت کہ امروز در مملکت ہند از کلکتہ تا پشاور و از گجرات، سندتا دکن مثلاً بلکہ در چہار دانگ ایں اقلیم کسی نباشد کہ معتقد جواز جہاد و قتال با دست برٹش خواہد بود زیرا کہ شرط ایں عمل بکسر دریں وقت دریں کشور مفقود است"

گویا کہ نواب صاحب کے نزدیک برطانوی حکومت غربا پرور اور رحمدل تھی اور انگریز کے خلاف جہاد کرنا حرام ہی ٹھہرا۔

نیز نواب صاحب کی دوبارہ برطانیہ پرستی ترجمان وہابیہ، تاج مکلل، تاریخ بلدہ بھوپال تاریخ ستوزح، ابقا المنن، مآثر صدیقی، وغیرہ کو ملاحظہ فرمائیں۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کی برطانیہ پرستی

مرزا غلام احمد قادیانی کے رفیق اول مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی ثم لاہوری نے برطانوی حاشیہ برداری کے نشے میں سرشار ہوکر "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" نامی کتاب لکھی اور لاہور سے برطانوی استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے ایک ماہنامہ رسالہ "اشاعۃ السنۃ" کا اجرا کیا جس میں مجاہدین آزادی پر پھبتیاں چسپاں کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"بعض سرحدی نادان ناواقف از احکام اسلام و قرآن تن تنہا ایک میرا تا چھرا ساتھ باندھ کر غازی یا شہید ہونے کی نیت سے چل پڑتے ہیں اور کسی کیمپ یا چھاؤنی انگریزی میں پہنچ کر کسی افسر یا فوجی ملازم کو مار ڈالتے ہیں پھر اس کی سزا میں پھانسی پاتے ہیں اور یہ بھی فساد و بغاوت اور عناد ہے۔

ایسی صورتوں سے اپنی جان کو ہلاک کرنا حرام موت مرنا ہے اور بہشت کی خوشیوں سے محروم رہنا اور ایسے فسادوں کو جہاد سمجھنا اور اس میں شہادت کی ہوس کرنا سراسر حماقت و جہالت ہے۔" [۵]

کتاب مذکور کے اندر اور بھی متعدد ایسی عبارات موجود ہیں جن سے یہ بات منکشف ہے کہ غیر مقلدین وہابیہ کو انگریزوں نے محض اس لئے خریدا تاکہ ہماری حکومت مستحکم ہو اور مجاہدین آزادی کی کاوشیں بالکل ناکام ہو کر رہ جائیں۔

مولوی رشید احمد گنگوہی کی انگریز پرستی

مولوی رشید احمد گنگوہی کی برطانیہ پرستی کے تذکرے خود ان کے مرید مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے قلم بند کئے ہیں۔ گنگوہی صاحب کی برطانیہ پرستی ملاحظہ ہو۔

"جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انہوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحمدل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا۔"

رشید احمد گنگوہی صاحب کے ان اعتراف فرنگی نوازی کے بعد غلام رسول مہر، محمد میاں دہلوی اور طفیل احمد صاحب منگلوری کی نیا پُر طور پر تاویل اور یاوہ گویاں کوئی وقعت نہیں رکھتیں مگر حیف ہے کہ ان اعترافات کے باوجود بھی موجودہ دور کے بعض مورخین نے گنگوہی صاحب کی برطانیہ پرستی سے صریحاً انکار کیا ہے۔

مولوی خلیل احمد انبیٹھوی

مولوی خلیل احمد انبیٹھوی جنہوں نے براہین قاطعہ لکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بدترین گستاخی کرنے کا ارتکاب کیا ہے نے فرنگی قوم کی حمایت کی ایما پر ستر کتابیں لکھیں۔ انبیٹھوی صاحب کے متعلق عاشق الٰہی میرٹھی کا بیان ملاحظہ ہو۔

"آپ گورنمنٹی آدمی ہیں اور تنخواہ پاتے ہیں۔" انبیٹھوی صاحب کو عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے سرورق پر قدوۃ العلماء تاج المحدثین زبدۃ الفقہاء سراج المناظرین، الامام الہمام جیسے خطابات سے موسوم کیا ہے۔ لیکن برطانیہ نوازی کا اعتراف میرٹھی صاحب کو بھی کرنا پڑا۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی برطانیہ نوازی

کتب کثیرہ کے مصنف نذیر احمد دہلوی نے اپنی تمام عمر برطانیہ کی حاشیہ برداری میں بسر کر دی اور اپنی علمی صلاحیتوں کو اپنی اولوالعزمی پر قربان کر دیا لکھتے ہیں۔

"گورنمنٹ اور رعایا میں جو تعلق ہے وہ ایسا ہے کہ گورنمنٹ پدر مہربان ہے اور رعایا اولاد، گورنمنٹ طبیب ہے رعایا مریض یا گورنمنٹ استاد شفیق ہے اور رعایا شاگرد۔"

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا مطمح نظر انگریز پرستی اور مجاہدین آزادی پر پھبتی کسنے کے سوا کچھ اور نہ تھا

الطاف حسین حالی صاحب کی برطانیہ حاشیہ برداری

سر سید احمد خاں علی گڑھی کے شاگرد لارڈ ویلز ـــــ کے دریوزہ گر تے برطانوی حکام کی تابعداری کرنے میں دو سرے اپنے ہم نواؤں سے ہر ممکن سبقت حاصل کرنے کی جو ہر چند کوشش کی وہ کسی حد تک اپنے مقاصد میں کامیاب رہا ہے

مژدہ ہو اہل مشرق اب دن پھرے ہیں	مغرب سے سوئے مشرق آیا ہے مہر تاباں
گلوں اپنے لینے آیا خبر کہاں سے	ہے ایسے گلہ بان پر گلہ کی جاں قرباں
ہندوستان بھی تجھ سے کچھ آجکل نہیں کم	اے معدنِ بزرگی اے خاک انگلستان
تیرے نصیب کیا پوچھنا ہے لیکن	ہند بھی ان دنوں ہے قسمت پہ اپنی نازاں
مہمان ہے آج اس کا شاہ ولی عہد	روئے زمین کے سلطان جیسے ہوتے ہیں مہماں[۵]

برطانوی دربار کے درباری خوشامدی لوگوں نے، جائز و ناجائز طور پر حالی جیسے طرز اور شاطرین نے ویلز جیسے برطانوی شاہزادے کو "اے معدنِ بزرگی، اے خاک انگلستان" قرار دے کر مسلمانوں کے خلاف معاندانہ سازشوں کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

محمد شبلی ندوی کا برطانوی حکام سے تعلق

محمد شبلی ندوی حضرت علامہ ارشاد حسین صاحب رامپوری علیہ الرحمت کے شاگرد تھے۔ مگر جب ندوی صاحب پر انگریز پرستی کا نشہ سر چڑھ کر بولا تو ندوی صاحب اپنے استاد محترم پر الزام بازی کرنے سے باز نہ رہے۔ چنانچہ لکھ گئے ہیں

"علامہ مرحوم کو بھی فقہ حنفی کی حمایت میں بہت غلو تھا"[۶]

اپنے استاد محترم پر فقہ حنفی کی غلوئیت پرستی کا الزام لگا کر ندوی صاحب نے کوئی دینی خدمات سر انجام نہیں دی بلکہ استاد کو مطعون کر کے انگریزوں کی بارگاہ و زر و دینار میں اپنی جبیں سائی کر کے اپنی نمک حلالی کا ثبوت دیا۔

چنانچہ ندوی صاحب کی انگریز پرستی ملاحظہ ہو۔

"میں مدت العمر کبھی انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں۔ ہم مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہبی فرض ہے"[۷]

گویا کہ شبلی ندوی کے نزدیک انگریز پرستی فرض عین کے برابر تھی کہ جسے نظر انداز کر دینا شرک و کفریات کے برابر تھا۔

مولوی اشرف علی صاحب تھانوی اور انگریز

اشرف علی صاحب تھانوی شاتم رسالت میں اس قدر بدنام ہوتے کہ جس سے ب۔ مقات خود ان کے ہم عقائد بھی متنفر و نالاں ہیں۔

تھانوی صاحب کو بقول صاحب مکالمۃ الصدرین "ہمارے مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کو انگریزوں کی طرف سے چھ سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا ہے"۔ ایک اور حوالہ ملاحظہ فرمایئے

"چنانچہ کسی نے حضرت تھانوی سے استفسار کیا کہ قبائل کے مسلمان انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے بے سروسامانی کی وجہ سے موت کا شکار ہو جاتے ہیں اور بہت بھاری نقصان اٹھاتے ہیں تو اس حالت میں انگریزوں سے لڑنا جائز ہے یا نہیں؟" [۲]

استفتا کے مطابق جواب میں تحریر فرمایا گیا۔

"ایسے حالت میں ان کو انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا جائز نہیں"۔ انگریزی مجدد کے نزدیک تو انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا ناجائز ٹھہرا مگر مسلمانوں کے خلاف سب وشتم کرنا اور اپنا کلمہ لا الہ الا اللہ اشرف علی رسول اللہ، پڑھوانا اور خود کو نبوت کے مقام پر تصور کرنا کس قدر بڑا ضمیر ورگناہ ہے" [۳]

جامعی شرقپوری کی برطانیہ پرستی

شرقپور شریف کے مسٹر حسن علی جامعی نے اپنی کتاب کے اندر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ

"ان سب میں میرے دادا صاحب کو خصوصی شرف حاصل تھا تقریباً ساٹھ سال تک ذیلداری کے عہدہ پر سرفراز رہے" [۴] مسٹر حسن علی جامعی بی اے علمائے اہل سنت کو تو برطانیہ نوازی کے الزام سے نوازتے ہیں مگر آج تک موصوف کسی الزام کا حوالہ نہ دے سکے اور پھر خود اپنے دادا کے متعلق مذکورہ بالا اعتراف ماردں گھٹنا پھوٹے آنکھ" والی بات ہے۔

مولوی محمد اسحاق ...... دہلوی

سید احمد تحریکی و مولوی محمد اسماعیل کے ہم گرد ہمنوا مولوی محمد اسحاق دہلوی نے "اربعین و مائۃ مسائل" لکھ کر عقائد سنیہ کو کفر وشرک کے فتوے لگا کر انگریزوں کا سینہ ٹھنڈا کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ بالکل واضح ہے۔

"مولانا شاہ اسحق صاحب کا واقع ہے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جب گورنمنٹ انگریز کا تسلط ہوا تو شاہ صاحب کا جو وظیفہ مقرر تھا وہ جاری رکھا گیا" [۵]

گویا کہ محمد اسحاق صاحب دہلوی مصنف "اربعین و مائۃ مسائل" برطانوی حکمرانوں کے وظیفہ

خوار تھے اگر موصوف مائۃ واربعین مسائل لکھ کر مسلمانوں پر کفر و شرک کے فتاوے چھاپاں نہ کرتے تو انگریزی امداد یا لکل محال تھی لہٰذا مولانا موصوف نے برطانوی امداد حاصل کرنے کی غرض سے مسلمانوں پر سب و شتم کرنے ہی کو اپنا مطمح نظر بنا لیا۔

محمد الیاس دہلوی

تبلیغی جماعت کے مشہور سرخیل محمد الیاس صاحب دہلوی جو کہ دیوبند کے عقائد و نظریات کے حامل و حامی تھے انہوں نے سادہ لوح مسلمانوں کے اپنے نزع وہابیت میں مبتلا کرنے عقائد سنیہ سے برگشتہ کرنے کی غرض سے تبلیغی بستر بند جماعت کا سہارا لیا اور جہاد کے تصور کو محض محدود جدوجہد قرار دینے کا موہوم عقیدہ اپنایا۔

چنانچہ اسی سلسلے کے پیش نظر مولوی صاحب انگریزوں سے تنخواہ حاصل کرتے رہے۔

"مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ مولانا الیاس صاحب کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداً حکومت (برطانیہ) کی جانب سے بذریعہ حاجی رشید احمد صاحب کچھ روپیہ ملتا تھا۔"[۱۳]

محمد احسن صاحب نانوتوی

محمد احسن نانوتوی اپنے آقاؤں انگریزوں سے پشتینی طور پر وفادار تھے مولانا صاحب کی انگریز پرستی میں کسی قسم کا شک باقی نہیں جیسا کہ مولانا کے معتقدوں نے آپ کی انگریز نوازی کا اعتراف کیا ہے۔

"۲۲ مئی جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اسی میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے"[۱۴]

مولانا صاحب انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کو خلاف قانون اگر قرار نہ دیتے تو حکومت برطانیہ کی طرف سے ہر قسم کی امداد و اعانت کا فراہم ہونا ناممکن ہو جاتا۔

لہٰذا اسی لئے مولانا صاحب نے برطانوی حکام کی نمک حلالی کرتے ہوئے انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کو خلاف قانون قرار دیا۔

شیخ محمد تھانوی کی برطانیہ پرستی

شیخ صاحب نے بھی اپنے ہم مسلک لوگوں کی حمایت کرتے ہوئے برطانیہ حکام کے خلاف جہاد کرنے کے خلاف رائے دی۔

"تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد ضامن، مولانا شیخ محمد تھانوی مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی قاضی عنایت علی وغیرہ نے مجلس مشاورت منعقد کی اسی مجلس میں مولانا محمد احسن بھی شریک ہوئے مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی اور فرمایا۔ ...."[۱۵]

ان مولائوں نے کہ جن میں شیخ محمد تھانوی مولوی رشید احمد گنگوہی مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ ہیں انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں کو خلاف قانون قرار دیکر برطانوی ایسٹ انڈیا کی اساس کو خوب مستحکم تر کرنے کی ہر چند کوششیں کیں تاکہ برطانوی حکام دائمی طور پر برصغیر پاک و ہند پر مسلط ہو کر تحریک آزادی کے علمبرداروں کو شہید کرنے اور ان کی کاوشوں کو ناکام بنا کر فرنگی تسلط برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکیں۔

مدرسہ دیوبند اور انگریز

مدرسہ دیوبند کی اساس رکھنے والے انگریز ہی تو تھے صرف اس لئے کہ اس مدرسہ دیوبند کی اساس رکھی گئی تاکہ سنی مسلمانوں پر کفر و شرک کے فتوے چسپاں کر کے انہیں اپنی جائز تگ و دو میں ناکام بنائیں اور خود ان کا اعتراف دیو بندیوں نے بھی کیا ہے۔

برطانوی حکام کے فوجی لفٹیننٹ نے اپنے خفیہ معتمد مسٹر پامر کو مدرسہ دیوبند کے متعلق خفیہ حالات جمع کرنے اور رپورٹ پیش کرنے کے لئے بھیجا مسٹر پامر کی رپورٹ ملاحظہ فرمایئے۔

"اس مدرسہ نے یوماً فیوماً ترقی کی ۳۱ جنوری ۱۸۷۵ء بروز یکشنبہ لفٹیننٹ کے گورنر کے ایک خفیہ معتمد انگریز مسمی پامر نے اسی مدرسہ کو دیکھا تو اس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے معائنہ کی چند سطور درج ذیل ہیں۔

"جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپیہ کے صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے جو کام پرنسپل ہزاروں روپیہ ماہانہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہانہ لے کر کرتا ہے" ۱۹

پروفیسر محمد ایوب کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی خلجان باقی نہیں رہ جاتا کہ دیوبندی حضرات تحریک آزادی کے روح رواں یا انگریزوں کے دشمن تھے۔

دیوبند کے مدرسین کی برطانیہ نوازی

جمعیت علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ سید محمد میاں دیوبندی دہلوی، دیوبندی مدرسہ کے مدرسین کی برطانیہ پرستی کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے تمام ہندوستان بھر میں ایک عام اسلامی جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلا دے لیکن اس کی تجاویز کے راستہ میں مدرسہ کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سد راہ ہوئے ..." ۲۰

مسٹر عبید اللہ سندھی کی راہ میں برطانیہ کے خلاف مدرسہ دیوبند کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سد

راہ اور مزاحم کیوں نہ ہوتے کیونکہ مدرسہ دیوبند کی تمام تر پشت پناہی تو انگریز کر رہا تھا اگر بالفرض عبیداللہ سندھی اسکیم پر عمل کر لیتے تو برطانوی امداد کا لامتناہی سلسلہ دائمی طور پر منقطع ہونے کا خدشہ لاحق تھا۔

حوالہ جات

۱؎ مولانا محمد اسماعیل صاحب دہلوی، حیات طیبہ ص ۲۹۶ مطبوعہ فاروقی دہلی، مرتبہ مرزا حیرت دہلوی

۲؎ مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری، سوانح احمدی۔

۳؎ سید نذیر حسین دہلوی، الحیات بعد الممات، ص ۱۶۲، مرتبہ فضل حسین بہاری۔ مطبوعہ کراچی

۴؎ نواب صاحب، الراحق الخطیب ص ۱۸۷ مطبوعہ الہ آباد ۱۲۹۸ھ

۵؎ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی ثم لاہوری، الاقتصادی مسائل الجہاد (اول) ص ۷

۶؎ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، تذکرۃ الرشید جلد اول، ص ۴۳

۷؎ خلیل احمد صاحب انبہٹوی، تذکرۃ الخلیل، ص ۲۹۹، مطبوعہ مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ

۸؎ نذیر احمد صاحب دہلوی، انڈین نیشنل کانگریس، ص ۴، مطبوعہ نامی پریس کانپور۔

۹؎ کلیات حالی، ص ۱۱۴ مطبوعہ دہلی شریف

۱۰؎ محمد شبلی ندوی، حیات شبلی، ص ۴۶۳، بروائت محمد سلیمان ندوی، مطبوعہ اعظم گڑھ

۱۱؎ مولانا اشرف علی تھانوی، تجلیات رحمانی ص ۲۲۹، بروائتہ قاری سعید الرحمٰن مطبوعہ راولپنڈی۔

۱۲؎ 〃 ، 〃 ، 〃

۱۳؎ مولوی اشرف علی تھانوی، سیف یمانی، ص ۱۳۶ بروائت مولوی محمد منظور لکھنوی، مطبوعہ کراچی

۱۴؎ مسٹر حسن علی جاسمی، دیباچہ شاہد التوحید ص ۱۱، مطبوعہ المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور

۱۵؎ بروائت مولوی اشرف علی تھانوی۔ الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۶۹۸ مطبوعہ تھانہ بھون

۱۶؎ مرتبہ طاہر القاسمی دیوبندی، مکالمۃ الصدرین ص ۳۸ مطبوعہ لاہور

۱۷؎ از محمد ایوب قادری "مولانا محمد احسن نانوتوی" ص ۵۰، مطبوعہ مکتبہ عثمانیہ کراچی

۱۸؎ 〃 ، 〃 ص ۵۳

۱۹؎ پروفیسر محمد ایوب قادری، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۱۷، مطبوعہ مکتبہ عثمانیہ کراچی

۲۰؎ مولانا سید محمد میاں دہلوی علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ص ۱۶۵، مکتبۃ الجمعیۃ بکڈپو گلی قاسم جان دہلی شریف نمبر ۶

جنگ آزادی پر کتابیں (مرتبہ: محمد صادق قصوری)

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر اس قدر کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ ان کو احاطہ تحریر میں لانے کیلئے ایک دفتر درکار ہے۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ شاید ہی کسی اور تاریخی موضوع پر اتنا مواد مل سکے "ترجمان اہلسنت" کے اس خاص نمبر کیلئے میں نے بڑی مقدور بھر محنت اور جستجو کے بعد یہ فہرست مرتب کی ہے۔ اس سلسلہ میں جو گوناگوں مشکلات پیش ہوئیں اور جن پریشانیوں سے نبرد آزما ہونا پڑا وہ اس دشت کے صحرا نوردوں سے مخفی نہیں ہے۔ اگر محترم دوست محمد اسد صاحب اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا) میری دستگیری نہ فرماتے تو یہ کام شاید پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکتا ان کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اگرچہ میں نے اس فہرست کو زیادہ سے زیادہ جامع بنانے کی سعی بلیغ کی ہے مگر پھر بھی مجھے اپنی بے مائیگی اور کوتاہی کا اعتراف ہے۔ قارئین کرام سے استدعا ہے کہ وہ اس فہرست میں درج ہونے سے رہ جانے والی کتابوں کے کوائف سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ پھر کبھی یہ کام احسن طور پر کیا جاسکے۔ آمین۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	ناشر	سن طباعت	صفحات	کیفیت
۱	مشاہیر جنگ آزادی	مفتی انتظام اللہ شہابی	محمد سعید اینڈ سنز قرآن محل کراچی	۱۹۵۷ء	۲۰۰	
۲	ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء	"	دینی بکڈپو اردو بازار دہلی	۱۹۲۸ء	۱۲۸	
۳	غدر کے چند علماء	"	"	—	۱۲۸	
۴	بہادر شاہ ظفر	"	سلطان حسین اینڈ سنز بندر روڈ کراچی	—	۱۳۰	
۵	علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں	"		۱۹۴۵ء	—	
۶	۱۸۵۷ء	محمد شفیع	مکتبہ جدید، انارکلی، لاہور	۱۹۵۷ء	۳۲۰	
۷	۱۸۵۷ء	غلام رسول مہر	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	۱۹۷۱ء بار دوم	۳۰۴	
۸	۱۸۵۷ء کے مجاہد	"	"	۱۹۷۱ بار سوم	۳۳۶	
۹	۱۸۵۷ء کے ہیرو	سیدہ رئیس فاطمہ بیلوی	اقبال بکڈپو صدر کراچی نمبر ۳	۱۹۵۹ء بار دوم	۱۳۶	
۱۰	سن ستاون	عشرت رحمانی	گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور	۱۹۵۷ء	۳۰۳	
۱۱	لال قلعہ کی شام (ڈرامہ)	"	"	۱۹۵۷ء		
۱۲	غدر	رئیس احمد جعفری	قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور	۱۹۵۶ء	۲۷۴	
۱۳	انقلاب ۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ	شیخ حسام الدین (ترجمہ)	اردو اکیڈمی لاہور	۱۹۴۷ء بار سوم	۲۰۰	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	ناشر	سن طباعت	صفحات	کیفیت
۱۴	باغی ہندوستان	مولانا فضل حق خیرآبادی	مکتبہ قادریہ جامعہ نظامیہ رضویہ لوہاری گیٹ لاہور	۱۹۷۴ء	۳۶۰	
۱۵	نواب خان بہادر شہید	سید مصطفےٰ علی بریلوی	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی	۱۹۶۶ء بار دوم	۲۲۴	
۱۶	بدایوں ۱۸۵۷ء میں	محمد سلیمان بدایونی	نفیس اکیڈمی بلاسس سٹریٹ کراچی	۱۹۶۰ء	۱۱۲	
۱۷	مولانا فیض احمد بدایونی	پروفیسر محمد ایوب قادری	پاک اکیڈمی وحید آباد کراچی	۱۹۵۷ء	۴۰	
۱۸	غالب اور سن ستاون	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	سنگ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار لاہور	۱۹۷۴ء	۲۱۶	
۱۹	عظیم اللہ خان انگریزی	سید لطف اللہ ایم اے	محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی کراچی ۵	۱۹۷۰ء بار دوم	۱۹۸	
۲۰	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء	خورشید مصطفےٰ رضوی	مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی	۱۹۵۸ء	۵۷۴	
۲۱	سن ستاون	پنڈت سندر لال	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	۱۹۵۷ء	۲۵۶	
۲۲	۱۸۵۷ء کا ایک نادر روزنامچہ	خلیق احمد نظامی	ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی	۱۹۵۸ء	۲۱۲	
۲۳	غدر کے مجاہد شعراء	مولانا امداد صابری	مکتبہ شاہراہ " "	۱۹۵۹ء	۴۰۸	
۲۴	غدر کے غدار شعراء	"	"	۱۹۶۰ء	۱۷۴	
۲۵	سرگزشت غدر	ظہیر دہلوی	اکاڈمی پنجاب لاہور	۱۹۵۵ء	۲۵۶	
۲۶	اسباب بغاوت ہند	سر سید احمد خان	آئینۂ ادب چوک مینار انارکلی لاہور	۱۹۶۹ء	۱۱۲	
۲۷	غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	سنگ میل پبلیکیشنز چوک اردو بازار لاہور	۱۹۶۷ء	۳۷۶	
۲۸	تاریخی شہ پارے	مرزا علی اظہر برلاس	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی	۱۹۷۱ء	۳۵۲	
۲۹	لکھنؤ اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء	ڈاکٹر نور الحسن	ادبی اکیڈمی لکھنؤ	۱۹۵۷ء	-	
۳۰	مجاہدین حریت ۱۸۵۷ء	مولانا محمد میاں		۱۹۶۰ء	-	
۳۱	نوائے آزادی	عبدالرزاق قریشی	ادبی پبلشرز بمبئی	۱۹۵۷ء	-	
۳۲	آزادی کی ان کہی کہانی	گل محمد نیفی بی۔اے	مکتبہ الکرم ڈھل شریف سرگودھا	۱۹۷۳ء	۲۵۶	
۳۳	بہادر شاہ کا روزنامچہ	خواجہ حسن نظامی	دفتر چمن اردو دہلی	۱۹۲۵ء بار پنجم	۱۹۲	
۳۴	غدر کی صبح و شام	"	کارکن حلقہ مشائخ بکڈپو دہلی	۱۹۲۲ء	۲۷۳	
۳۵	بیچارے انگریزی بیتا	"	"	۱۹۲۷	۶۴	
۳۶	محاصرہ دہلی کے خطوط	"	"	۱۹۲۵	۳۲	
۳۷	بہادر شاہ کا مقدمہ	"	"	۱۹۲۳	۲۸۰	
۳۸	دلی کی جانکنی	"	"	۱۹۲۵	-	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام ناشر	سن طباعت	صفحات
۳۹	غدر دہلی کے اخبار	خواجہ حسن نظامی	کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی	۱۹۴۰ء	۲۴
۴۰	گرفتار شدہ خطوط	"	"	۱۹۲۲ء	۲۴
۴۱	بیگمات کے آنسو	"	"	۱۹۲۵ء	
۴۲	غدر کا نتیجہ	ترجمہ "	"	۱۹۳۰ء	
۴۳	مولانا فضل حق و عبدالحق خیرآبادی	مفتی انتظام اللہ شہابی	مجلس مصنفین علی گڑھ		
۴۴	فرنگیوں کا جال	امداد صابری	دہلی	۱۹۴۹ء	
۴۵	تاریخ عروج عہد انگلشیہ	مولوی ذکاء اللہ خاں	شمس المطابع دہلی	۱۹۰۴ء	
۴۶	دستنبو (فارسی)	مرزا غالب	مطبع مفید خلائق آگرہ	۱۸۵۸ء	۸۰
۴۷	بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد	رئیس احمد جعفری	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور		
۴۸	۱۸۵۷ء اخبار اور دستاویزیں	محمد عتیق صدیقی	مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی	۱۹۶۶ء?	۴۷۷
۴۹	۱۸۵۷ء کے کوائف و صحائف	—	ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی	۱۹۵۰ء?	۸۴
۵۰	غدر کی صبح و شام	مترجم ضیاء الدین احمد برنی	ہمدرد پریس دہلی	۱۹۲۰ء	
۵۱	کمپنی کی حکومت	باری علیگ	مکتبہ اردو لاہور	۱۹۴۴ء	۴۰۹
۵۲	مشہور تاریخی واقعات	سید نصیر احمد جامعی	بیگم ہمایوں ٹرسٹ لاہور	[illegible]ء بار دوم	۲۵۶
۵۳	۱۸۵۷ء	راہی معصوم رضا	اسرار کریمی پریس الہ آباد	۱۹۶۰ء	۲۹۲
۵۴	مصائب غدر	ولیم اینڈ ورڈس، مترجم مولوی نذیر احمد	مطبع نول کشور لکھنؤ	۱۸۸۶ء بار دوم?	۱۵۸
۵۵	انقلاب	پی سی جوشی	ترقی اردو بورڈ مرکزی وزارت تعلیم حکومت ہند	۱۹۷۰ء?	۳۵۹
۵۶	محاربہ عظیم	پنڈت کنہیا لال	مطبع منشی نول کشور لکھنؤ	۱۸۸۶ء?	۳۹۰
۵۷	تاریخ ہند برطانیہ	جے سی مارشمین، مترجم حکیم سید عبدالسلام	دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن	۱۹۳۳ء?	۶۶۸
۵۸	مسلمانان ہند کی				

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام ناشر	سن طباعت	صفحات
	سیاستِ وطنی	محمد امین زبیری مارہروی	عبدالرؤف خاں پبلشر عزیزی پریس آگرہ	۱۹۳۸ء	۲۱۹
۵۹	انقلاب ۱۸۵۷ء مکمل تاریخ آزاد ہند تحریک	امیر احمد آزاد	نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی	-	۵۵۸
۶۰	سیاسیاتِ ہند	ڈاکٹر قتانی مترجم سید افضل حسین ایڈوکیٹ	مطبع نول کشور لکھنؤ		۲۱۵
۶۱	تاریخ مگدھ	مولوی فصیح الدین بلخی	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	۱۹۳۳ء	۴۵۹
۶۲	تلاش ہند	جواہر لال نہرو	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۴۶ء	۵۷۸
۶۳	واقعات دارالحکومت دہلی	بشیر الدین	—	—	—
۶۴	مسلم دیش بھگت	مسز رتن لال	—	۱۹۳۹ء	—
۶۵	علماء حق اور ان کا مجاہدانہ کارنامہ	مولانا سید محمد میاں		۱۹۴۷ء	—
۶۶	بھارت میں انگریزی راج (ہندی)	پنڈت سندر لال	—	۱۹۲۸ء	—
۶۷	تاریخ جنوبی ہند	محمود بنگلوری	—	۱۹۳۹ء	
۶۸	ہمارے ہندوستانی مسلمان	ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر مترجم ڈاکٹر صادق حسین	لاہور	۱۹۴۴ء	—
۶۹	تاریخ ہند	ہاشمی فرید آبادی			
۷۰	لال قلعہ کی ایک جھلک	ناصر نذیر فراق	دہلی	طبع چہارم	
۷۰	جاسوسوں کے خطوط	—	روٹوگراف لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ		
۷۱	اخبار الصنادید	مولوی نجم الغنی رامپوری		۱۹۱۸ء	
۷۲	قیصر التواریخ جلد دوم	سید کمال الدین حیدر		۱۸۵۶ء	
۷۳	۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء (اسیر)	امداد صابری			
۷۴	۱۸۵۷ء کی بہادر عورتیں	"			
۷۵	سرکشی بجنور	سرسید		۱۸۶۰ء	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام ناشر	سن طباعت	صفحات
۷۴	۱۸۵۷ء کی بہادر عورتیں	امداد صابری	—		
۷۵	سرکشی بجنور	سرسید	—	۱۸۶۰ء	
۷۶	ظفر الظفر بنام فتح نامہ انگریزی قلمی	کپتان الیگزینڈر ہیلی	—	—	—
۷۷	رسالہ لبغاوت ہند آگرہ	مکند لال اسسٹنٹ سرشتہ	—	فروری ۱۸۶۲ء	
۷۸	ماہ نامہ لبغاوت ہند آگرہ		—		
۷۹	دی انڈین وار آف انڈی پنڈنس	وی ڈی ساورکر	لندن	۱۹۰۹ء	
۸۰		ڈاکٹر سریندر ناتھ			
۸۱	محمد علی عرف چھجی گرین	محمد شفیع مرادآبادی	مرادآباد	۱۸۹۶ء	
۸۲		شیخ امیر احمد کاکوروی			
۸۳		سید طفیل احمد منگلوری			
۸۴		شیخ چند نسیم	—		
۸۵	مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ	عبدالوحید خاں ٹونکی			
۸۶	غدر کا عظیم تذکرہ	ولیم فورس	—		
۸۷	ہندوستان کے غدر کی تاریخ	چارلس بال	—		
۸۸	فرنگی تسلط کے خلاف علمائے اہل سنت کی جدوجہد	حکیم الدین انصاری / اسد نظامی	— غیر مطبوعہ		۲۵۰
۸۹	جنگ آزادی کے سنی شعرا	″	″		

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام ناشر	سن طباعت	صفحات
۹۰	جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء	پروفیسر محمد ایوب قادری	زیرِ طبع		
۹۱	۱۸۵۷ء کے نام ور	محمد صادق قصوری	زیرِ تالیف		
۹۲	۱۸۵۷ء نمبر	—	ماہ نامہ "آج کل" دہلی	۱۹۵۷ء	
۹۳	۱۸۵۷ء نمبر	ایڈیٹر ناصر کاظمی انتظار حسین	ماہ نامہ "خیال" لاہور	مئی جون ۱۹۵۷ء	۳۴۴
۹۴	۱۸۵۷ء نمبر	ایڈیٹر عبدالرؤف پیام شاہجہانپوری	ماہ نامہ "گل خنداں" لاہور	جولائی ۱۹۶۲ء	۲۵۶
۹۵	جنگِ آزادی نمبر	ایڈیٹر سید الطاف بریلوی	سہ ماہی "العلم" کراچی	اپریل جون ۱۹۵۷ء	۱۹۲
۹۶	"	بی ایم غیاث الدین	ماہنامہ "الشجاع" کراچی	مئی ۱۹۵۷ء	۱۳۶
۹۷	"		ماہ نامہ "ماہ نو" کراچی	مئی ۱۹۵۷ء	
۹۸	"		ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور	" "	
۹۹	تحریکِ آزادی نمبر	ایڈیٹر سید مسعود حسن شہاب دہلوی	سہ ماہی "الزبیر" بھاولپور	اپریل ۱۹۷۰ء	۶۶۸
۱۰۰	آزادی نمبر	محمد حنیف رامے	ہفت روزہ "نصرت" لاہور	۱۹۵۹ء	
۱۰۱	مولانا فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون	حکیم محمود احمد برکاتی	مطبوعہ کراچی	۱۹۷۵ء	۱۲۸
۱۰۲	مولانا فضل حق خیرآبادی اور ان کے علوم	"	(زیر قلم)		
۱۰۳	تبرکات فضل حق خیرآبادی	"	"		

جماعت اہلِ سنت پاکستان رجسٹرڈ

- تبلیغ اسلام اور اُمت مسلمہ میں اتحاد پیدا کرنا۔
- سوشلزم و کیمونزم کے خلاف منظم تحریک چلانا۔
- دینی کتب و رسائل شائع کرنا۔
- مذہبی علوم کی اشاعت کے لئے مدارسِ دینی قائم کرنا۔
- مساجد کی تنظیم کر کے ائمہ کا انتظام کرنا۔
- غیر اسلامی رسوم کے خاتمہ کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا۔
- ایسی لائبریریوں کا انتظام کرنا جن میں علماءِ اہلِ سنت کی بہترین کتابیں موجود ہوں۔
- اہلِ سنت کے مدارس، کتابوں اور رسائل سے عوام کو متعارف کرانا۔
- خدمتِ دین اور عقائدِ اہلِ سنت کی تشہیر کیلئے ہر مفید اقدام کرنا۔

کتابہ : یوسف عزیز